فہرست

عمل صالح

اعمال صالحہ کی قسمیں::

عبادات

صرف ایک خدا کی عبادت::

خارجی رسوم کا وجود نہیں::

درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں::

خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں::

مکان کی قید نہیں::

انسانی قربانی کی ممانعت::

حیوانی قربانی میں اصلاح::

مشرکانہ قربانیوں کی ممانعت::

تجرد، ترک لذائذ، ریاضات اور تکالیف شاقہ عبادت نہیں::

عزلت نشینی اور قطع علائق عبادت نہیں::

اسلام میں عبادت کا مفہوم::

نماز

اقیموا الصلوہت

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم::

اسلام میں نماز کا مرتبہ::

نماز کی حقیقت::

نماز کی روحانی غرض و غایت::

نماز کیلئے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت::

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

ذکر و دعا و تسبیح کے دو طریقے::

نماز متحدہ طریق عبادت کا نام ہے::

نماز میں نظام وحدت کا اصول::

نماز میں جسمانی حرکات::

ارکان نماز::

ان ارکان کی ترتیب::

قیام::

رکوع::

سجدہ::

نماز تمام جسمانی احکام عبادت کا مجموعہ ہے::

نماز کی دعا::

الضالین (فاتحہ :۱)

اس دعائے محمدیؐ کا موازنہ دوسرے انبیاء کی منصوص دعاؤں سے::

حضرت موسیٰؑ کی نماز کی دعا::

زبور میں حضرت داؤد کی نماز کی دعا::

داؤد کی نماز

انجیل میں نماز کی دعا::

نماز کیلئے تعین اوقات کی ضرورت::

نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں::

نماز کیلئے مناسب فطری اوقات::

اسلامی اوقات نماز میں ایک نکتہ::

اسلام میں طریق و اوقات نماز::

نمازوں کی پابندی ونگرانی::

نماز کے اوقات مقرر ہیں::

وہ اوقات کیا ہیں؟::

اوقات کی تکمیل

نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل::

ایک نکتہ

جمع بین الصلوٰتین::

اوقات پنجگانہ اور آیت اسراء::

دلوک کی تحقیق::

اوقات نماز کا ایک اور راز::

اوقات پنجگانہ کی ایک اور آیت::

ایک اور طریقہ ثبوت::

نماز پنجگانہ احادیث وسنت میں::

تہجد اب نفل ہوگئی لیکن کیوں؟::

قبلہ::

رکعتوں کی تعداد::

نماز کے آداب باطنی::

نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فائدے::

۴۔پابندی وقت::

۵۔صبح خیزی::

۶۔خدا کا خوف::

۷۔ہشیاری::

۸۔مسلمان کا امتیازی نشان::

۱۱۔الفت ومحبت::

۱۱۔غمخواری::

۱۳۔اجتماعیت::

۱۴۔کاموں میں تنوع::

۱۵۔تربیت::

۱۶۔نظم جماعت::

۱۷۔مساوات::

۱۸۔اطاعت::

۱۹۔معیار فضیلت::

۲۰۔روزانہ کی مجلس عمومی::

عرب کی روحانی کایا پلٹ::

زکوٰۃ

واتو االزکوہت

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم::

زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں::

اسلام کی اس راہ میں تکمیل::

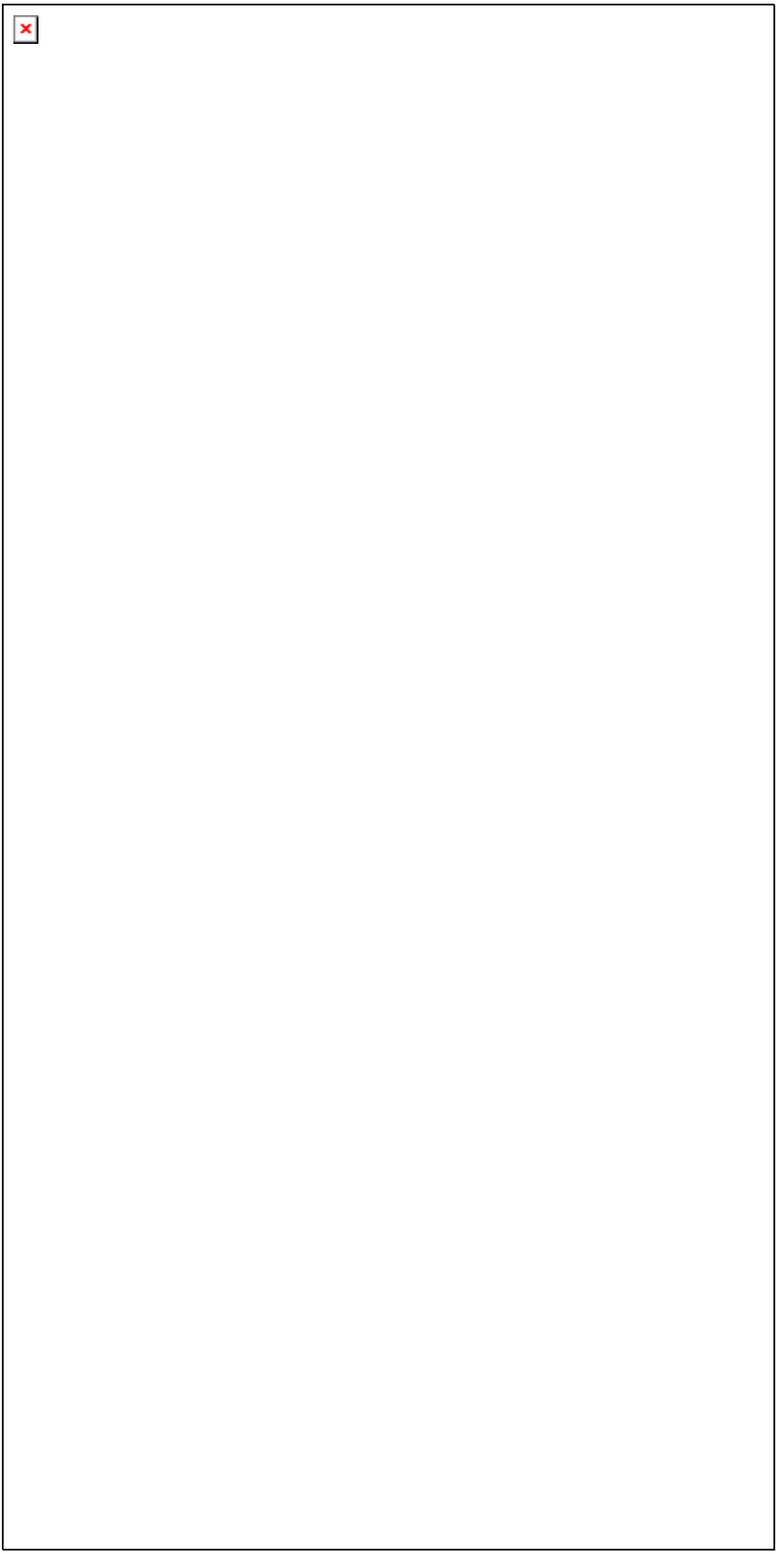
اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت::

زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل::

زکوٰۃ کی مدت کی تعیین::

زکوٰۃ کی مقدار::

جانوروں پر زکوٰۃ::



عمل صالح

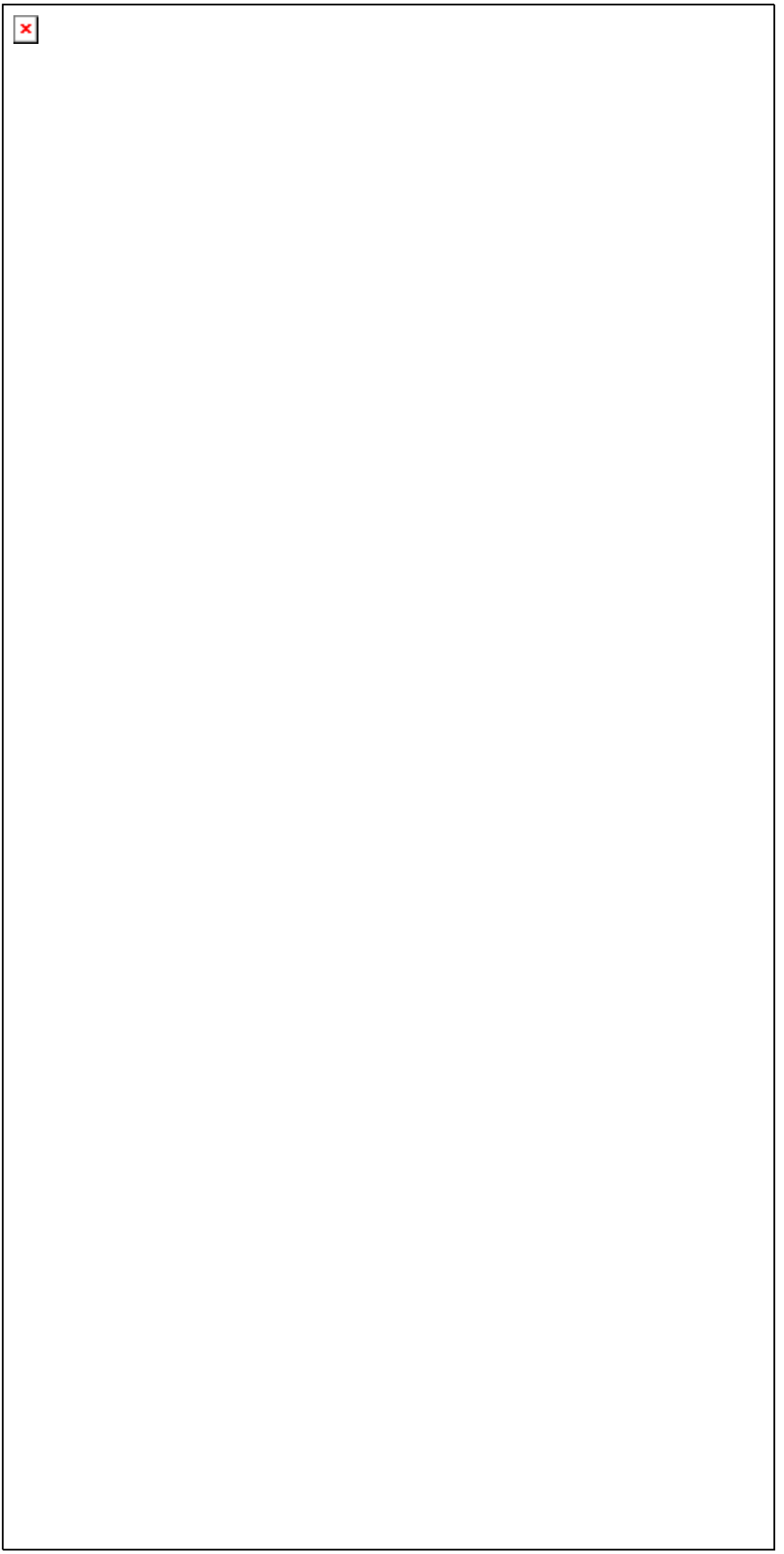
الذین امنو و عملو الصلحت

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم کو لے کر آئے اس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات دو چیزوں پر موقوف ہے ایک ایمان اور دوسری عمل صالح' کتاب سیرت النبی ﷺ کی گزشتہ چوتھی جلد ایمان کی شرح وتوضیح میں تھی' اب یہ پیش نظر حصہ عمل صالح کی تشریح و بیان میں ہے' ایمان بنیادی اصولوں پر یقین کامل رکھنے کا نام ہے اور عمل صالح اصولوں کے مطابق عمل کا' کسی بات کا تنہا علم و یقین کامیابی کے لیئے کافی نہیں جب تک اس علم و یقین کے مطابق عمل نہ ہو۔

اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو انہی دو چیزوں یعنی ایمان و عمل صالح پر مبنی قرار دیا ہے' لیکن افسوس ہے کہ عوام میں ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے وہ عمل صالح کو نہیں۔ حالاں کہ یہ دونوں لازم وملزوم کی حیثیت سے عملاً یکساں اہمیت رکھتے ہیں' فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بنیاد ہے اور عمل صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون' جس طرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی' اسی طرح وہ بنیاد یا ستون کے بغیر بھی کھڑی نہیں ہوسکتی۔

ان دونوں کی بہترین مثال اقلیدس کے اصول اور اشکال کی ہے۔ ایمان کی حیثیت اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کی ہے' جن کو صحیح مانے بغیر اقلیدس کی شکلوں کا اصول محال ہے لیکن اگر صرف اصول موضوعہ اور اصول معتارفہ کو تسلیم کرلیا جائے اور ان کے مطابق شکلوں کا عمل نہ کیا جائے تو فن تعمیر و ہندسہ اور مساحت و پیائش میں اقلیدس کا فن ایک ذرہ کار آمد نہیں ہوسکتا اور نہ اس سے انسان کو وہ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں جو اس فن سے اصل مقصود ہیں۔

عوام کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیئے ضرورت ہے کہ اس بارہ میں قرآن پاک کی تعلیم کو تفصیلاً پیش کیا جائے۔ قرآن پاک نے انسان کی فلاح و کامیابی کے



اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کیئے وہی جنت والے ہیں۔

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے، جو شخص جنت کی یہ قیمت ادا کرے گا وہ اس کی ملکیت ہے، فرمایا:

ان الذین امنو والذین ھادو وا الصابئون النصری من امن با اللہ و الیوم الاخر و عمل صالحا فلا خوف علیہم و لا ھم یحزنون۔ (مائدہ : ۱)

بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صابئین اور نصاریٰ، جو کوئی اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے، نہ تو ان پر ڈر ہے اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ فلاح و نجات کا حصول کسی نسل یا قومیت پر موقوف نہیں اور نہ کسی مذہب و ملت کی طرف رسمی نسبت پر ہے بلکہ حکام الٰہی پر یقین لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے۔ عدم ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی اور ایمان اور نیکوکاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری، اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے، جس میں نہ کبھی بال برابر فرق ہوا اور نہ ہوگا۔ چناں چہ ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا:

قال اما من ظلم فسوف نعذبہ ثم یرد الی ربہ فیعذ بہ عذابا نکرا و اما من امن و عمل صالحا فلہ جزاء الحسنی (کہف : ۱۱)

اس نے کہا جو کوئی گناہ کا کام کرے گا تو ہم اس کو (دنیا میں) سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کے پاس لوٹ کر جائے گا تو اس کو بری طرح سزا دے گا اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کیئے تو اس کے لیئے بھلائی کا بدلہ ہے۔

فمن یعمل من الصلحت وھو مومن فلا کفران لسعیہ وانا لہ کاتبون (انبیا:۷)

تو جوکوئی نیک عمل کرے اور مومن بھی ہوتو اس کی کوشش اکارت نہ ہوگی اور ہم اس کے (نیک عمل کو) لکھتے جاتے ہیں۔

فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوہت و اتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیا الا من تاب و امن و عمل صالحا فاولیک یدخلون الجنہت ولا ظلمون شیئا (مریم: ۴)

تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو برباد کیا اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کی تو وہ گمراہی سے ملیں گے لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیئے تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کا ذرا سا حق بھی مارا نہ جائے گا۔

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت کا استحقاق دراصل انہی کو ہے جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہیں اور جو عمل سے محروم ہیں، وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہیں، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے۔

والذین امنو و عملو الصلحت فی روضت الجنت لھم مایشاء ون عند ربھم ذلک ھوا الفضل الکبیر ذلک الذی یبشر اللہ عبادہ الذین امنوا و عملو الصلحت (شوری:۳)

اور جو ایمان لائے اور نیک کام کیئے وہ جنت کے باغوں میں ہوں گے' ان کیلئے انکے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں' یہی بڑی مہربانی ہے یہی وہ ہے جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے' جو ایمان لائے اور نیک عمل کیئے۔

دوسری جگہ فرمایا:

ان الذین امنو و عملوا الصلحت کانت لھم جنت الفردوس نزلا (کہف: ۱۲)

بیشک جو ایمان لایا اور نیک عمل کیئے ان کی مہمانی کے لیئے باغ فردوس ہیں۔

پھر آگے چل کر فرمایا:

فمن کان یرجو القاء ربہ فلیعمل عملا صالحا و لا یشرک بعبادہت ربہ احدا (کہف: ۱۲)

تو جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو تو چاہیئے کہ وہ نیک عمل کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے۔

ایمان کے ہوتے عمل سے محرومی تو محض فرض ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عمل کی کمی ہے اسی کے بقدر ایمان میں بھی کمزوری ہے۔ کسی چیز پر پورا پورا یقین آ جانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اس میں اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے لیکن نادان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہیں جانتا۔ وہ بار بار اس میں ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو جاتا ہے' اس لیئے عمل کا قصور ہمارے یقین کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان یا تنہا عمل کو نہیں بلکہ ہر جگہ دونوں کو ملا کر نجات کا ذریعہ بتایا

ہے۔

فالذین امنوا و عملوا الصلحت فی جنت النعیم

(حج:۷)

جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیئے۔

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم وملزوم ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے اور تجارت اور فوز و فلاح کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ میں پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے جن مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت و سلطنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی وہی ہیں جن میں ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو۔

وعد اللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصلحت

لیستخلفنھم فی الارض (نور:۷)

تم میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیئے خدا نے وعدہ کیا

کہ ان کو زمین کا مالک بنائے گا۔

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی انہی سے تھا۔

وعد اللہ الذین امنو و عملو الصلحت منھم

مغفرہت و اجرا عظیما (بقر:۱۳)

اللہ نے ان سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیئے، بخشائش

اور بڑی روزی کا وعدہ کیا۔

بعض آیتوں میں ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی اور عمل صالح کی جگہ احسان یعنی نکوکاری کو جگہ دی گئی ہے مثلاً ایک آیت میں یہود و نصاریٰ کے اس دعویٰ کی تردید میں کہ بہشت میں صرف وہی جائیں گے فرمایا:

بلی من اسلم وجھہ للہ وھو محسن فلہ اجرہ عندہ

ربہ ولا خوف علیھم ولا یحزنون (بقرہ:۱۳)

کیوں نہیں جس نے اپنے آپ کو اللہ کے تابع کیا اور وہ نیکوکار ہے تو اس کی مزدوری اس کے پروردگار کے پاس ہے' نہ ڈر ہے ان کو اور نہ غم۔

ان تمام آیتوں سے اصول ثابت ہوتا ہے کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح پر ہے اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے جس سے اسلام سے پیشتر مذاہب میں افراط اور تفریط نمایاں تھی۔ عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط (۱)۔ میں ہے صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے اور بودھ دھرم میں صرف نیکوکاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے اور کہیں صرف گیان اور ودھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے پیغام نے انسان کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) دونوں اعمال کو ملا کر قرار دیا ہے یعنی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہے' اس کو ایمان کہتے ہیں' پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو' یہ عمل صالح ہے اور ہر قسم کی کامیابیوں کا مدار انہیں دو باتوں پر ہے' کوئی مریض صرف کسی اصول طبی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پا سکتا' جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے اسی طرح صرف اصول ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کیلئے کافی نہیں جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے۔

قد افلح المومنون الذین ھم فی صلوتھم خشعون والذین ھم عن اللغو معرضون۔ والذین ھم للذکوبت فاعلون و الذین ھم لفروجھیم حفظون والذین لا منتھم و عھد ھم راعون و الذین ھم علی صلوتھم یحافظون اولیك ھم الوارثون۔

(مومنون: ۱)

وہ ایمان والے مراد کو پہنچے جو نماز میں عاجزی کرتے ہیں' جو نکمی باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے' جو زکوۃ دیتے ہیں' جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں' جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں۔ یہی بہشت کے وارث ہیں۔

(۱)۔ رومیوں کے نام ۳' ٤

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہماری مادی علل و اسباب کے تابع فرمایا ہے' یہاں کی کامیابی اور فوز و فلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے' صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے ہماری بھوک دفع نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیئے ہم کو جدوجہد کر کے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چبا کر اپنے پیٹ میں نگلنا پڑے گا۔ اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں' ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہیں سکتے جب تک اس یقین کے ساتھ اپنی ٹانگوں کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دیں۔ یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لیئے بیکار ہے البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولوں کو صرف صحیح باور کرتا ہے وہ اس سے بہر حال بہتر ہے جو ان کو سرے سے نہیں مانتا کیونکہ اول الذکر کے کبھی نہ کبھی راہ راست پر آ جانے اور نیک عمل بجا لانے کی امید ہو سکتی ہے اور دوسرے کے لیئے تو اول پہلی ہی منزل باقی ہے اس لیئے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا زیادہ مستحق قرار پائے کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا۔

اعمال صالحہ کی قسمیں::

''عمل صالح'' کا مفہوم بہت وسیع ہے' اس کے اندر انسانی اعمال خیر کے تمام جزئیات داخل ہیں' تاہم ان کی جلی تقسیمات حسب ذیل ہیں۔ عبادات' اخلاق' معاملات۔

اسلام میں لفظ عبادت کو بڑی وسعت حاصل ہے۔ اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو۔ اس لیئے اخلاق و معاملات بھی اگر اس خوش نیتی کے ساتھ کیئے جائیں تو وہ عبادات میں داخل ہیں مگر فقہاء نے اصطلاحًا یہ تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیئے ہیں' جن کی تفصیل یوں کی جاسکتی ہے کہ اولًا اعمال صالحہ کی دو قسمیں ہیں' ایک وہ جس کا تعلق خاص خدا سے ہے اس کو عبادت کہتے ہیں' دوسری وہ جس کا تعلق بندوں سے ہے اس کی بھی دو قسمیں' ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے' پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے۔

اعمال صالحہ کی انہیں تینوں قسموں کی تفصیل و تشریح سیرت النبی ﷺ کی موجودہ اور آئندہ' جلدوں کا موضوع ہے۔

عبادات

یا یھا الناس اعبدوا ربکم (بقرہ:۳)

عبادت کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہیں جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ میں بجالاتا ہے لیکن یہ عبادت کا نہایت تنگ مفہوم ہے اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی اس کا اصل جوہر یہ نہیں ہے کہ گزشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقوں کے بجائے اسلام میں عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے بلکہ یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے' ساتھ ہی عبادات کے گزشتہ ناقص طریقوں کی تکمیل' مبہم بیانات کی تشریح اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کی گئی۔

اہل عرب جہاں آسمانی مذہب کی دوسری حقیقتوں سے بے خبر تھے وہاں عبادت کے مفہوم و معنی اور اس کے صحیح طریقوں سے بھی ناواقف تھے۔ عرب میں جو یہود اور عیسائی تھے وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت ان کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔ اس عہد میں جو عیسائی فرقے عرب میں تھے' عقائد میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ حضرت مسیح کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے اور عبادات میں یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے عرب کے سنسان بیابانوں اور پہاڑوں میں انہوں نے اپنی عبادت گاہیں اور خانقاہیں بنا لی تھیں اور ان میں بیٹھ کر تمام دنیا کی جدوجہد اور سعی و کوشش کے میدانوں سے ہٹ کر مجرد اور متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے اسی لیئے عربوں کی شاعری میں عیسائیت کا تخیل ایک ''راہب متبتل'' کی صورت میں تھا' عرب کا سب سے بڑا شاعر امراء القیس کہتا ہے۔

منارہبت مسمی راھب متبتل

دنیا سے الگ تھگ زندگی بسر کرنیوالے راہب کا نام کا چراغ

عرب میں یہودی اپنی اخلاقی اور مذہبی بدعملیوں کے سبب سے سخت بدنام تھے ان میں روحانی خلوص و ایثار اور خدا پرستی نام کو نہ تھی وہ صرف سبت (سنیچر) کے دن تو رات کے حکم کے مطابق تعطیل منانا اور اس دن کوئی کام نہ کرنا بڑی عبادت سمجھتے تھے۔قرآن پاک نے ان دونوں فرقوں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے' یہودیوں پر اس نے بے حکمی' نافرمانی' اکل حرام اور طاغوت کی پرستش کا اور عیسائیوں پر غلو فی الدین کا صحیح الزام قائم کیا ہے۔(۱)۔

(۱)۔ دیکھو سورہ مائدہ رکوع ۱۱'۹ اور سورہ حدید رکوع ۴۔

یہودی جادو' ٹونکا اور عملیات کے توہمات میں گرفتار تھے اور جب کبھی موقع ملتا' غیر قوموں کے بتوں کے سامنے بھی سر جھکا لیتے تھے۔عیسائی حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور مسیحی اولیاء اور شہیدوں کی تصویروں' مجسموں' یادگاروں اور مقبروں کو پوجتے تھے' انہوں نے راہبانہ عبادت کے نئے نئے اور جسم کو سخت تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کیئے تھے اور ان کا نام انہوں نے دینداری رکھا تھا' سورۂ حدید میں قرآن پاک نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو فاسق کہا ہے لیکن ان دونوں کے فسق میں نہایت نازک فرق ہے۔یہود کا فسق دین میں کمی اور سستی کرنا اور نصاریٰ کا فسق دین میں زیادتی اور غلو کرنا تھا اور خدا کے مشروع دین میں کمی اور زیادتی دونوں گناہ ہیں' اسی لیئے قرآن نے دونوں کو برابر کا فسق قرار دیا۔

ولقد ارسلنا نوحا و ابراهيم و جعلنا فی ذريتهما النبوت و الكتب فمنهم مهتد و كثير منهم فسقون' ثم قفينا على اثارهم برسلنا و قفينا بعيسى ابن مريم و اتينه الانجيل و جعلنا فی قلوب الذين اتبعوه رافهت و رحمهت و رهبانيهت ابتدا عوها

ما کتبنها علیهم الا ابتغاء رضوان الله فما رعوها حق رعایتها فاتینا الذین امنوا منهم اجرهم و کثیر منهم فسقون۔ (حدید:۴)

اور ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھی، تو ان میں سے کچھ راہ پر ہیں اور اکثر نافرمان ہیں۔ پھر ان کے بعد ان کے پیچھے ہم نے اپنے اور پیغمبر بھیجے اور مریمؑ کے بیٹے عیسٰیؑ کو بھیجا اور ان کو انجیل عنایت فرمائی اور جنہوں نے عیسٰیؑ کی پیروی کی ان کے دل میں نرمی اور رحم دلی بنائی اور ایک رہبانیت انہوں نے نئی چیز نکالی جو ہم نے ان پر نہیں لکھی تھی لیکن خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تو انہوں نے اس رہبانیت کو بھی جیسا نباہنا چاہیئے تھا نہیں نباہا تو ان میں جو ایماندار تھے ان کو ہم نے ان کی مزدوری دی اور ان میں بہت سے نافرمان ہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ عیسائی دین میں اضافہ اور افراط کے مرتکب ہوئے اسی لیئے قرآن نے ان کو بار بار کہا:

لا تغلو فی دینکم (نساء:۱۳۳، مائدہ:۱۰)

اپنے دین میں غلو نہ کرو۔

ان کا سب سے بڑا غلو یہ تھا کہ حضرت عیسٰیؑ کو جن کو صرف رسول اللہ ماننے کا حکم دیا گیا تھا وہ ابن اللہ ماننے لگے اور یہود کا یہ حال تھا کہ وہ خدا کے رسولوں کو رسول بھی ماننا نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کو قتل کرتے تھے ویقتلون النبین (بقرہ و آل عمران) ساتھ ہی وہ خدائے برحق کو چھوڑ کر بت پرست ہمسایہ قوموں کے بتوں کو پوجنے لگے تھے، چنانچہ تورات میں یہودیوں کی بت پرستی اور غیر خداؤں کے آگے سر

جھکانے کا بار بار تذکرہ ہے اور قرآن میں ان کے متعلق ہے:

وعبد الطاغوت (مائدہ)

اور جنہوں نے شیطان کو (یا بتوں کو) پوجا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں کو تبلیغ کی:

ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبله الرسل و امه صدیقة کانا یاکلن الطعام' انظر کیف نبین لهم الایت ثم انظر انی یو فکون قل اتعبدون من دون الله مالا یملك لکم ضرا و لا نفعا والله هوا السمیع العلیم۔ قل یا هل الکتب لا تغلو فی دینکم غیرالحق و لا تتبعو اهوء قوم قد ضلوا من قبل و اضلو کثیرا وضلو عن سوآء السبیل (مائدہ: ۱۰)

مریم کا بیٹا مسیح ایک پیغمبر ہے اور بس۔ اس سے پہلے پیغمبر گزر چکے اور اس کی ماں ولی تھی۔ دونوں (انسان تھے) کھانا کھاتے تھے۔ خدا نہ تھے) دیکھ ہم ان (عیسائیوں) کیلئے اس طرح کھول کر دلیلیں بیان کرتے ہیں پھر بھی دیکھ وہ کدھر الٹے جاتے ہیں (ان سے) کہہ کہ کیا تم خدا کو چھوڑ کر ان (انسانوں) کو پوجتے ہو جن کے ہاتھ میں نہ نقصان ہے نہ نفع' اللہ ہی سننے والا اور جاننے والا ہے' جو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے کہہ اے کتاب والو! اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کے خیال پر نہ چلو جو بہک گئے اور بہتوں کو بہکایا۔ اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔

ان کی یہ حالت تھی:

اتخذو احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ

(توبہ: ۵)

خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا بنالیا تھا۔

اس زمانے میں عیسائیوں کے جو گرجے اور پرستش گاہیں عرب میں اور خصوصاً ملک حبش میں تھیں، ان میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ اور حواریوں، ولیوں اور شہیدوں کی تصویریں اور مجسمے نصب تھے۔ عبادت گزار ان کے آگے دھیان اور مراقبہ میں سربسجود رہتے تھے۔ صحابہ میں سے جن لوگوں کو حبشہ کی ہجرت کے اثناء میں ان معبدوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا ان میں سے شاید بعض بیبیوں کی نگاہ میں ان بزرگوں کی تعظیم و تکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے مرض الموت میں بعض ازواج مطہراتؓ نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا اور ان کی تصویروں اور مجسموں کے حسن و خوبی کو بیان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے، انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔ تم ایسا نہ کرنا۔ ان میں سے جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے اور اس میں اس کی تصویر کھڑی کر دیتے تھے (۱)۔

ایڈورڈ گبن نے تاریخ ترقی و زوال روم کی متعدد جلدوں کے خاص ابواب میں عیسوی مذہب کے عبادات کے جو حالات بیان کیئے ہیں وہ تمام تر حدیث مذکور کی تصدیق و تائید میں ہیں۔ خصوصاً تیسری اور پانچویں جلد میں حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ سینٹ پال اور متعدد ولیوں اور شہیدوں کی پرستش گاہوں کے در و دیوار سے قرآن پاک کی صداقت کی آوازیں آرہی ہیں اور آج بھی دیندار عیسائی دن رات موم بتیوں کی روشنی میں ان کے آگے مراقبوں اور تسبیحوں میں سرنگوں نظر آتے ہیں۔

روم (اٹلی) کے تاریخی گرجاؤں میں یہ منظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس وقت محمد رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کی اصلی تشریح میری آنکھوں کے سامنے تھی۔

(۱)۔ صحیح مسلم کتاب مساجد۔

یہودیوں اور عیسائیوں کو چھوڑ کر خاص عرب کے لوگ اللہ نام ایک ہستی سے واقف ضرور تھے مگر اس کی عبادت اور پرستش کے مفہوم سے بے خبر تھے' لات' عزیٰ' ہبل اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتوں کو حاجت روا اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے' ان پر جانور قربانی کرتے اور اپنی اولادوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے۔ سال کے مختلف اوقات میں مختلف بت خانوں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے اور پتھروں کے ڈھیروں کے سامنے بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے۔ خانہ کعبہ یعنی خلیل بت شکن کا معبد تین سو ساٹھ بتوں کا مرکز تھا اور ان کی نماز یہ تھی کہ خانہ کعبہ کے صحن میں جمع ہو کر سیٹی اور تالی بجا بجا کر بتوں کو خوش اور راضی رکھیں۔ قریش کا موحد زید بن عمرو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے بت پرستی سے تائب ہو چکا تھا' وہ کہا کرتا تھا کہ ''اے خدا! مجھے نہیں معلوم کہ میں تجھ کو کس طرح پوجوں' اگر جانتا تو اسی طرح عبادت کرتا (۱)۔''۔

ایک صحابی شاعر عامر بن اکوع خیبر کے سفر میں یہ ترانہ گا رہے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سن رہے تھے (۲)۔۔

واللہ لو لا انت ما اھتدینا

ولا تصدقنا ولا صلینا

خدا کی قسم اگر تو نہ ہوتا تو نہ ہم راستہ پاتے

نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے

اس شعر میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ محمد صلی اللہ ہی کی تعلیم تھی جس نے اہل

عرب کو عبادت کے صحیح طریقوں سے آشنا کیا۔

عرب سے باہر بھی کہیں خدائے واحد کی پرستش نہ تھی' بت پرست یونانی اپنے بادشاہوں اور ہیروں کے مجسمے اور ستاروں کے ہیکل پوجتے تھے۔ روم' ایشیائے کوچک' یورپ' افریقہ' مصر' بربر' حبشہ وغیرہ عیسائی ملکوں میں حضرت عیسیٰؑ' حضرت مریمؑ اور سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی مورتیاں اور ہڈیاں اور ان کی منصوعی یادگاریں پوجی جا رہی تھیں زردشت کی مملکت میں آگ کی پرستش جاری تھی' ہندوستان سے لیکر کابل وترکستان اور چین اور جزائر ہند تک بودھ کی مورتیوں' سادھیوں اور اس کی جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ کی پوجا ہو رہی تھی۔ چین کے کنفوشس اپنے باپ دادا کی مورتوں کے آگے خم تھے' خاص ہندوستان میں سورج دیوتا' گنگا مائی اور اوتاروں کی پوجا ہو رہی تھی۔ عراق کے صابی سبع سیارہ کی پرستش کی تاریکی میں مبتلا تھے' باقی تمام دنیا درختوں' پتھروں' جانوروں' بھوتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کر رہی تھی۔ غرض عین اس وقت جب تمام دنیا خدائے واحد کو چھوڑ کر' آسمان سے زمین تک مخلوقات کی پرستش میں مصروف تھی' ایک بے آب وگیاہ ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی:

یا ایھا الناس اعبدو اربکم الذین خلقکم والذین من قبلکم (بقرہ:۳)

لوگو! اپنے اس پروردگار کی پرستش کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا۔

سابق کتب الٰہی کے ایمانداروں کی آواز دی گئی:

یا ھل الکتب تعالو الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ان لا نعبدو الا اللہ (آل عمران:۷)

اے کتاب والو! آؤ ہم تم اس بات پر عملاً متحد ہو جائیں جس میں ہم تم عقیدۃً متفق ہیں کہ ہم خدائے برحق کے سوا کسی

اور کی پرستش نہ کریں۔

مگر یہ آواز ریگستان عرب کے صرف چند حق پرستوں نے سنی اور پکار اٹھے:

ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان امنوا بربکم فامنا۔ ربنا فاغفرلنا ذنوبنا(آل عمران: ۲۰)

خداوندہم نے ایمان کے منادی کی آواز سنی کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لے آئے تو اے پروردگار ہمارے گناہ معاف کر۔

---

(۱)۔ سیرہ ابن اھشام ذکر زید بن عمر (۲)۔ صحیح مسلم باب خیر' شعر کا پہلا لفظ مختلف روایتوں میں مختلف ھے۔

ان واقعات کو سامنے رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کی صداقت کا اندازہ کرو جو بدر کے امتحان گاہ میں آپ کی زبان عبودیت ترجمان سے بارگاہ الٰہی میں کی گئی تھی:

''خداوند تیرے پوجنے والوں کی یہ مٹھی بھر جماعت آج تمہارے لیئے لڑنے پر آمادہ ہے' خداوند آج اگر یہ مٹ گئی تو پھر زمین میں کبھی تیری پرستش نہ ہوگی (۱)۔''۔

خدا نے اپنے نبی کی دعا سنی اور قبول فرمائی کیونکہ خاتم الانبیاء کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا' جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا اور خدا کی سچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا۔

صرف ایک خدا کی عبادت::

مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ میں نبوت محمدی کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کے معبدوں سے تمام باطل معبودوں کو باہر نکال پھینک دیا۔ باطل معبودوں کی عبادت اور پرستش یک قلم محو کر دی اور صرف ایک خدا کے سامنے خدا کی تمام مخلوقات کی گردنیں جھکا دیں اور صاف اعلان کر دیا کہ:

ان کل من فی السموات والارض الا اتی الرحمن عبدا۔ (مریم:۲)

آسمان اور زمین کی تمام مخلوق اس مہربان خدا کے سامنے غلام ہی بن کر آنے والی ہے۔

خدا کے سوا نہ تو آسمان میں، نہ زمین میں، نہ آسمان کے اوپر اور نہ زمین سے نیچے کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ اور رکوع وقیام کی مستحق ہے اور نہ اس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جاندار کا خون بہایا جا سکتا ہے اور نہ اس کی پرستش کے لیئے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جا سکتی ہے اور نہ اس کی نذر مانی جا سکتی ہے اور نہ اس سے دعا مانگی جا سکتی ہے۔ ہر عبادت صرف اسی کے لیئے اور ہر پرستش اسی کی خاطر ہے:

ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین۔ (انعام:۲۰)

بے شبہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لیئے ہے۔

کفار کو بتوں، دیوتاؤں، ستاروں اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا اور انہیں ہر دلیل سے سمجھایا گیا کہ خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہیں لیکن جب ان پر اس سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا تو اسلام کے پیغمبر کو اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا:

قل یایھا الکفرون الا عبدو ما تعبدون ولا انتم عبدون ما اعبدو ولا انا عابد ما عبدتم ولا انتم عبدون ما اعبد لکم دینکم ولی دین۔ (کافرون:۱)

اے کافرو! جس کو تم پوجتے ہو اس کو میں نہیں پوجتا اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو جس کو میں پوجتا ہوں اور نہ میں اس کو

پوجنے والا ہوں جس کو تم نے پوجا اور نہ تم اس کو پوجنے والے
ہو جس کو میں پوجتا ہوں تمہارے لیئے تمہارا دین ہے اور
میرے لیئے میرا دین ہے۔

(۱)۔ صحیح مسلم اور جامع ترمذی' غزوہ بدر۔

خارجی رسوم کا وجود نہیں::

خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم و جان سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں' نہ سورج کے نکلنے اور اس کی طرف دیکھنے کی حاجت' نہ دریا میں جا کر اس کا پانی اچھالنے سے مطلب (۱)۔' نہ سامنے آگ کا آلاؤ جلانے کی ضرورت (۲)۔ نہ دیوتاؤں' دیبیوں' بزرگوں اور ولیوں کے مجسمے کو پیش نظر رکھنے کی اجازت (۳)۔' نہ سامنے موم بتیوں کے روشن کرنے کا حکم (۴)۔ نہ گھنٹوں اور ناقوسوں کی ضرورت' نہ لوبان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم' نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف اور برتنوں کے رکھنے کا طریقہ' نہ کسی خاص قسم کے کپڑوں کی قید (۵)۔۔ ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے' اس کے لیئے صرف ایک پاک ستر پوش لباس' پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے' اگر جسم و لباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے تو یہ بھی معاف ہے۔

درمیانی آدمی کی ضرورت نہیں::

اسلام میں عبادت کے لیئے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانگی کی ضرورت نہیں۔ محمد رسول اللہ علیہ وسلم کے دین میں ہندوؤں کی طرح نہ برہمن ہیں نہ پروہت ہیں' نہ پجاری ہیں' نہ یہودیوں کی طرح کاہن ہیں' نہ ربی ہیں نہ حاخام ہیں' نہ حضرت ہارونؑ کے خاندان کی وساطت کی قید ہے نہ عیسائیوں کی طرح عبادتوں کی بجا آوری کے لیئے پادریوں اور مختلف مذہبی عہدیداروں کی ضرورت ہے اور نہ پارسیوں کی طرح دستوروں اور موبدوں کی

حاجت' یہاں ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے' آپ باتیں کرتا ہے' آپ عرض حال کرتا ہے۔ ہر مسلمان اپنا آپ برہمن' اپنا آپ کاہن' اپنا آپ پادری اور اپنا آپ دستور ہے' یہاں یہ حکم ہے کہ تم مجھے براہ راست پکارو' میں جواب دوں گا۔

ادعونی استجب لکم (مومن:٦٠)

تم مجھے پکارو میں تم کو جواب دوں گا۔

خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں::

اکثر مذاہب نے اپنی عبادتوں کو دلکش' دلفریب' موثر اور بارعب بنانے کے لیئے خارجی تاثرات سے کام لیا تھا' کہیں ناقوس اور قرنا کی بارعب آوازیں تھیں' کہیں سازوترنم اور نغمہ وبڑ کی دلکش صدائیں تھیں' کہیں جرس اور گھنٹے کا غلغلہ انداز شور' لیکن دین محمدی ﷺ کی سادگی نے ان میں سے ہر ایک سے احتراز کیا اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کے لیئے دل کے ساز اور روح کی صدا کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیروں کا سہارا نہیں لیا تا کہ خدا اور بندہ کا راز و نیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کے ساتھ خلوص واثر کے مناظر پیدا کرے۔

مکان کی قید نہیں::

ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ اور چونے کی چہار دیواری میں محدود کیا ہے۔ بت خانوں سے باہر پوجا نہیں' آتش خانوں سے الگ کوئی نماز نہیں' گرجوں کے سوا کہیں دعا نہیں اور صومعوں سے نکل کر کوئی پرستش نہیں' لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے طریقہ میں نہ کسی در و دیوار کی

---

(١)۔ جیسا کہ ہندوؤں میں ہے۔ (٢)۔ جیسا کہ پارسیوں میں ہے۔ (٣)۔ جیسا کہ ہندوؤں عام بت پرستوں اور رومن کتھولك میں ہے۔ (٤)۔ جیسا کہ رومن کیتھولك عیسائیوں میں ہے۔ (٥)۔ یہ چیزیں یہودیوں کے ہاں ہیں۔ پارسیوں میں سفید کپڑوں کی اکثر ضرورت ہے۔

ضرورت، نہ محراب ومنبر کی حاجت، وہ دیر وحرم، معبد وصومعہ اور مسجد وکنیسہ سب سے بے نیاز ہے۔ زمین کا ہر گوشہ بلکہ پہنائے کائنات کا ہر حصہ اس کا معبد اور عبادت خانہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ''مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتیں عنایت کیں جو مجھ سے پہلے پیغمبر کو نہیں دی گئیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے۔

وجعلت لی الارض مسجدا

اور میرے لیئے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنادی گئی۔

تم سوار ہو کہ یہ پیادہ، گلگشت چمن میں ہو کہ ہنگامہ کارزار میں، خشکی میں ہو کہ تری میں، ہوا میں ہو کہ زمین پر، جہاز میں ہو کہ ریل پر ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو اور اس کے سامنے سجدۂ نیاز بجالا سکتے ہو یہاں تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے ایسے معبد میں ہو جس میں سامنے بت اور مجسمے نہ ہوں تو وہاں بھی اپنا فریضۂ عبادت ادا کر سکتے ہو (۱)۔

خاص خاص عبادتوں کے وقت مختلف سمتوں اور چیزوں کی طرف رخ کرنا بھی ہر مذہب میں ضروری سمجھا جاتا ہے چنانچہ تمام مسلمانوں کو ایک واحد رخ پر مجتمع کرنے کے لیئے تا کہ ان میں وحدت کی شان نمایاں ہو، مسلمانوں کے لیئے بھی کسی ایک سمت خاص کی حاجت تھی اور اس کے لیئے اسلام میں مسجد ابراہیمی کی تخصیص کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کی پرستش کا پہلا مقام ہے لیکن اس کی حیثیت وہ نہیں قائم کی گئی جو دوسرے مذاہب کے قبلوں کی ہے، اسلام کا قبلہ شمال وجنوب اور مشرق و مغرب کی حدود سے پاک ہے وہ ستاروں کے رخ یا چاند اور سورج کے مواجہ کا قائل نہیں۔ دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان ہر سمت اور ہر جہت سے اس کی طرف رخ کرتے ہیں۔ مغرب سے بھی، مشرق سے بھی، شمال سے بھی اور جنوب سے بھی، کسی ایک سمت کی تخصیص نہیں اور خود خانہ کعبہ کے صحن میں بیک وقت ہر جہت اور ہر سمت سے اس کی طرف رخ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی سبب سے اس رخ کا بھی پتہ نہ لگ سکے

تو جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی خدا ہے' چنانچہ کسی چلتی ہوئی سواری پر سفر کرنے کی حالت میں اور عام نفل نمازوں کی درستی کے لیئے قبلہ کی بھی تخصیص نہیں جدھر سواری کا رخ ہو ادھر ہی سجدہ کیا جا سکتا ہے۔لڑائیوں میں ہر رخ پر نماز برابر ادا کی جا سکتی ہے' اگر خدانخواستہ کعبہ کی عمارت باقی نہ رہے تب بھی اس کا رخ کھڑا ہو جانا کافی ہے۔کعبہ کے اندر کھڑے ہو کر جدھر چاہو سر جھکا دو۔

انسانی قربانی کی ممانعت::

بعض مذاہب میں خدا کی سب سے مرغوب عبادت یہ سمجھی جاتی تھی کہ انسان اپنی یا اپنی اولاد کی جان کو خواہ گلا گھونٹ کر' یا دریا میں ڈبو کر یا آگ میں جلا کر یا کسی اور طرح سے بھینٹ چڑھا دے' اسلام نے اس عبادت کا قطعی استحصال کر دیا اور بتایا کہ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنا اصل میں یہ ہے کہ کسی سچائی کی حمایت میں یا کمزوروں کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پرواہ نہ کی جائے اور مارا جائے' یہ نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا جائے یا دریا میں ڈوب مرا جائے یا آگ میں اپنے کو جلا دیا جائے' آپ ؐ نے فرمایا کہ ''جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا اس کو جہنم میں اسی چیز سے سزا دی جائے گی۔''(۳)۔

(۱)۔ بخاری کتاب الصلوہ باب قول النبی ﷺ جعلت لی الارض مسجدا و طھورا۔ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الصلوہ باب الصلوہ فی البیتہ۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب من اکفر اخاہ۔

حیوانی قربانی میں اصلاح::

کسی حیوان کی قربانی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب میں رائج تھا۔عرب میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کر کے بتوں پر چڑھا دیتے تھے' کبھی یہ کرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور لا کر باندھ دیتے تھے اور اس کو چارہ گھاس نہیں دیتے تھے۔وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا

تھا۔ اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ خدا خون کے نذرانہ سے خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ قربانی ذبح کر کے معبد کی دیوار پر اس کے خون کا چھاپ دیتے تھے۔ یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور ذبح کر کے اس کا گوشت جلا دیتے تھے اور اس کے متعلق وہ جو رسوم ادا کرتے تھے' ان کی تفصیل صفحوں میں بھی نہیں سما سکتی ان کا یہ عقیدہ تھا کہ یہ قربانی خدا کی غذا ہے۔ بعض مذاہب میں یہ تھا کہ اس کا گوشت چیل اور کوؤں کو کھلا دیتے تھے۔ پیغام محمدی ﷺ نے ان سب طریقوں کو مٹا دیا' اس نے سب سے پہلے''۔ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہیں بلکہ تمہارے دلوں کی غذا مطلوب ہے' فرمایا:

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماء ھا ولکن ینالہ التقوی منکم (حج:۵)

اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمہارے دل کی پرہیز گاری پہنچتی ہے۔

اسلام نے تمام عبادات میں صرف حج کے موقع پر قربانی واجب کی ہے اور اہل استطاعت کے لیئے' جو موقع حج پر نہ گئے ہوں' مقام حج کی یاد کے لیئے قربانی مسنون کی گئی ہے تا کہ اس واقعہ کی یاد تازہ ہو جب ملت حنفی کے سب سے پہلے داعی نے اپنے خواب کی تعبیر میں اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کے سامنے قربان کرنا چاہا تھا اور خدا نے اس کو آزمائش میں پورا ہوتا دیکھ کر اس کی چھری کے نیچے بیٹے کی بجائے دنبے کی گردن رکھ دی اور اس کے پیروؤں میں اس عظیم الشان واقعہ کی سالانہ یادگار قائم ہو گئی۔

اسی کے ساتھ پیغام محمدی ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ اس قربانی کا منشا ارواح کو خوش کرنا' مصیبتوں کو دور کرنا' جان کا فدیہ دینا یا صرف خون کا بہانہ اور گردن کا کاٹنا نہیں ہے بلکہ اس سے مقصد دو ہیں' ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کیا جائے کہ

اس نے جانوروں کو ہماری ضرورتوں میں لگایا اور ان کو ہماری غذا کے لیئے مہیا کیا اور دوسرا یہ کہ ان کا گوشت' غریبوں مسکینوں اور فقیروں کو کھلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے' چنانچہ فرمایا:

ولکل امہت جعلنا منسکا لیذ کروا اسم اللہ علی مارزقہم من بھیمہت الانعام فالھکم الہ واحد فلہ اسلمو و بشر المخبتین۔ (حج:۵)

ہم نے ہرقوم کے لیئے قربانی مقرر کی تا کہ وہ ان جانوروں پر خدا کے نام کی یاد کریں جو ہم نے ان کو روزی کی' تو تمہارا خدا ایک خدا ہے' اسی کے آگے سر جھکاؤ اور عاجزی کرنے والے بندوں کو خوشخبری سنادے۔

والبدن جعلنا ھالکم من شعائر اللہ لکم فیھا خیر فاذکروا اسم اللہ علیھا صوآف ج فاذا وجبت جنوبھا فکلوا منھا واطعموا القانع والمعتر کذلک سخرنھا لکم لعلکم تشکرون (حج:۵)

اور قربانی کے جانوروں کو خدا کی نشانیاں بنایا ہے تمہارے لیئے ان میں بہت فائدے ہیں' ان کو قطار میں کھڑا کر کے تم ان پر خدا کا نام لو' تو جب وہ پہلو کے بل جھکیں (یعنی ذبح ہو چکیں) تو ان میں سے کچھ خود کھاؤ اور باقی قناعت پسند فقیروں اور محتاجوں کو کھلا دو' اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے کام میں لگایا ہے کہ خدا کا شکر ادا کرو۔

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں یہ فعل شرک اور ایسے جانور کا گوشت کھانا

حرام ہے وما اھل بہ لغیر اللہ عرب میں دستور تھا کہ خاص رجب کے مہینہ میں قربانی کرتے تھے' اسلام کے بعد لوگوں نے اس کے متعلق آپ ؐ سے پوچھا آپ ؐ نے فرمایا ''خدا کے نام سے جس مہینہ میں چاہو ذبح کرو' نیک کام خدا کے لیئے کرو اور (غریبوں کو) کھلاؤ (۱)''۔ غرض قربانی کی یہی دو حقیقتیں ہیں' صرف خون بہانے کے لیئے خون بہانا قربانی کی حقیقت نہیں اور نہ یہ خون بہانا مشرکوں' وبیوں اور دیوتاؤں کی طرح اسلام کے خدا کو خوش کرنا ہے۔

مشرکانہ قربانیوں کی ممانعت::

اسی لیئے وہ تمام مشرکانہ قربانیاں جو عرب میں جاری تھیں۔ بند کردی گئیں' عرب میں جانوروں کے قربانی کرنے اور ان کو بتوں پر چڑھانے کے مختلف طریقے تھے' اونٹنی کا پہلا بچہ جو پیدا ہوتا تھا بتوں کے نام پر عموماً اس کی قربانی کر دیتے تھے اور اس کی کھال کو درخست پر لٹکا دیتے تھے۔ اس قسم کے بچے کو فرع کہتے تھے۔ رجب کے پہلے عشرہ میں ایک قسم کی قربانی کی جاتی تھی جس کا نام عتیرہ تھا' اسلام نے ان دونوں قربانیوں کو ناجائز قرار دیا اور رجب کی تخصیص باطل کردی۔

قال لا فرع ولا عتیرہ (۲)۔

آپ نے فرمایا کہ فرع اور عتیرہ جائز نہیں ہے۔

بتوں کے نام پر مختلف ناموں سے زندہ جانور چھوڑے جاتے تھے اور ان کو کوئی شخص کسی دوسرے کام میں استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کے متعلق خاص طور پر ایک آیت نازل ہوئی:

ما جعل اللہ من بحیرہ ولا سائبہ ولا وصیلہ ولا حام (مائدہ: ۱۴)

نہ تو خدا نے بحیرہ' نہ سائبہ' نہ وصیلہ اور نہ حام بنایا۔

مردوں کی قبر کے پاس گائے یا بکری ذبح کرتے تھے لیکن اسلام نے مراسم ماتم کی

جو اصلاحیں کیں اس کے سلسلے میں اس کو بھی نا جائز قرار دیا' فرمایا:

لا عقر فی الاسلام (۳)۔

اسلام میں قبر کے پاس جانوروں کا ذبح کرنا جائز نہیں۔

عرب جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی وسخاوت کی نمائش اس طرح کرتے تھے کہ دو آدمی مقابل ہو کر جانوروں کے ذبح کی بازی لگاتے تھے' اپنا ایک اونٹ یہ ذبح کرتا پھر اس کے مقابل میں دوسرا ذبح کرتا۔ اسی طرح یہ مقابلہ قائم رہتا' جس کے اونٹ ختم ہو جاتے یا ذبح کرنے سے انکار دیتا وہ ہار جاتا۔ اسلام نے اس جان و مال کے اتلاف کو روک دیا (۴)۔

---

(۱)۔ ابو داؤد باب العتیرہ۔ جلد دوم ص ۵۔ (۲)۔ ابو داؤد کتاب الاضاحی' ج ۲' ص ۵۔ (۳)۔ ابو داؤد کتاب الجنائز باب کراھیتہ الذبح عند القبر ج ۲' ص ۴۲۔ (۴)۔ ابو داؤد کتاب الاضاحی' ج ۲' ص ۵۔

تجرد' ترک لذائذ' ریاضات اور تکالیف شاقہ عبادت نہیں::

عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے اور وہ اس کی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے' اس لیئے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفیں دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائے گا اسی طرح روح میں زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئے گی۔ چنانچہ یونانی فلسفیوں میں اشراقیت' عیسائیوں میں رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگ' اس اعتقاد کا نتیجہ تھا' کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کر لیتا' کوئی ہفتہ میں یا چالیس دن میں ایک دفعہ غذا کھاتا تھا' کوئی سر تا پا برہنہ رہتا اور ہر قسم کے لباس کو تقدس کا ننگ سمجھتا تھا' کوئی چلہ کی سردی میں اپنے جسم کو ننگا رکھتا تھا' کوئی عمر بھر یا سالہا سال تک سوکھ جائے۔ کوئی عمر بھر تاریک تہہ خانوں اور غاروں میں چھپ کر خدا کی روشنی کو تلاش کرتا تھا' کوئی تجرد اور ترک دنیا کر کے اہل و عیال اور زن و فرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا غلط مدعی

بنتا تھا' لیکن نبوت محمد ﷺ نے یہ راز آشکارا کیا کہ ان میں سے کوئی چیز عبادت نہیں' نہ ترک لذائذ سے حق کی لذت ملتی ہے نہ ہماری غمگینی خدا کی خوشنودی کا باعث ہے اور نہ بندوں کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہے' نہ زن و فرزند کی نفرت سے خدا کی محبت نصیب ہوتی ہے نہ ترک دنیا سے دین کی دولت ملتی ہے۔ خدا کا دین اتنا ہی ہے جو بندہ کی استطاعت کے اندر ہے۔ اس نے کہا:

لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا (بقرہ: ۱۰)

خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ (حکم) نہیں دیتا۔

اسلام میں روزہ ایک ایسی چیز تھی جس کی بعضوں کے لیئے غیر معمولی تکلیف کہہ سکتے ہیں۔ اسلام نے اس میں متعدد آسانیاں پیدا کر کے کہا:

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (بقرہ: ۴۰)

خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں۔

حج بھی سب لوگوں پر مشکل تھا تو ساتھ ہی فرما دیا:

من استطاع الیہ سبیلا (آل عمران: ۱۰)

جس کو (زاد راہ اور چلنے کی) استطاعت ہو اسی پر حج فرض ہے۔

وما جعل علیکم فی الدین من حرج (حج: ۱۰)

تمہاری لیئے دین میں اس نے (خدا نے) تنگی نہیں کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان ھذا الدین لیسر ولن یشاد الدین احد الا غلبہ (۱)۔

یہ دین آسان ہے جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب کر دے گا۔

اور فرمایا:

انما انا بعثت بالملۃ السمحۃ او السھلۃ الحنیفیۃ البیضاء (۲)۔

میں تو سہل اور آسان روشن حنفی دین دے کر بھیجا گیا ہوں۔

(۱)۔ جمع الفوائد طبع میرٹھ ص ۲، ۲۔ باب الاقتصاد فی الاعمال بحوالہ صحیح بخاری و متن نسائی۔ (۲)۔ مسند ابن حنبل ج ۵، ص ۲۶۶۔

مذہب میں رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا خواہ وہ کتنی ہی خوش نیتی سے کیا گیا ہوتا ہم وہ دین حق کی اصلی تعلیم نہ تھی۔ اس لیئے اسلام کے صحیفہ نے اس کو بدعت سے تعبیر کیا اور کہا:

ورھبانیۃ ن ابتدعوھا ما کتبنھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا (حدید: ۴)

اور عیسائیوں نے ایک رہبانیت کی بدعت نکالی اور ہم نے ان کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا اس کا حکم نہیں دیا، تو جیسا چاہئے اس رہبانیت کا حق ادا نہ کیا۔

ان لوگوں سے جنہوں نے اچھے کھانوں اور زیب و زینت کی جائز چیزوں کو بھی اس لیئے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا کہ اس سے خدا خوش ہوگا، یہ سوال کیا:

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ الطیبت من الرزق (اعراف: ۴)

پوچھ اے پیغمبر کہ اس زیب و زینت اور رزق کی اچھی چیزوں کو جن کو خدا نے اپنے بندوں کے لیئے بنایا کس نے حرام کیا؟

اسلام نے اس مسئلہ میں یہاں تک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بیبیوں کی خوشنودی مزاج کے لیئے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی، اس پر

عتاب آیا' خدا نے فرمایا:

یـایهـا النبی لم تحریم ما احل الله لك تبتغی
مرضات ازواجك۔ والله غفور رحیم (تحریم: ۱)

اے پیغمبر! خدا نے جس چیز کو تیرے لیئے حلال کیا تو اس کو
اپنی بیبیوں کی خوشی کی خاطر اپنے اوپر حرام کیوں کرتا ہے اور
خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

صحابہؓ میں بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبوں کے اثر یا ذاتی میلان طبع کے سبب سے تجرد' ترک لذائذ اور ریاضات شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو اس سے باز رکھا اور فرمایا کہ میں یہ شریعت لے کر نہیں آیا۔ قدامہؓ بن مظعون اور ان کے ایک رفیق نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی کی یارسول اللہ! ہم میں سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور شادی نہ کرنے کا اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''میں تو دونوں باتیں کرتا ہوں'' یہ سن کر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے (۱)۔۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جو ایک نہایت عابد و زاہد صحابی تھے' یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے' اور رات بھر عبادت کریں گے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ''اے عبداللہ! تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے' تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے۔ تمہاری بیوی کا بھی حق ہے' مہینہ میں تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے (۲)۔'' اسی قسم کی نصیحت آپ ﷺ نے ایک دوسرے تقشّف پسند صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون کو فرمائی' آپ ﷺ کو ان کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے' دن کے روزے رکھتے ہیں' رات کو سوتے نہیں' آپ ﷺ نے ان کو بلا کر پوچھا کہ ''کیوں عثمان! تم میرے طریقے سے ہٹ گئے'' عرض کی خدا کی قسم! میں نہیں ہٹا

ہوں میں آپ ﷺ ہی کے طریقہ کا طلب گار ہوں''۔فرمایا''میں سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں' روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔اے عثمان! خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل وعیال کا بھی تم پر حق ہے'

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الصوم۔ (۲)۔ ایضاً۔

تمہارے مہمان کا بھی حق ہے' تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے۔تو روزے بھی رکھو' افطار بھی کرو' نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی (۱)۔''

قبیلہ باہلہ کے ایک صحابی جب اسلام لاکر اپنے قبیلہ میں واپس گئے تو انہوں نے دن کا کھانا چھوڑ دیا اور مسلسل روزے رکھنے لگے' ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو ان کی صورت اتنی بدل گئی تھی آپ ؐ ان کو پہچان نہ سکے۔انہوں نے اپنا نام بتایا تو فرمایا''تم خوش رو تھے' تمہاری صورت کیوں ایسی ہوگئی؟''عرض کی''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب سے آپ سے مل کر گیا ہوں متصل روزے رکھتا ہوں' فرمایا''تم نے اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک روزہ کافی ہے''۔انہوں نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی تو آپ ؐ نے مہینہ میں دو روزوں کی اجازت دی' انہوں نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو آپ نے مہینہ میں تین روزے کر دیئے' انہوں نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے ماہ حرام کے روزوں کی اجازت دی (۲)۔ایک دفعہ چند صحابہؓ نے ازواج مطہراتؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ؐ کی دن رات کی عبادت وریاضت کا حال دریافت کیا' وہ سمجھتے تھے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دن رات سوا عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا۔انہوں نے آپ ؐ کی عبادت کا حال سنا تو بولے ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت' آپ تو معصوم ہیں۔ان میں سے ایک صاحب نے کہا میں تو رات بھر نمازیں پڑھوں گا۔ دوسرے صاحب بولے میں عمر بھر روزے رکھوں گا' تیسرے صاحب نے اپنا ارادہ

ظاہر کیا کہ میں عمر بھر مجرد رہوں گا کبھی نکاح نہ کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ گفتگو سن رہے تھے، ان کو خطاب کر کے فرمایا ''خدا کی قسم! میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں تاہم میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، جو میرے طریقہ پر نہیں چلتا وہ میری جماعت میں نہیں (۳)۔

بعض صحابہؓ نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے، چاہا کہ اپنا عضو قطع کرا دیں، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس رہبانیت کی اجازت چاہی تو آپ نے سخت برہمی ظاہر فرمائی، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص وغیرہ صحابہ کہتے ہیں، اگر حضور اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لیئے تیار تھے (۴)۔

(۱)۔ ابو دائود کتاب الصلوہ باب مایو مربہ من القصدنی الصلوہ۔ (۲)۔ ابو دائود باب صوم اشہر الحرم۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب النکاح۔ (٤)۔ صحیح بخاری و ابو دائود کتاب النکاح۔

ان واقعات سے اندازہ ہوگا کہ آپ ﷺ نے کس اہتمام بلیغ کے ساتھ لوگوں کو عبادت کا صحیح مفہوم و مقصود تعلیم فرمایا:

آپ ﷺ نے کبھی کبھی بذات خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھے، صحابہ نے بھی آپ ﷺ کی پیروی میں اس قسم کے روزے رکھنے چاہئے، آپ ﷺ نے منع فرمایا لیکن وہ یہ سمجھے کہ آپ ﷺ صرف اپنی شفقت کی بناء پر منع فرماتے ہیں اس لیئے انہوں نے افطار نہ کیا، آپ ﷺ نے دو دن روزے رکھے تھے کہ اتفاق سے چاند نکل آیا، آپ ﷺ نے افطار کر لیا اور فرمایا کہ اگر مہینہ بڑھ سکتا، تو میں اتنے روزے رکھتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو رہ جاتا۔ صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! پھر آپ کیوں کئی کئی دن کے روزے رکھتے ہیں؟ فرمایا ''تم میں سے کون میری طرح ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے (۱)۔'' اسی لیئے اسلام میں

عام امت کیلئے یہ روزے نہیں ہیں۔

ایک دفعہ ایک مسجد میں آپ کا گزر ہوا' دیکھا تو ایک کھمبے میں ایک رسی لٹک رہی ہے' دریافت کیا تو لوگوں نے کہا یہ زینبؓ نے باندھی ہے' رات کو نماز میں جب وہ کھڑی کھڑی تھک جاتی ہیں تو اسی کے سہارے کھڑی ہوتی ہیں' یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ رسی کھول دوں' لوگو! تم اسی وقت تک نماز پڑھو جب تک تم میں نشاط باقی رہے' جب کوئی تھک جائے تو بیٹھ جائے (۲)۔''

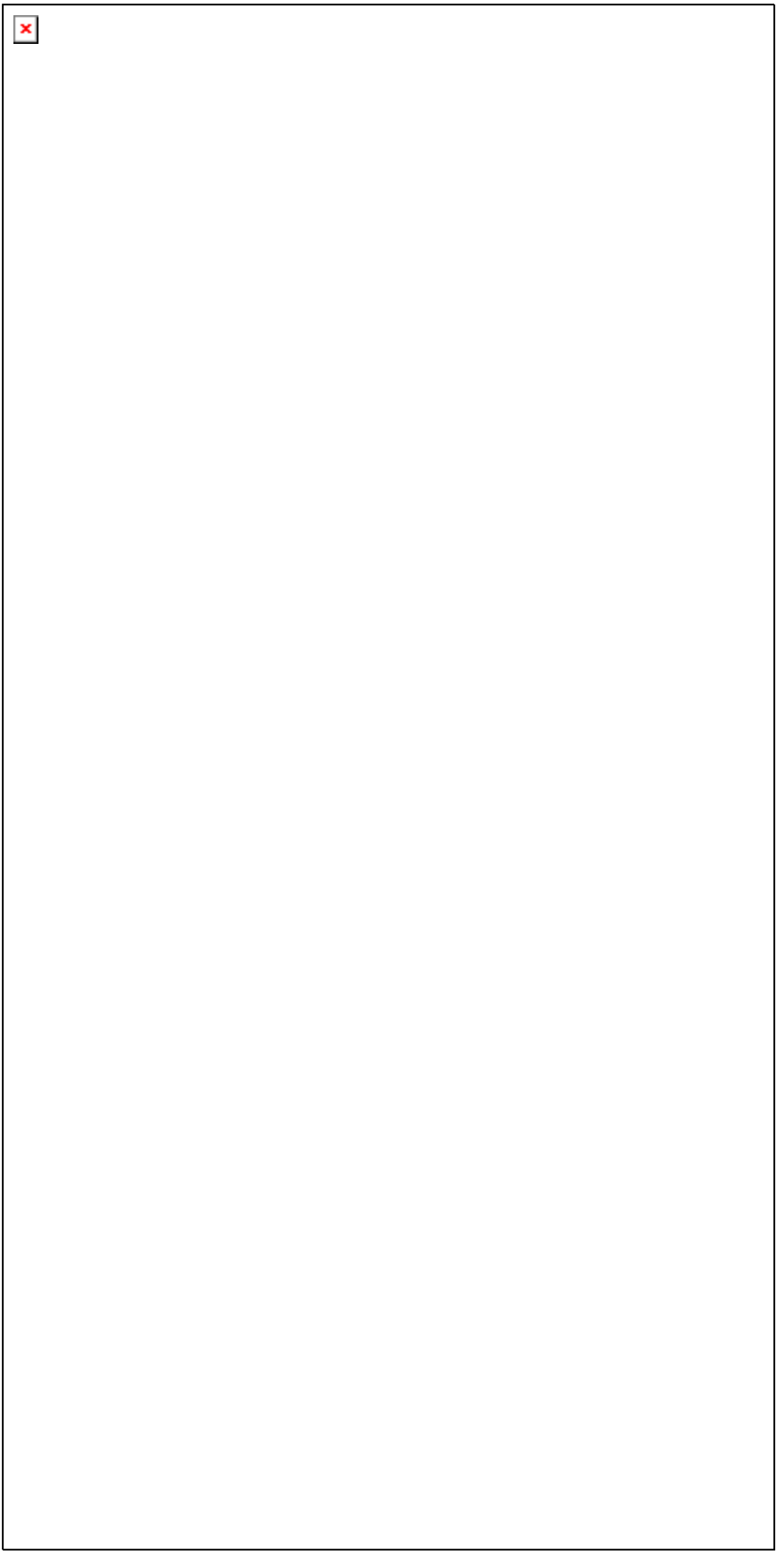
ایک دفعہ ایک عورت سامنے سے گزری' حضرت عائشہؓ نے کہا ''یہ خولاء ہے' لوگ کہتے ہیں کہ یہ رات بھر نہیں سوتی اور عبادت میں مصروف رہتی ہے''۔ فرمایا کہ ''یہ رات بھر نہیں سوتی لوگو! اسی قدر کرو جتنی طاقت ہے (۳)۔''

جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھر نمازوں میں مشغول رہتے ہیں' ان کو مخاطب کر کے فرمایا:

لا تشددا علی انفسکم فانما ھلک من کان قبلکم بتشدیدھم علی انفسھم و ستجدون بقایاھم فی الصوامع والدیارات (۴)۔

اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو کر سکو' کیونکہ جب تک تم نہ اکتاجاؤ' خدا نہیں اکتاتا۔ خدا کے نزدیک پسندیدہ وہی کام ہے جس کو تم ہمیشہ کر سکو اگرچہ وہ تھوڑی ہی ہو۔

حج میں رہبانیت کی بہت سی باتیں عرب میں جاری تھیں۔ بعض حاجی یہ عہد کر لیتے تھے کہ وہ اس سفر میں زبان سے کچھ نہ بولیں گے یا سواری کی استطاعت کے باوجود وہ پیادہ سفر کریں گے اور کسی سواری پر نہ چڑھیں گے یا اس سفر میں کسی سایہ کے بغیر دھوپ ہی میں چلیں گے بعض لوگ اپنی گناہ گاری کے اظہار کے لئے اپنی ناک میں نکیل ڈال کر طواف کرتے تھے اور اس کو ثواب جانتے تھے' اسلام نے ان تمام



روزہ پورا کرے۔"(۱)۔

حج میں دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک میں نکیل ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اس کی نکیل پکڑ کر کھینچ رہا ہے آپ ﷺ نے جا کر نکیل کاٹ دی اور فرمایا کہ "اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اس کو طواف کراؤ۔"(۲)۔

اس قسم کی غیر ضروری ریاضتوں کے متعلق عیسائی راہبوں کی ناگفتہ بہ حالت دکھا کر آپ نے فرمایا:

"اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ تم سے پہلی قومیں اپنی جانوں پر سختی کرنے سے تباہ ہوئیں اور ان کی بقیہ نسلیں آج بھی گرجوں اور دیروں میں تم کو ملیں گی۔"

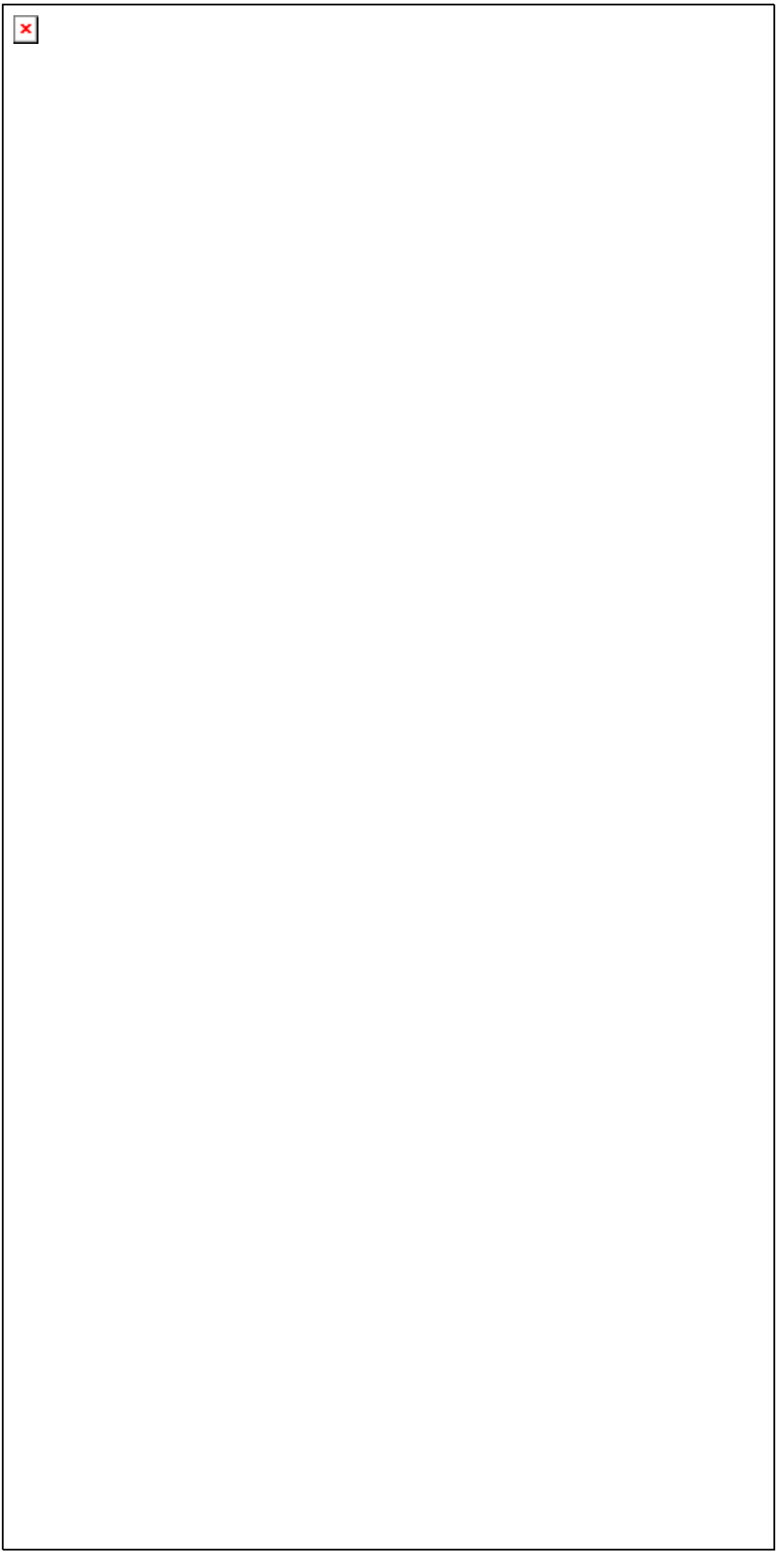
خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقوں کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا، آپ ﷺ نے فرمایا:۔

لا صرورہیت فی الاسلام (ابو دائود)

اسلام میں رہبانیت نہیں۔

عزلت نشینی اور قطع علائق عبادت نہیں::

اکثر مذاہب نے دینداری اور خدا پرستی کا کمال یہ سمجھا کہ انسان کسی غار کھوہ یا جنگل میں بیٹھ جائے اور تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لے، اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہیں قرار دیا۔ عبادت درحقیقت خدا اور اس کے بندوں کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا اس بنا پر وہ شخص وہ تمام ہم جنسوں سے الگ ہو کر ایک گوشتہ میں بیٹھ جاتا ہے درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے اس لئے وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں، اسلام کا صحیح تخیل یہ ہے کہ انسان تعلقات کے اژدھام اور علائق کے ہجوم میں گرفتار ہو کر ان میں سے ہر ایک کے متعلق جو اس کا فرض ہے اس کی بخوبی ادا کرے جو شخص ان تعلقات و علائق اور حقوق و فرائض کے ہجوم سے گھبرا کر کسی گوشتہ عافیت کو تلاش کرتا ہے وہ دنیا کے کار



رات کی چند ساعتیں اور سال میں رمضان کے چند اخیر دن گوشہ عزلت اور زاویہ تنہائی میں بسر ہوتے تھے' ورنہ تمام دن پوری جماعت کے ساتھ مل کر خالق کی عبادت اور پھر مخلوق کی خدمت میں صرف ہوتے تھے اور یہی تمام خلفاء اور عام صحابہؓ کا طرز عمل رہا اور یہی اسلام کی عمل اور سیدھی سادھی عبادت تھی۔(۲)۔

(۱)۔ مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۲۶۶۔ (۲)۔ اسلام میں گوشہ گیری اور عزلت کی اجازت صرف دو قوموں پر ہے۔ ایک اس شخص کے لئے جس میں فطرہ بدی ہے جس کی سرشت دوسروں کو نفع پہنچانا نہیں بلکہ تکلیف دینا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو برائی سے بچنے کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ وہ لوگوں سے قطع تعلق کر لے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک شخص نے آکر آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا "ایک تو وہ جو اپنی جان و مال کو خدا کی راہ میں قربان کرتا ہے' دوسرا وہ جو کسی گھاٹی میں بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرتے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رہنے دے۔ اس تعلیم نبوی نے انسانوں کی دو قسمیں کر دیں۔ ایک وہ جس کو خلق اللہ کی ہدایت اور خدمت کی فطری توفیق ملی ہے تو ان پر فرض ہے کہ وہ مجمع اور ہجوم میں رہ کر ان کی بھلائی کا فرض انجام دیں' یہاں تک کہ اس راہ میں ان کی دولت بھی خرچ ہو جائے اور ان کی جان بھی کام آ جائے' دوسرے وہ لوگ ہیں جن میں طبعًا مرد آزاری اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کا مادہ ہے۔ ان کی اخلاقی اور روحانی اصلاح اس میں ہے کہ وہ اپنے کو مجمع سے الگ رکھ کر خدا کی عبادت میں اپنا وقت صرف کریں تاکہ وہ گناہ کے بار اور لوگ ان کے آزار سے محفوظ رہیں۔

دوسرا موقع جس میں آنحضرت ﷺ نے عزلت نشینی کی اجازت دی' وہ ہے جب مجمع و آبادی یا قوم و ملک میں میں فتنہ و فساد کا بازار اس طرح گرم ہو کہ وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو تو ایسے موقع پر اس کے لئے پسندیدہ یہی ہے کہ وہ جماعت سے ہٹ کر گوشہ گیر ہو جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ "ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئے گا جس میں ایک مسلمان کی بہترین

دولت بکری ہوگی ۔جس کو لے کر وہ بارش کی جگہوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں کو تلاش کرے گا تا کہ وہ اپنی دین وایمان کو فتنوں سے بچا سکے (صحیح بخاری کتاب الادب العزلہ راحتہ من خلاط السور)

گوشہ گیری اور عزلت کے یہ دو موقع بھی درحقیقت نہایت صحیح اصول پر مبنی ہیں، پہلے موقع میں ایسے فرد کا جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدے کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہو الگ رہنا جماعت اور فرد دونوں کے لئے فائدہ مند ہے اور دوسرے موقع پر جب کہ جماعت کا نظام ابتر ہو گیا اور کوئی جو بجائے خود نیک اور سعید ہو لیکن اپنی کمزوری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اس کیلئے جماعت کے دائرہ اثر سے اپنے کو باہر رکھ کر ہی اپنی نیکی اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے۔ (صحیح بخاری کتاب الادب باب العزلہ راحتہ من خلاط السور)۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم::

اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوا ہو گا کہ اسلام میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں جو دوسرے مذہبوں میں پایا جاتا ہے۔عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار ہے اور اصلاح شریعت میں خدائے عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا اور اس کے احکام کو بجالانا ہے اسی لئے قرآن پاک میں عبادت کا مقابل اور بالضد لفظ استکبار اور غرور استعمال ہوا ہے۔

ان الذین یستکبرون عن عبادتی سید خلون جھنم داخرین (مومن:٦٠)

جو میری عبادت میں سے غرور کرتے ہیں وہ جہنم میں جائیں گے۔

فرشتوں کے متعلق فرمایا:

ومن عندہ لایستکبرون عن عبادتہت (انبیاء:٢٠)

جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے غرور نہیں کرتے۔

سعادت مند اور با ایمان مسلمانوں کے متعلق فرمایا:

انما یومن بایاتنا الذین اذا ذکروا بھا خروا سجدا و سجوا بحمد ربھم وھم لا یستکبرون۔ (سجدہ:۲)

میری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں جن کو ان آیتوں سے سمجھایا جائے تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پاکی بیان کرتے ہیں اور غرور نہیں کرتے۔

اس قسم کی اور آیتیں بھی قران پاک میں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور غرور و استکبار باہم مقابل کے متضاد معنی ہیں' اس بنا پر اگر غرور و استکبار کے معنی خدا کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا سمجھنا' اپنی ہستی کو بھی کوئی چیز جاننا اور خدا کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے تو عبادت کے معنی خدا کے آگے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کے سامنے اپنی گردن اطاعت کو خم کرنا ہے اس بنا پر صحیفہ محمدی کی زبان میں ''عبادت'' بندہ کا ہر ایک وہ کام ہے جس سے مقصود خدا کے سامنے اپنی بندگی کا ظہار اور اس کے احکام کی اطاعت ہو اگر کوئی انسان بظاہر کیسے ہی اچھے سے اچھے کام کرے لیکن اس سے اس کا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگا' اس سے ثابت ہوا کہ کسی اچھے کام کو عبادت میں داخل کرنے کے لئے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے اور یہی چیز عبادت اور غیر عبادت کے درمیان امر فارق ہے۔ قرآن پاک میں یہ سکتہ جا بجا ادا ہوا ہے۔

و سیجنبھا الاتقی الذی یوتی مالہ یتزکی وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزی الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلی۔ ولسوف یرضی۔ (لیل: ۱)

دوزخ سے وہ پرہیز گار بچالیا جائے گا جو اپنا مال دل کی پاکی
حاصل کرنے کو دیتا ہے۔ اس پر کسی کا احسان باقی نہیں جس کا
بدلہ اس کو دینا ہو بلکہ صرف خدائے برتر کی ذات اس کا مقصود
ہے، وہ خوش ہوگا۔

وما تنفقون الا ابتغاء وجه الله (بقره)

صرف خدا کی ذات کی طلب کے لئے جو تم خرچ کرو ہم تو
صرف خدا کے لئے تم کو کھلاتے ہیں۔

فویل للمصلین الذین هم عن صلوتهم ساهون
الذین هم یراء ون (ماعون: ۱)

پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں اور
جو دکھاوے کے لئے کام کرتے ہیں۔

قرآن کی ان آیتوں کی جامع و مانع تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان مختصر لیکن بلیغ فقروں میں فرمادی ہے کہ:

انما الاعمال بالنیات (صحیح بخاری و مسلم)

اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے۔

اسی کی تشریح آپ ﷺ نے ان لوگوں سے کی جو اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آرہے تھے۔

لکل امر مانوی فمن کان هجرته الی الله و رسوله
فاجره علی الله ومن کان هجرته الی دنیا یصیبها
او امراه ینکحها فهجرته الی ما هاجر الیه۔ (بخاری
باب اول)

ہر شخص کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی، اگر ہجرت سے

مقصود خدا اور رسول تک پہنچنا ہے تو اس کا ثواب خدا دے گا
اگر کسی دنیاوی غرض کے لئے ہے یا کسی عورت کے لئے تو
اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے جس کی نیت سے اس نے
ہجرت کی۔

اس تشریح سے یہ ثابت ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبادت کا جو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اس میں پہلی چیزوں کی نیت اور اخلاص ہے اس میں کسی خاص کام اور طرز وطریقہ کی تخصیص نہیں ہے بلکہ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود خدا کی خوشنودی اور اس کے احکام کی اطاعت ہے عبادت ہے اگر تم اپنی شہرت کے لئے کسی کو لاکھوں روپے دے ڈالو تو وہ عبادت نہیں لیکن خدا کی رضاجوئی اور اس کے حکم کی بجاآوری کے لئے چند کوڑیاں بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہے۔
تعلیم محمدی ﷺ کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو درحقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی اور عمل کے اخلاص کی غرض و غایت بنا دیا ہے اور یہی ''عبادت'' سے اسلام کا اصلی مقصود ہے۔

یاایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم و الذین من
قبلکم لعلکم تتقون۔ (بقرہ: ۳)
اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور
تم سے پہلوں کو پیدا کیا، تا کہ تم کو تقوی حاصل ہو۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ عبات کی غرض وغایت محض حصول تقوی ہے۔
تقوی انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت ہوتی ہے۔ آپ نے ایک دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ''تقوی کی جگہ یہ ہے'' (۱)۔ اور قرآن نے بھی ''تقوی القلوب'' (۲)۔ (دلوں کا تقوی) کہہ کر اسی نکتہ کو کھولا ہے۔ اسی کیفیت کا پیدا کرنا

اسلام میں عبادت کی اصلی غرض ہے' نماز' روزہ اور تمام عبادتیں سب اسی کے حصول کی خاطر ہیں' اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جن سے شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو سب عبادت ہیں۔

(۱)۔ مسلم کتاب البر والصلته باب تحریم ظلم المسلم۔ (۲)۔ (حج رکوع: ۳)

اسی مفہوم کو ہم دوسری عبادت میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چند ان مخصوص اعمال کا نام ہے جن کو انسان خدا کیلئے کرتا ہے۔ مثلاً نماز' دعا' قربانی لیکن محمد ؐ کی تعلیم قربانی لیکن محمد ؐ کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بیحد وسیع کر دیا' اس تعلیم کی رو سے ہر ایک وہ نیک کام جو خاص خدا کے لئے اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لئے ہو اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کیلئے کیا جائے' عبادت ہے۔ اسلام میں خدا کیلئے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام کے کرنے والے کا مقصود نمائش' دکھاوا' حصول شہرت یا دوسروں کو احسان مند بنانا' وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو بلکہ محض خدا کی محبت' خوشنودی اور رضامندی ہو۔

اس تشریح کی رو سے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذہب نے قائم کر رکھا تھا۔ محمد ﷺ کی تعلیم نے اس کو دفعتہ مٹا دیا' دین اور دنیا کی حیثیت اسلام میں دو حریف کی نہیں رہتی بلکہ دو دوست کی ہو جاتی ہے' دنیا کے وہ تمام کام جن کو دوسرے مذاہب دنیا کے کام کہتے ہیں' اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کئے جائیں لیکن ان کی غرض و غایت کوئی مادی خودغرضی و نمائش نہ ہو بلکہ خدا کی رضا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہیں' دین کے کام ہیں۔ اسی لئے دین اور دنیا کے کاموں میں کام کا تفرقہ نہیں بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے۔ تم نے اوپر پڑھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے فرمایا کہ تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو آرام دو' تمہاری آنکھ کا بھی

تم پر حق ہے کہ اس کو کچھ دیر سونے دو' تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اس کی تسلی کرو اور تمہارے مہمان کا بھی حق ہے (۳)۔ کہ اس کی خدمت کے لئے کچھ وقت نکالو' غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کی عبادت ہے' چنانچہ پاک روزی کھانا اور اس کا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہے۔

یایھا الذین امنوا کلوا من طیبات ما رزقنکم و اشکرو اللہ ان کنتم ایاہ تعبدون۔ بقرہ: ۱۲۱)

اے ایمان والو! ہم نے جو تم کو پاک اور ستھری چیزیں روزی کی ہیں' ان کو کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو' اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پاک روزی ڈھونڈنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت ہے' ایک اور آیت میں توکل یعنی کاموں کے لئے کوشش کر کے نتیجہ کو خدا کے سپرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے' فرمایا:

فاعبدہ و توکل علیہ (ہود: ۱۰)

اس کی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ رکھو۔

کسی شکستہ دل سے اس کی تسکین و تشفی کی بات کرنا اور کسی گنہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے۔ ارشاد ہے:

قول معروف و مغفرہ خیر من صدقہ یتبعھا اذی بقرہ: ۲۶۳)

اچھی بات کہنا اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو۔

اسی آیت پاک کی تشریح محمد ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

کل معروف صدقہ (بخاری۔ کتاب الادب)

ہر نیکی کا کام خیرات ہے۔

تبسمك فی وجه اخیك صدقه۔

تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی خیرات ہے۔

واسلطه الاذی عن الطریق صدقه۔

راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی خیرات ہے۔

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الادب حق الضیف۔

غریب اور بیوہ کی مدد بھی عبادت بلکہ بہت سی عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔ فرمایا:

الساعی علی الارملته و المسکین کالمجاهد فی سبیل الله و کالذی یصوم النهار و یقوم اللیل۔

(بخاری۔ کتاب الادب)

بیوہ اور غریب کیلئے کوشش کرنے والے کا مرتبہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ اور رات بھر نماز پڑھتا ہے۔

باہم لوگوں کے درمیان سے بغض و فساد کے اسباب کو دور کرنا اور محبت پھیلانا ایسی عبادت ہے جس کا درجہ نماز، روزہ، اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر ہے۔ آپ ﷺ نے ایک دن صحابہؓ سے فرمایا:

الا اخبرکم بافضل من درجته الصیام و الصلوه و الصدقه۔

کیا میں تم کو روزہ، نماز، اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر درجہ کی چیز بتاؤں؟

صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! ارشاد فرمائیے۔ فرمایا:

اصلاح ذات البین (۱)۔

وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہے۔

حضرت سلمان فارسیؓ ایک دوسرے صحابی حضرت ابو ذرؓ سے ملنے گئے تو دیکھا کہ ان کی بیوی نہایت معمولی اور میلے کپڑے پہنے ہیں۔ حضرت سلمانؓ نے وجہ دریافت کی تو بولیں کہ ''تمہارے بھائی کو دنیا کی خواہش نہیں ہے''۔ اس کے بعد مہمان کے لئے کھانا آیا تو ابو ذرؓ نے کہا میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمانؓ نے کہا میں تمہارے بغیر نہیں کھاؤں گا۔ آخر انہوں نے افطار کیا' رات ہوئی تو ابو ذرؓ نماز کو کھڑے ہونے لگے۔ حضرت سلمانؓ نے کہا ابھی سو رہو' پچھلی پہر کو حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا اور کہا اب نماز پڑھو' چنانچہ دونوں نے تہجد کی نماز ادا کی' پھر حضرت سلمانؓ نے ان سے کہا ''اے ابو ذرؓ! تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے' تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے تو جس جس کا حق تم پر ہے سب کو ادا کرو'' حضرت ابو ذرؓ نے حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں آ کر حضرت سلمانؓ کی یہ تقریر نقل کی' آپ ﷺ نے فرمایا کہ سلمانؓ نے سچ کہا ہے (۲)۔

لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ ''یا رسول اللہ! تمام کاموں میں سب سے بہتر کون سا کام ہے' فرمایا ''خدا پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا'' لوگوں نے پوچھا ''کس غلام کے آزاد کرنے میں زیادہ ثواب ہے'' ارشاد ہوا کہ ''جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اپنے مالک کو زیادہ پسند ہو'' انہوں نے کہا اگر یہ کام ہم سے نہ ہو سکے تو' فرمایا ''پھر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مدد کرو یا جس سے کوئی کام بن نہ آتا ہو اس کا کام کر دو'' پھر سوال ہوا اگر یہ بھی نہ ہو سکے فرمایا ''تو پھر یہ کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو' یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو تم خود اپنے اوپر کر سکتے ہو'' (۳)۔

---

(۱)۔ سنن ابو داؤد جلد دوم کتاب الادب باب اصلاہ ذات البین' ص ۱۹۲۔ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب صنع الطعام و التکلف للضیف' ص ۹۰۶۔ (۳)۔ ادب المفرد امام بخاری باب

ایک دفعہ آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا خدا اپنے بندوں سے کہے گا کہ ''میں نے تم سے کھانا مانگا تم نے نہ کھلایا'' وہ عرض کریں گے کہ ''خداوند! تو نے کیسے کھانا مانگا تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے'' فرمائے گا ''کیا تم کو معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندہ نے تم سے کھانا مانگا' تم نے کھانا اس کو نہ کھلایا' اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے'' اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تم نے مجھے پانی نہ پلایا' وہ کہے گا کہ ''اے پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاؤں' تو تو خود تمام جہاں کا پروردگار ہے' وہ فرمائے گا ''تم کو معلوم نہ تھا کہ میرے فلاں بندہ نے پیاس میں تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو پانی نہ پلایا' اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا'' اے ابن آدم' میں بیمار ہوا تو میرے بیمار پرسی نہ کی'' وہ کہے گا کہ ''اے پروردگار! میں کیونکر تیری بیمار پرسی کروں تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے'' فرمائے گا ''تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاح بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہ کی۔ اگر کرتا تو تو اس کو میرے پاس پاتا مجھے اس کے پاس پاتا''۔(۱)۔

اس مموثر طریقہ ادا نے خدا شناسی اور خدا آگاہی کے کتنے تو برتو پردے چاک کر دیئے اور دکھایا کہ خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے کیا کیا طریقے ہیں۔ حضرت سعدؓ جو چاہتے تھے اپنی کل دولت خدا کی راہ میں دے دیں' آپ ﷺ نے انہیں بتایا کہ ''اے سعد! جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں دو اس کا بھی ثواب ہے(۲)''۔ ابو مسعود انصاریؓ سے ارشاد فرمایا ''مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے(۳)''۔ غریب و نادار صحابہؓ نے دربار رسالت میں ایک دن شکایت کی کہ یا رسول اللہ! دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے' ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں وہ بھی روزے رکھتے ہیں' ان کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی بجالاتے ہیں جو ہم نہیں بجالا سکتے' فرمایا کیا تم کو اللہ نے وہ

دولت نہیں دی ہے جس کو صدقہ کرسکو' تمہارا سبحان اللہ اور حمد اللہ کہنا بھی صدقہ ہے۔ یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے۔ لوگوں نے کہا ''یارسول اللہ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لئے کرتا ہے''۔ فرمایا کہ ''اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا ہے تو کیا اس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اس کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملے گا (۴)''۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ حسن عمل' ثواب اور عبادت کے مفہوم میں اسلام نے کتنی وسعت پیدا کی ہے اور کتنی تو برتو انسانی غلطیوں کا ازالہ کیا ہے' اس تشریح کے بعد روشن ہو جائے گا کہ وحی محمدی ﷺ نے بالکل صحیح طور پر خلقت انسانی کی غرض و غایت' عبادت الٰہی قرار دی ہے۔

وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون۔ (ذاریات: ۳)

میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اس آیت پاک میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہے جن کے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار' اس کی اطاعت اور اس کی خوشنودی کی طلب ہو' اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں جن کے بحسن وخوبی انجام دینے کیلئے اس کی خلقت ہوئی ہے۔ یہ روحانیت کا وہ راز ہے جو صرف محمد ؐ کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا۔

---

(۱)۔ ایضاً باب عیادت المرضی۔ (۲)۔ ادب المفرد باب یوجر فی کل شی۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب کتاب النفقات۔ (٤)۔ ادب المفرد بخاری باب کل معروف صدقہ۔

عام طور سے مشہور ہے کہ شریعت میں چار عبادتیں فرض ہیں جو نماز' روزہ' زکوٰہت

اور حج ہیں۔ اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے۔ درحقیقت یہ چاروں فریضے عبادت کے سینکڑوں وسیع معنوں اور ان کے جزئیات کے بے پایاں دفتر کو چار مختلف بابوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک فریضہ عبادت اپنے افراد اور جزئیات پر مشتمل اور ان سب کے بیان کا مختصر عنوان باب ہے جس طرح کسی وسیع مضمون کو کسی ایک مختصر سے لفظ یا فقروں میں ادا کر کے اس وسیع مضمون کے سر پر لکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ چاروں فرائض درحقیقت انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو چار مختلف عنوانوں میں الگ الگ تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان چاروں فرضوں کو بجا طور سے انسان کی اچھے اعمال اور کاموں کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہیں۔

(۱) بندوں کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جن کا تعلق تنہا خالق اور مخلوق سے ہے ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان نماز ہے۔

(۲) وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لئے کرتا ہے صدقہ اور زکوٰۃ ہے۔

(۳) خدا کی راہ میں ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنا، کسی اچھے مقصد کے حصول کے لئے تکلیف اور مشقت جھیلنا اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشوں کی نجاست اور آلودگی سے پاک رکھنا جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ میں حائل ہوتی ہیں روزہ ہے یا یوں کہو کہ ایثار و قربانی کے تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے۔

(۴) دنیائے اسلام میں ملت ابراہیمی کی برادری اور اخوت کی مجسم تشکیل و تنظیم، مرکزی رشتۂ اتحاد کا قیام اور اس مرکزی آبادی اور کسب روزی کے لئے ذاتی کوشش اور محنت کے باب کا سرعنوان حج ہے۔

غور کر کے دیکھو انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کام انہیں اصول چہارگانہ کے تحت میں داخل ہیں۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اسلام کی بنیاد

پانچ ستونوں پر قائم ہے۔توحید و رسالت کا اقرار کرنا' نماز پڑھنا' روزہ رکھنا' زکوٰۃ دینا اور حج کرنا (۱)۔''۔ پہلی چیز میں عقائد کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے اور بقیہ چار چیزیں ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو محیط ہیں' انہی ستونوں پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے۔

اس تقریر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ یہ چاروں فرض عبادتیں نماز' زکوٰۃ' روزہ اور حج اصل مطلوب بالذات نہیں ہیں بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چاروں عبادتیں اپنے جزئیات باب اور محتویات کے ساتھ فرض ہیں۔ جو شخص صرف ان چاروں فرائض کو جو عنوان باب میں ادا کرتا ہے اور اس باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلو تہی کرتا ہے اس کی عبادت ناقص اور اس کی اطاعت نامکمل ہے اور اس کے لئے دین کی وہ فلاح و کامیابی جس کا خدائے تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے مشکوک ہے' یہیں سے یہ شبہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازیں ہم کو برائیوں سے کیوں باز نہیں رکھتیں' ہمارے روزے ہم کو تقویٰ کی دولت کیوں نہیں بخشتے' ہماری زکوٰۃ ہمارے دلوں کو پاک و صاف

(۱)۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم کتاب الایمان۔ (۲)۔ سیرہ ابن ہشام وفد قریش عند النبی ﷺ ج ۱' ص ۲۵۲۔ مطبع محمد علی مصر' کلمته واحده یعطونیها تملکون بها العرب و تدین بها البحر۔

کیوں نہیں کرتی۔ ہمارا حج ہمارے گناہوں کی مغفرت کا باعث کیوں نہیں بنتا اور قرون اول کی طرح ہماری نمازیں ملکوں کو فتح و ار ہماری زکوٰتیں ہماری قومی افلاس کو دور کیوں نہیں کرتیں اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موعودہ برکات کا انبار کیوں نہیں لگ جاتا لیکن خدا کا وعدہ یہ ہے:

وعد الله الذين امنوا و عملوا الصلحت ليستخلفنهم في الارض۔ (نور: ۷)

اللہ نے ان سے جو ایمان رکھتے ہیں اور تمام نیک کام کرتے ہیں یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا۔

ایمان کامل اور اعمال نیک کے بغیر اس وعدہ کی ایفاء کی توقع رکھنا حماقت ہے۔

اسی طرح ان چاروں جلی عنوانات کے احکام سے قطع نظر کر کے صرف مندرجہ تحت جزئیات کی تعمیل ممکن ہے کہ دنیائے فانی کی بادشاہی کا اہل بنا دے مگر آسمان کی بادشاہت میں اس کو کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اور اسلام اس لئے آیا ہے کہ اپنے پیروؤں کے پاؤں کے نیچے دونوں جہانوں کی بادشاہیاں رکھ دے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کے ساتھ سمجھا جائے جو اسلام کے منشا ہے اور اسی وسعت کے ساتھ اس کو ادا کیا جائے جو اسلام کا مطالبہ ہے۔

All rights reserved. ©2002-2006

نماز

اقیموا الصلوہت

اسلام کی عبادت کا پہلا رکن ہے جو امیر و غریب، بوڑھے جوان، عورت مرد، بیمار و تن درست، سب پر یکساں فرض ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی۔ اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہیں ادا کر سکتے تو بیٹھ کر ادا کرو۔ اگر اس کی بھی قدرت نہیں تو لیٹ کر کر سکتے ہو۔ اگر منہ سے نہیں بول سکتے تو اشارہ سے ادا کرو (۱)۔۔ اگر رک کر نہیں پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو (۲)۔۔ اگر سواری پر ہو تو جس طرف وہ چلے اسی رخ پڑھو (۳)۔۔

نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ پاؤں سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار اس رحمٰن و رحیم کی یاد اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسن ازل کی حمد و ثنا اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار، یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرض نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے، یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے، یہ بے قرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے، یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس اور اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے۔

کسی غیر مرئی طاقت کے آگے سرنگوں ہونا اور اس کے حضور میں دعا و فریاد کرنا اور اس سے مشکلوں میں تسلی پانا انسان کی فطرت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں کوئی ساز ہے جو نامعلوم انگلیوں کے چھونے سے بجتا رہتا ہے۔ یہی الست بربکم کا فطری جواب ہے۔ قرآن نے جا بجا انسانوں کی فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مصیبتیں آتی ہیں، جب سمندر میں طوفان اٹھتا

ہے اور تمہارا جہاز بھنور میں پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو۔ غرض انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے جس کے سامنے وہ جھکے' اندرون دل کی عرض و نیاز کرے اور اپنی دلی تمناؤں کو اس کے سامنے پیش کرے' غرض عبادت روح کے اس فطری مطالبہ کا جواب ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوش جنوں کا علاج ممکن نہیں' وحشی سے وحشی مذہب میں بھی عبادت کے کچھ رسوم اس ندائے فطری کی تسلی کے لئے موجود ہیں' پھر آسمانی مذاہب اس سے کیونکر خالی ہو سکتے ہیں۔

(۱)۔ نیل الاوطار' ج ۲' ص ۲۸ بروایت موقوف از دارقطنی۔ (۲)۔ ابوداؤد باب صلوۃ الطالب۔ (۳)۔ کتاب الصلوہ باب جواز صلوہ النافلتہ علی الدابتہ فی السفر حیث توجہت۔

چنانچہ دنیا کے ہر آسمانی مذہب میں خدا کی یاد کا حکم اور اس کے کچھ مراسم موجود ہیں' اسلام میں اگر حمد و تسبیح ہے تو یہودیوں میں مزمور' عیسائیوں میں دعا' پارسیوں میں زمزمہ اور ہندوؤں میں بھجن ہیں اور دن رات میں اس فریضہ کے ادا کرنے کیلئے ہر ایک میں بعض اوقات کا تعین بھی ہے۔ اس بنا پر یہ یقین کرنا چاہئے کہ نماز مذہب کے ان اصولوں میں سے ہے جن پر تمام دنیا کے مذہب متفق ہیں۔ قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو اور اس کی تاکید نہ کی ہو۔ خصوصاً ملت ابراہیمی میں اس کی حیثیت (۱)۔ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جب اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ کی ویران سرزمین میں آباد کرتے ہیں تو اس کی غرض یہ بتاتے ہیں کہ ربنا لیقیمو الصلوہ (ابراہیم: ۶) ''اے ہمارے پروردگار تاکہ وہ نماز کھڑی کریں'' حضرت ابراہیمؑ اپنے اور اپنی نسل کے لئے دعا کرتے ہیں کہ رب جعلنی مقیم الصلوہ من ذریتی۔ ''اے میرے پروردگار! مجھ کو اور میری نسل میں سے لوگوں کو نماز کھڑی کرنے والا بنا''۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسبت قرآن پاک کی شہادت ہے وکان یا

مراھلہ بالصلوٰہ (مریم: ۴) اور وہ اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم دیتے ہیں۔ حضرت شعیبؑ کو ان کے ہم قوم طعنہ دیتے ہیں اصلوتک تامرک ان نترک مایعبد اباءنا ہود : ۸) کیا تمہاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جس کو پوجتے آئے ہیں اس کو چھوڑ دیں، حضرت لوطؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور ان کی نسل کے پیغمبروں کے متعلق قرآن کا بیان ہے داوحینا الیھم فعل الخیرات و اقام الصلوٰہ (انبیاء:۵) اور ہم نے ان نیک کاموں کے کرنے اور نماز کھڑی کرنے کی وحی کی، حضرت لقمانؑ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں یابنی اقم الصلوٰہ لذکری (طٰہٰ :۱) اے میرے بیٹے! نماز کھڑی کر۔ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے واقیمو الصلوٰہ (یونس: ۹) اور نماز کھڑی کیا کرو، بنی اسرائیل سے وعدہ تھا انی معکم لئن اقمتم الصلوٰہ (مائدہ: ۳) میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کھڑی کیا کرو۔ حضرت زکریاؑ کی نسبت ہے وھو قائم یصلی فی المحراب (آل عمران: ۴) وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت عیسیٰ کہتے ہیں وادمانی بالصلوٰہ (مریم: ۲) اور خدا نے مجھ کو نماز کا حکم دیا ہے۔

آیات بالا کے علاوہ قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب میں بعض یہود اور عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے۔

من اھل الکتاب امۃ قائمۃ یتلون ایات اللہ اناء اللیل و ھم یسجدون (آل عمران: ۱۲)

اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راتوں کو کھڑے ہو کر خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔

---

(۱)۔ قرآن کی تائید تورات اور زبور سے بھی ہوتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ یہودیوں کے پرانے صحیفوں میں نماز کیلئے اصطلاحی لفظ "خدا کا نام لینا" تھا" چنانچہ تورات اور زبور میں نماز کا ذکر اسی نام سے آیا ہے، حضرت ابراھیم نے بیت ایل (ایب اللہ) کے پاس ایک قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا (پیدائش ۱۲۔۴) حضرت

اسحٰق نے خدا کا نام لیا (پیدائش ۲۶۔۲۵) حضرت داؤد نے خدا کا نام لیا (زبور ۱۱۷۔۱۱۶) اور یہ اصطلاح قرآن میں بھی مستعمل ہوئی ہے وذکر اسم ربہ فصلی (الاعلیٰ) اور اپنے رب کا نام لیا' پس نماز پڑھی' اس معنی کی اور بھی آیتیں قرآن پاک میں مذکور ہیں' یہودیوں کے پچھلے صحیفوں مثلاً سفر دانیال وغیرہ اور عیسائیوں کے تمام صحیفوں میں نماز کیلئے "دعا" کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عربی لفظ "صلوٰہ" کے ہم معنی ہے اسی لئے انجیل کے اردو مترجموں نے اس کا ترجمہ نماز کیا ہے (متی ۱۷۔۲۱) اور (متی ۲۳۔۱۴)

حدیث میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کی تذکرے ہیں۔مثلاً آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جب نماز پڑھو تو تہ بند باندھ لو یا چادر اوڑھ لو' یہودیوں کی طرح '' ننگے) نہ پڑھو'' (ص ۷۲) تم یہودیوں کی طرح صرف اوپر سے نماز میں چادر مت ڈال لو بلکہ اس کو باندھ لیا کرو''۔(ص ۷۳) نماز میں یہودیوں کی طرح مت جھومو'' (ص ۱۱۲) تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں موزے اور جوتے پہنے رہو'' (ص ۱۱۴) میری امت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہے گا جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں گے'' (ص ۸۴) ان حوالوں (۱)۔ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ میں کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز ادا کرتے تھے۔

عرب میں جو لوگ اپنے کو دین ابراہیمی کے پیرو کہتے تھے ان میں بعض تو ایسے تھے کہ وہ کسی خاص طریقہ عبادت سے واقف نہ تھے۔چنانچہ زید بن عمرو کا واقعہ گزر چکا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ ''اے خدا مجھے معلوم نہیں کہ میں تجھ کو کیسے پوجوں''۔یہ کہہ کر ہتھیلی اٹھاتے تھے اور اسی پر سجدہ کر لیتے تھے (۲)۔لیکن ایک دو ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی صورت میں نماز پڑھتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاریؓ آنحضرت ﷺ کی ملاقات اور اپنے اسلام لانے کے تین برس پہلے سے رات کو نماز

پڑھ لیتے تھے۔کسی نے ان سے پوچھا کہ اس وقت آپ کس رخ نماز پڑھتے تھے؟ کہنے لگے جدھر رخ کر(۳)۔لیا۔عرب کا ایک جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے(۴)۔

وادرکن اعجازا من اللیل بعد ما
اقام الصلوہ العابد المتحنف

(اور ان سواریوں نے رات کے پچھلے حصہ کو پا لیا اس وقت
کے بعد جب کہ عبادت گزار حنفی نماز پڑھ چکا تھا)

اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں مذہب حنفی کے پیرو پچھلی رات میں نماز ادا کرتے تھے۔

یہود کی بڑی جماعت نے نماز کو بھلا دیا تھا اور ان کی نماز صرف چند رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی اور نماز سے زیادہ انہوں نے قربانی اور نذرانوں پر زور دیا تھا جن میں خلوص اور خدا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا۔عیسائیوں نے خدا کی نماز کے ساتھ ساتھ انسانوں کی نمازیں بھی شروع کر دی تھیں۔وہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کے علاوہ اور بھی سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی عبادت میں مصروف ہو گئے تھے۔(۵)۔

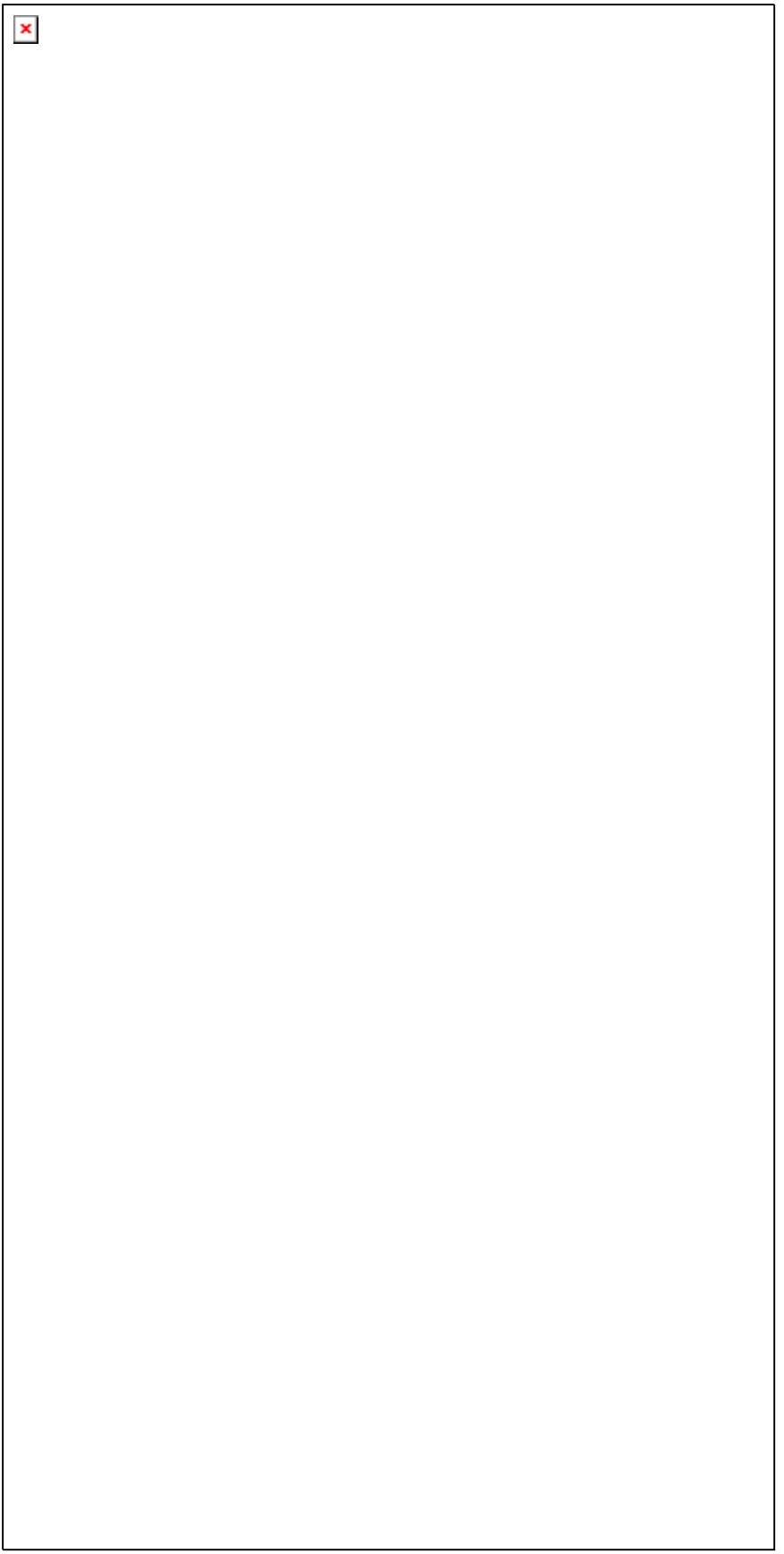
دین ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کر لیتے تھے۔ الغرض آپؐ کی بعثت سے پہلے نماز کی خالص اور مواحدانہ حقیقت دنیا سے عموماً گم ہو چکی تھی، اس کی شکل وصورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ آج بھی ان کے صحیفوں میں اس کی اصل شکل نظر نہیں آتی، نہ اس کے ارکان کا پتہ لگتا ہے، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الہامی صحیفوں کے حامل اور امانتدار اس فرض کو کس طرح ادا کرتے تھے۔کن موثر دعاؤں کو پڑھتے تھے اور اس کی ادائیگی کے کیا اوقات تھے۔جو کچھ ان میں رہ گیا تھا وہ صرف عملی رسم و رواج اور بعد کے مذہبی مقتداؤں کی کچھ تجویزیں، جن پر مذہبی فریضہ سمجھ کر عمل کیا جا رہا تھا، سجدہ جو نماز کی روح اور نیاز الٰہی کی انتہائی منزل

ہے اس کو یہود و نصاری دونوں نے مشکل اور باعث تکلیف سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور اس طرح نماز کی ظاہری شکل وصورت بھی انہوں نے بگاڑ دی تھی۔ قرآن مجید میں ان کی اس صورتحال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

(۱)۔ کنز العمال جلد چہارم طبع حیدر آباد کے مختلف ابواب سے یہ حدیثیں نقل کی گئی ہیں اور متن میں اس جلد کے صرف صفحات لکھ دیئے گئے ہیں۔ (۲)۔ ابن ہشام ذکر زید بن عمرو بن نفیل۔ (۳)۔ صحیح مسلم فضائل ابی ذر۔ (٤)۔ لسان العرب لفظ حنف۔ (٥)۔ دیکھو انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا طبع یازدھم لفظ عبارت (درشپ) ۱۲۔

فخلف من بعدهم خلف ورثوا الكتب يأخذون عرض هذا الادنى و يقولون سيغفرلنا و ان ياتهم عرض مثله يأخذوه الم يوخذ عليهم ميثاق الكتب ان لا يقولوا على الله الا الحق و درسوا ما فيه و الدارالاخره خير للذين يتقون افلاتعقلون۔ و الذين يمسكون بالكتب و اقاموا الصلوه انا لا نضيع اجر المصلحين۔ (اعراف: ۲۱)

ان کے بعد انکے وہ جانشین ہوئے جن کو کتاب باپ دادوں سے وراثت میں ملی۔ وہ صرف دنیاوی زندگی کا فائدہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف کر دیا جائے گا اور اگر ایسا ہی فائدہ اب بھی انکے سامنے آئے تو لے لیں (اور مذہب کی پرواہ نہ کریں) کیا ان سے کتاب کا معاہدہ نہیں لیا گیا کہ وہ خدا کے متعلق سچ کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے اور ان لوگوں نے جو کچھ اس (کتاب) میں ہے اس کو پڑھا اور آخرت کا گھر ان لوگوں کیلئے ہے جو پرہیز گار ہیں کیا تم نہیں سمجھتے اور وہ



کے فقرے ملا دیتے تھے۔ مواحدانہ خضوع و خشوع کا ان کی دعاؤں میں شائبہ تک نہ تھا۔ مسلمانوں کو جب کبھی نماز پڑھتے دیکھ لیتے تو ان کا منہ چڑھاتے تھے، دق کرتے تھے، دھکیل دیتے تھے، شور کرتے تھے، سیٹی اور تالی بجاتے تھے چنانچہ ان کے متعلق قرآن نے کہا ہے:

وما کان صلوتھم عند البیت الا مکاء و تصدیہ۔

(انفال: ۴)

اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹی اور تالی بجانا ہے۔

اگلے مفسروں نے اس آیت پاک کے دو مطلب لئے ہیں۔ ایک یہ کہ واقعاً وہ جو نماز پڑھتے تھے اس میں سیٹی اور تالی بجایا کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ جب مسلمان نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجا کر ان کی نماز خراب کرنا چاہتے تھے اور گویا یہی ان کی نماز تھی (۱)۔ پہلے معنی کی بنا پر ان کی نماز محض ایک قسم کا کھیل کود اور لعو لعب تھا اور دوسرے معنی کی رو سے سرے سے ان کے ہاں نماز ہی نہ تھی بلکہ دوسروں کو نماز سے روکنا یہی ان کی نماز تھی۔

ایک اور آیت میں ہے:

اریت الذی ینہی عبد اذا صلی (علق: ۱)

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔

ایک بندہ سے مراد خود آنحضرت ﷺ کی ذات ہے، آپؐ جب صحن حرم میں نماز پڑھتے تو قریش جو بے فکری کے ساتھ ادھر ادھر بیٹھے رہتے کبھی آپؐ کی ہنسی اڑاتے اور کبھی دق (۲) کرتے، کبھی آپ کی گردن میں پھندا ڈال (۱) دیتے اور کبھی جب آپؐ سجدہ میں جاتے تو پشت مبارک پر نجاست لا کر ڈال دیتے تھے اور جب آنحضرت ﷺ کو اس بار نجاست سے اٹھنے میں تکلیف ہوتی تو ہنستے اور

قہقہہ لگاتے تھے (۱)۔۔اسی لئے آنحضرت ﷺ اسلام کے آغاز میں تو اخفاء کے خیال سے اور اس کے بعد ان کے ان حرکات کی وجہ سے عموماً رات کو اور دن کو کسی غار یا درہ میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے اور مسلمان بھی عموماً ادھر ادھر چھپ کر ہی نماز پڑھتے تھے یا پھر رات کے سناٹے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے۔مشرکین اگر کبھی اس حالت میں ان کو دیکھ پاتے تو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ابن اسحاق میں ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو گھاٹیوں میں چھپ کر نماز پڑھتے تھے۔ایک دفعہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص چند مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کی ایک جماعت آ گئی' اس نے اس نماز کو بدعت (نیا کام) سمجھا اور مسلمانوں کو برا بھلا کہا اور ان سے لڑنے پر آمادہ ہوگئی (۵)۔۔

الغرض جب محمد ﷺ نے انسانوں کو خدا کے آگے سربسجود ہونے کی دعوت دی تو اس وقت تین قسم کے لوگ تھے۔ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بیگانہ تھے۔ان کی نمازیں بالعموم اخلاص واثر' سکون دلی جمعی' خشوع وخضوع اور خوف وخشیت سے بالکل خالی تھیں' دوسرے وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کے ساتھ انسانوں کو بھی اپنے سجدہ کے قابل سمجھتے تھے اور ان کی عبادتیں کرتے تھے۔وہ چیز جو توحید کا آئینہ تھی' ان کے ہاں شرک کا مظہر بن گئی تھی۔تیسرے وہ (یعنی عرب بت پرست) جنہوں نے نہ کبھی خدا کا نام لیا اور نہ کبھی خدا کے آگے سر جھکایا وہ اس روحانی لذت سے آشنا ہی نہ تھے۔

---

(۱)۔ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور۔(۲)۔ایضاً۔(۳)۔صحیح بخاری کتاب المناقب فضائل ابوبکرؓ۔(٤)۔صحیح بخاری کتاب الصلوٰہ باب المراہ تطرح عن المصلی شیا من الاذی۔(۵)۔سیرہ ابن ہشام (ابتداء مافرض اللہ سبحانہ من الصلوٰہ)

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم::

آنحضرت ﷺ جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو

آپ ﷺ کو ملا وہ نماز کا تھا یا یھا المدثر قم فانذر وربک فکبر (مدثر: ۱) ''اے لحاف میں لپٹے ہوئے اٹھ اور ہوشیار کر اور اپنے رب کی بڑائی بول''۔ رب کی بڑائی بولنا یہی نماز کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل کے مدراج طے کرتی ہوئی اس لفظ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے۔ آپ نے سونے والوں کو جگایا' بھولے ہوؤں کو بتایا' انجانوں کو سکھایا اور خدا اور بندے کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا' گوشت پوست کے' سونے چاندی کے اور اینٹ اور پتھر کے ان بتوں کو جو خدا کی جگہ کھڑے تھے۔ دھکیل کر نیچے گرا دیا' صرف ایک خدا کی نماز دنیا میں باقی رکھی اور خدا کے سوا ہر ایک کے سجدہ کو حرام قرار کر دیا۔ اس طرح آپ کی تعلیم کے ذریعہ سے نماز کی اصل حقیقت دنیا میں ظاہر ہوئی۔ آپ ﷺ نے اہل عرب اور دنیا کی بت پرست قوموں کو نماز کا طریقہ بتایا' اس کے ارکان و آداب سکھائے' مموثر دعائیں تعلیم کیں' عیسائیوں کو مخلصانہ عبادت اور ایک خدا کی پرستش کا حکم دیا۔ یہودیوں کو نماز کے خضوع وخشوع' راز و نیاز اور اخلاص و اثر سے باخبر کیا اور انبیائے عالم کی نماز کو اپنے عمل کے ذریعہ سے شکل وصورت اور روح وحقیقت دونوں کے ساتھ نا قابل تحریف اور غیر متغیر وجود بخش دیا' حکم ہوتا ہے کہ:

حافظو اعلی الصلوات۔ (بقرہ: ۲۳۱)

نمازوں کی نگہداشت کرو۔

یہ نماز کی ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے نگہداشت کا حکم ہے اور مسلمان کی پہچان یہ مقرر ہوئی کہ:

وھم علی صلوتھم یحافظون۔ (الانعام: ۹۲)

اور وہ اپنی نمازوں کی نگہداشت کرتے ہیں۔

الذین ھم علی صلاتھم دائمون (معارج: ۲۳)

جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

والذین ھم علی صلوتھم یحافظون (مومنون: ۱)

اور (کامیاب ہیں) وہ جو اپنی نمازوں کی نگہداشت کرتے ہیں۔

خود آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ خود بھی نماز پڑھو اور اپنے اہل وعیال کو بھی اس کا حکم دو اور اس نماز پر جس کا مکہ کے قیام کے زمانہ میں ادا کرنا بہت مشکل ہے، پوری پابندی اور مضبوطی کے ساتھ جمے رہو، فرمایا:

وامر اھلك بالصلوہ و اصطبر علیھا (طہ: ۸)

اور اپنی گھر والوں پر نماز کی تاکید رکھو اور خود بھی اس کے اوپر جمے (پابند) رہو۔

نماز کیسی ہونی چاہئے؟ فرمایا:

وقوموا للہ قانتین (بقرہ: ۲۱)

اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے رہو۔

تعریف کی گئی ہے کہ:

الذین ھم فی صلوتھم خاشعون (مومنون: ۱)

(کامیاب ہیں وہ مومن) جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔

حکم ہوا کہ:

ادعوا ربکم تضرعا و خفیہ۔ (اعراف: ۷)

تم اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو۔

وادعوہ خوفا و طمعا۔ (اعراف: ۷)

اور اس (خدا) کو ڈر اور امید کے ساتھ پکارو۔

واادعوہ مخلصین لہ الذین۔ (اعراف: ۷)

اور خدا کو پکارو، اس حال میں کہ تم دین کو اسی کے لئے خالص

کرنے والے ہو۔

اس اجمال کے بعد نماز کے تمام مباحث پر ایک تفصیلی نگاہ کی ضرورت ہے۔

اسلام میں نماز کا مرتبہ::

اسلام سے پہلے بھی دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں آیا جس میں نماز کو اہمیت نہ دی گئی ہو لیکن چونکہ وہ مذہب خاص خاص قوموں اور وقتوں تک محدود تھے اس لئے ان کے اندر سے عموماً اس کی اہمیت جاتی رہی چنانچہ اسلام سے پہلے دنیا کے کسی مذہب میں آج نماز یعنی خدا کے سامنے اقرار عبودیت اور اس کی حمد و ثنا کو واضح، معین اور تاکید حیثیت حاصل نہیں، یعنی کسی مذہب کے پیروؤں بلکہ ملہموں کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایاں نہیں ہوتی، ورنہ جیسا کہ گزر چکا قرآن کے رو سے تو دنیا میں کوئی ایسا پیغمبر نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور اس نے اپنی امت کو اس کی تاکید نہ کی ہو، مگر موجودہ حیثیت یہ ہے کہ اسلام کے سوا وہ کہیں نمایاں، واضح اور موکد صورت میں باقی نہیں رہی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ محمد ﷺ خاتم الانبیاء اور قرآن پاک خاتم الکتب ہو کر آیا ہے اس لئے اس فریضہ الٰہی کو دین کامل میں ایسی منظم، واضح، موکد اور نمایاں صورت دی گئی ہے کہ وہ قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے۔

یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جب تک اس میں کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے کسی حالت میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا، قرآن پاک میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی ہے۔ اس کے ادا کرنے میں سستی اور کاہلی نفاق کی علامت (۱)۔ اور اس کا ترک کفر کی نشانی (۲)۔ بتائی گئی ہے۔ یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ ساتھ پیدا ہوا اور اس کی تکمیل اس شبستان قدس میں ہوئی جس کو معراج (۳)۔ کہتے ہیں۔

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اس کے لوازم ہیں اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے۔ چنانچہ سورہ روم (رکوع: ۴) میں پہلا حکم دیا گیا کہ فاقم وجھک للدین حنیفا۔

فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا۔ (اپنا منہ ہر طرف سے پھیر کر دین توحید پر سیدھا رکھ وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے) اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملحق یہ ہے:

واقیمو الصلوہ ولا تکونوا من المشرکین۔ (روم: ۳۱)

اور نماز کو کھڑا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

(۱)۔ منافقین کی صفت میں ہے واذا قاموا الی الصلوہ قاموا کسالی (نساء: ۱۴۲) "جب وہ نماز کو اٹھتے ہیں تو سست و کاہل ہو کر اٹھتے ہیں" فویل للمصلین الذین ھم عن صلوتھم ساھون۔ (ماعون: ۴) "افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں"۔ (۲)۔ کفار کے بارے میں ہے لم نک من المصلین۔ (مدثر: ۴۳) "ہم غازیوں میں نہ تھے" یہ وہ اس وقت کہیں گے جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ہو؟ (۳)۔ کتب صحاح واقعات معراج و اسراء صحیح بکرای کتاب الصلوہ۔

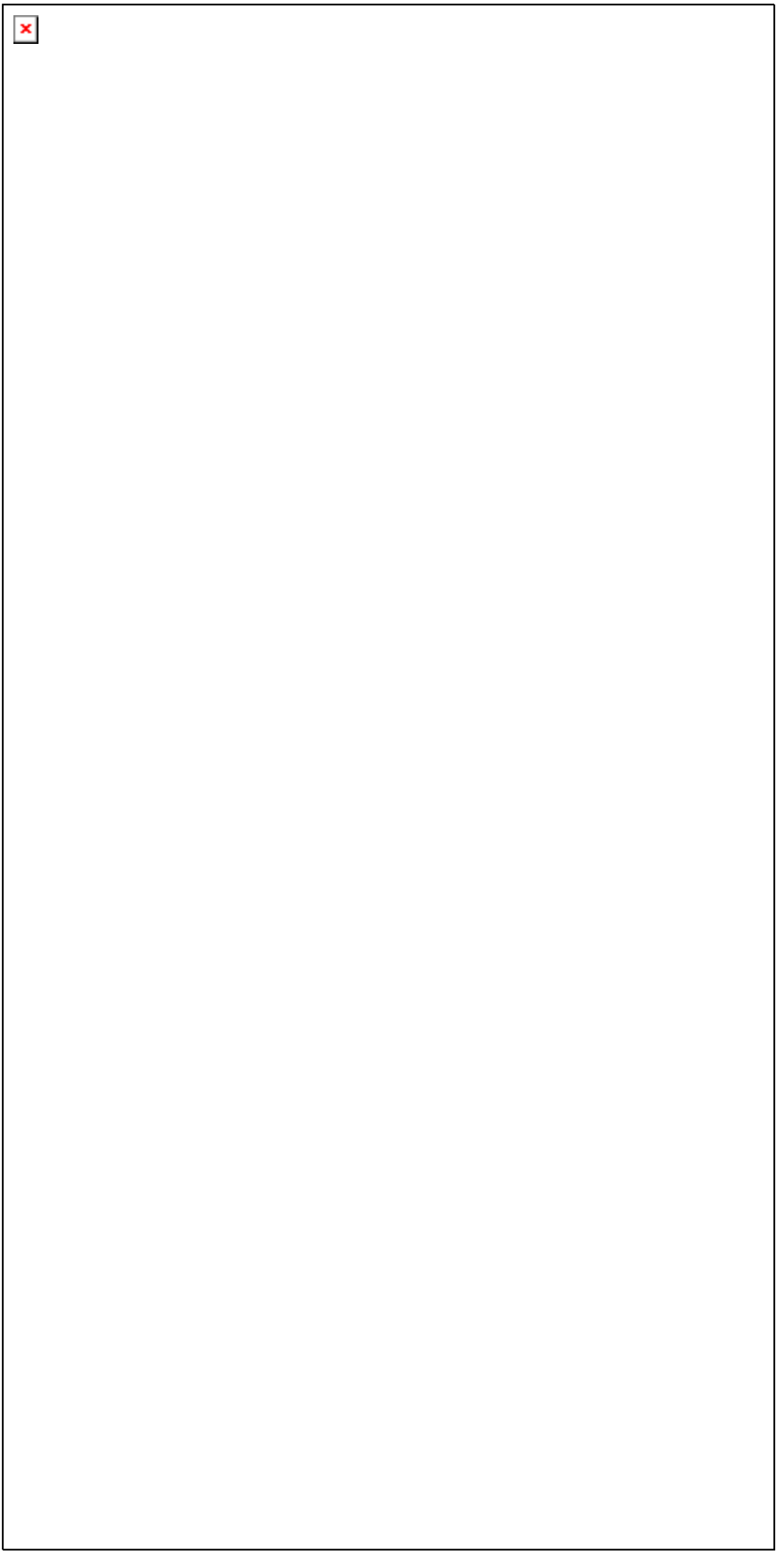
آیت پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترک نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعہ سے بڑھاتے نہ رہیں خود اس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے اور اس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہے۔

چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ "نماز دین کا ستون ہے"۔ جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے اسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دین داری بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ طائف کے وفد نے جب مدینہ منورہ آ کر صلح کی بات چیت شروع کی تو نماز جہاد اور صدقات سے مستثنیٰ ہونا چاہا آپؐ نے دو پچھلی باتوں سے مستثنیٰ کر دیا لیکن نماز کے متعلق فرمایا "جس دین میں خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو اس

میں کوئی بھلائی نہیں''۔آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ''نماز دل کی روشنی ہے'' اپنی نسبت فرمایا ہے''نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے''۔ایک تمثیل میں آپؐ نے فرمایا''انسان آگ میں جلتا رہتا ہے اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے''۔یہ محبوب ازل کے ہجر و فراق کی آگ ہے اور نماز کسب زلال ہے جو اس آگ کو سرد کر دیتا ہے۔آپؐ نے فرمایا کہ''کفر اور ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی سے ہے کیونکہ ایمان اور کفر دونوں انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہیں جس کا اظہار اس کے اعمال ہی سے ہو سکتا ہے۔مسلمان کا وہ عمل جس کے دیکھنے کا دن میں متعدد دفعہ لوگوں کو موقع ملے نماز ہی ہے۔عین اس وقت جب جناب رسالت پناہ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے اور فرض نبوت کے آخری حروف زبان مبارک سے ادا ہو رہے تھے' آپؐ فرما رہے تھے''نماز اور غلام''(۱)۔

نماز کی حقیقت::

نماز کیلئے اصل عربی لفظ''صلوہ'' ہے۔صلوہ کے معنی عربی وارعربی زبانوں میں ''دعا'' کے ہیں۔اس لیئے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست اور التجا ہے اور اس کی معنوی حقیقت بھی یہی ہے۔آنحضرتﷺ نے بھی نماز کی یہی تشریح فرمائی ہے۔معاویہ بن حکم سلمی ایک نومسلم صحابی تھے۔ان کو اسلام کے جو آداب بتائے گئے ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ جب کسی مسلمان کو چھینک آئے اور وہ الحمداللہ کہے تو اس کے جواب میں تم یرحمک اللہ کہو' اتفاق سے ایک دفعہ نماز با جماعت ہو رہی تھی۔ معاویہ بھی اس میں شریک تھے' ان کے پاس کسی مسلمان کو چھینک آئی' انہوں نے نماز کی حالت میں یرحمک اللہ کہہ دیا' صحابہؓ نے ان کو گھورنا شروع کیا۔معاویہ نے نماز ہی میں کہا تم سب مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ صحابہؓ نے رانوں پر ہاتھ مارے اور سبحان اللہ کہا' اب وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جا رہا ہے' نماز ہو چکی تو آنحضرتﷺ نے پوچھا کہ نماز میں کون باتیں کر رہا تھا؟ لوگوں نے معاویہؓ کی



قد افلح من تزکی و ذکر اسم ربه فصلی (اعلی: ۱)

کامیاب وہ ہوا جس نے پاکی حاصل کی اور خدا کا نام یاد کیا

پس نماز پڑھی۔

انسان کو اپنی روحانی تڑپ، دلی بے چینی، قلبی اضطراب اور ذہنی شورش کے عالم میں جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر واماندہ، جسم کی ہر قوت عاجز اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے تو سکون و اطمینان کی راحت اس کو صرف اسی ایک قادر مطلب کی پکار، دعا اور التجا میں ملتی ہے۔ وحی الٰہی نے اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کیا:

الا بذکر الله تطمئن القلوب (عد: ۴)

ہاں! خدا کی یاد سے دل تسکین پاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مصیبت کے ہجوم اور تکلیفوں کی شدت کے وقت ثبات قدم اور دعا ہی چارہ کار بنتے ہیں۔

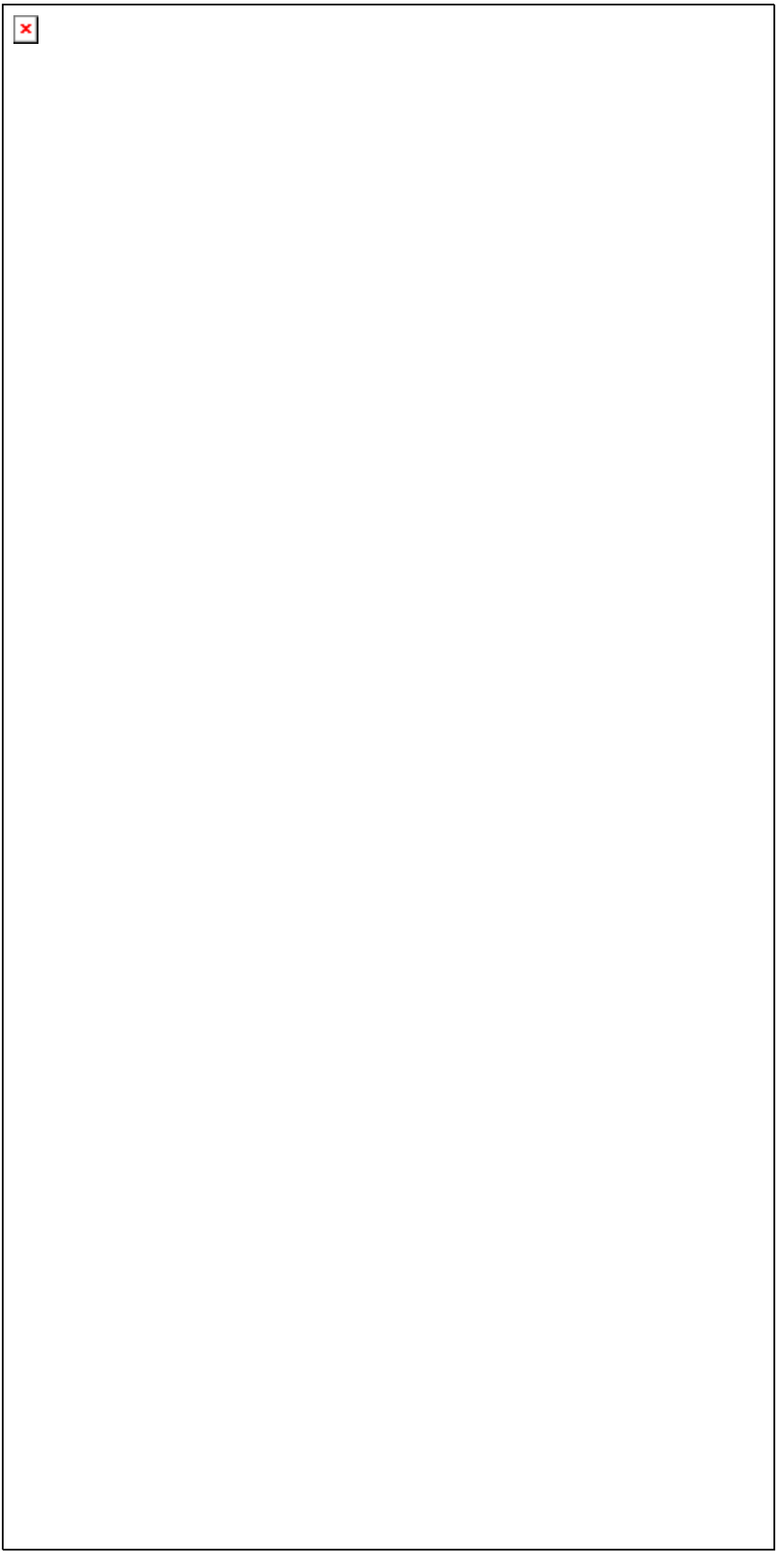
واستعینو بالصبر و الصلوه (بقره: ۵)

ثابت قدمی اور نماز (یا دعا) کے ذریعہ سے اپنی مصیبتوں میں مدد چاہو۔

زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ خدائے قادر و توانا کے سامنے سرنگوں ہے، آسمان، زمین، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، جنگل، جھاڑ، چرند، پرند سب اس کے آگے سربسجود ہیں اور اس کے مقرر کردہ احکام قوانین کی بے چون و چرا اطاعت کر رہے ہیں، یہی ان کی تسبیح و نماز ہے۔

وان من شئی الا یسبح بحمده و لکن لا تفقهون تسبیحهم (بنی اسرائیل: ۵)

اور (دنیا میں کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ اس (خدا) کی حمد کی تسبیح



نماز کی روحانی غرض و غایت ::

نماز کی روحانی غرض و غایت یہ ہے کہ اس خالق کل، رزاق عالم، مالک الملک، منعم اعظم کی بے غایت بخششوں اور بے پایاں احسانوں کا شکر، ہم اپنے دل اور زبان سے ادا کریں تا کہ نفس و روح اور دل و دماغ پر اس کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی اور بے چارگی کا نقش بیٹھ جائے، اس کی محبت کا نشہ رگ رگ میں سرایت کر جائے، اس کے حاضر و ناظر ہونے کا تصور نا قابل زوال یقین کی صورت میں اس طرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ و نیت اور جسمانی فعل و عمل کے وقت اس کی ہوشیار اور بیدار آنکھوں کو اپنی طرف اٹھا ہوا دیکھیں جس سے اپنی برے ارادوں پر شرمائیں اور ناپاک کاموں کو کرتے ہوئے جھجکیں اور بالآخر ان سے بالکل باز آئیں، صحیحین کی کتاب الایمان میں ہے کہ ایک روز آنحضرت ﷺ صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے۔ ایک شخص نے سائل کی صورت میں ایمان و اسلام کی حقیقت دریافت کی، آپ ﷺ نے اس کی تشریح فرمائی، پھر پوچھا کہ یا رسول اللہ احسان کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ ''تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔'' اسی طرح ایک اور شخص کو نماز کے آداب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ ''نماز کی حالت میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کیونکہ اس وقت وہ اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز کی باتوں میں مصروف ہوتا ہے۔'' (۱)۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک رات جب آپ ﷺ اعتکاف میں بیٹھے تھے اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے۔ اس کو جاننا چاہئے کہ وہ کیا عرض و معروض کر رہا ہے، نماز میں ایک دوسرے کی آواز کو مت دباؤ (۲)۔'' ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ نماز کی

عادت سے ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہیں اور اس کے اخلاق و عادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے، اسی لیئے قرآن پاک میں اس نکتہ کی شرح اس طرح کی گئی:

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الصلوہ باب الزاق فی الصلوہ، صحیح مسلم باب المساجد، مسند احمد جلد ۲ ص ۲٤، جلد ۳ ص ۱۷٦، ۱۸۸ وغیرہ۔ (۲)۔ مسند احمد جلد ۲ ص ۳٦، ٦۷، ۲۹۱۔

اقم الصلوہ ان الصلوہ تنھی عن الفحشاء و المنکر ولذکر اللہ اکبر (عنکبوت: ۵)

اور نماز کھڑی کیا کر کہ نماز بے حیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے اور البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔

اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ نماز کی برائیوں اور بے حیائی سے روکتی ہے اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں، بے حیائی اور برائی کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے، یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے جس کا حصول انسان کی منزل مقصود اور حقیقی کامیابی ہے، چنانچہ فرمایا:

قد افلح من تزکی و ذکر اسم ربہ فصلی (الاعلی)

کامیاب ہوا ہو جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے یعنی نماز پڑھے، اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے۔

انما تنذر الذین یخشون ربھم بالغیب و اقاموا الصلوہ و من تزکی فانما یتزکی لنفسیہ و الی اللہ المصیر (فاطر: ۳)

تو انہیں کو تو ہوشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز کھڑی کیا کرتے ہیں اور جو تزکیہ اور دل کی صفائی حاصل کرتا ہے اور اپنے ہی لیئے حاصل کرتا ہے اور (آخر) خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برائیوں سے ہٹاتی اور اس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے۔ فرمایا:

ان الانسان خلق هلوعا و اذا مسه الشر جزوعا لا اذا مسه الخير منوعا الا المصلين الذين هم على صلاتهم دايمون (معارج: ۱)

بیشک انسان بے صبرا بنا ہے جب اس پر مصیبت آئے تو گھبرایا اور جب کوئی دولت ملے تو بخیل لیکن وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنی والے کے لیئے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہے۔

نماز کی انہی ثمرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک تمثیل میں صحابہؓ سے فرمایا کہ ''اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف و شفاف نہر بہتی ہو جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کی نہیں یا رسول اللہ! ارشاد ہوا کہ ''نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے جس طرح پانی میل (۱)۔ کو''۔ ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے آ کر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھی، اسی پر یہ آیت نازل ہوئی (۲)۔:

---

(۱)۔ یہ حدیث مختلف کتابوں میں مختلف روایتوں کے ساتھ آئی ہے، کنز العمال (ج ٤ ص ٦٧، ٦٨) حاکم، احمد، ابن خزیمہ، طبرانی اور بیہقی کے حوالوں سے یہ تمام روایتیں یکجا مذکور ہیں۔ (۲)۔

واقم الصلوٰۃ طرفی النھار و زلفا من اللیل ان الحسنٰت یذھبن السیات ذلک ذکری للذاکرین

(ہود: ۱)

اور ان کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں نماز کھڑی کیا کرو، بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ مذہب اپنے پیروؤں میں جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ان کا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے جو اپنے صحیح آداب و شرائط کے ساتھ بجا لائی گئی ہو، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے جس کے گر جانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔

نماز کیلئے کچھ آداب وشرائط کی ضرورت::

جس طرح مادی عالم کے کچھ قانون ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے ہمارے اعمال کے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی دنیا جس کو مذہب ''قلب کا عالم'' اور فلسفہ نفسیات یا ''دماغی کیفیات'' کہتا ہے اس کے لیئے کچھ قانون اور اسباب ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے قلب و دماغ اور نقش و روح کے مطلوبہ اعمال و افعال سامنے آتے اور ان کے صحیح نتیجے مرتب ہوتے ہیں۔ سائیکالوجی ''علم نفسیات'' کے انکشاف اور ترقی نے اب اس گرہ کو بالکل کھول دیا ہے اس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یا دوسروں کی اندر جس قسم کے جذبات اور ولولے پیدا کرنا چاہیں اور ان کے مناسب شکل وصورت اور ماحول (گردوپیش) نہ اختیار کریں تو ہم کو ان کے پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہوسکتی۔ ہمارے تمام تمدنی اور

معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت میں وضع ہوئے ہیں اور اسی اصول کی بنا پر ہر قسم کے مذہبی، سیاسی اور اجتماعی مقاصد کے حصول کیلئے رواجی رسوم و آداب اور قواعد و ضوابط مقرر ہیں، معبدوں، ہیکلوں اور گرجوں میں جہاں مذہبی عظمت و تقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، پجاریوں اور کاہنوں کے خاص لباس، خاص رسوم و آداب، سکون و خاموشی، ادب و لحاظ، گھنٹوں کی پرشکوہ آواز اور نشست و برخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہیں، شاہانہ رعب و داب کے اثرات پیدا کرنے کیلئے شاہی جلوسوں اور سلطانی درباروں میں فوجوں کے پرے قومی ہیکل چوبدار عصا بردار نقیب و چاؤش، خدام کی زرق برق پوشاکیں، ننگی تلواریں، بلند نیزے، تخت و تاج، علم و پرچم، ماہی مراتب، نوبت و نقارہ اور دمبدم دربارش اور نگاہ روبرو کی پر رعب صدائیں ضروری ہیں کہ کسی تعلیمی یا علمی میلان پیدا کرنے کیلئے فضا کا سکون و خاموشی مقام کی سادگی و صفائی، شور و غوغا اور شہر و بازار سے دوری ضروری چیزیں ہیں، بزم عروسی کیلئے رنگ و بو، نور و سرور، گانا بجانا اور عیش و نشاط کا اظہار طبعی ہے۔

انہی طبعی و نفسی اصول کی بنا پر مذہبی اعلام میں بھی ان محرکات و آداب و قوانین کی رعایت رکھی گئی ہے، نماز سے مقصود دل کے خضوع و خشوع، توبہ و انابت، پشیمانی و شرمندگی، اطاعت و بندگی اور خدا کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و درماندگی کا اظہار، نیز دل و دماغ اور نفس و روح کی پاکی، صفائی و طہارت پیدا کرنا ہے، اس بنا پر نماز کے لیئے بھی ایسے آداب و شرائط اور ارکان مقرر کیئے گئے جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشو و نما ہو۔ مثلاً نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہ عالم کے دربار میں کھڑا ہے، ہاتھ باندھے رہے، نظر نیچی کیے رہے، طور و طریق اور حرکات و سکنات میں ادب و احترام کا لحاظ رکھے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، ادب سے اس کی بارگاہ میں اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو پیش کرے، اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیات پر پڑتا ہے اور اس

میں روحانی فیوض و برکات کی استعداد و صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ظاہری صفائی و پاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے، تو دل کی صفائی و پاکیزگی کا تصور اس کے اندر مموثر انداز میں کیونکر پیدا ہوگا، یہی نفسی اصول ہے جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ میں جاری و ساری ہے، اندر بنانے کے لیئے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔ اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازوں سے جماعت کی نماز، اور گھر کی نمازوں سے مسجد کی نماز بہتر ہے کہ جماعت کا ماحول اور مسجد کا منظر دلوں کی کیفیت کو دوبالا کر دے گا۔ اسی بنا پر تمام بڑے بڑے کاموں میں اجتماعیت اور نظام وحدیت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اسی اصول کے ماتحت سکولوں کی تنظیم اور ان کی درجہ بندی، کھیل میں فریقین کی ہمرنگی و ہم لباسی، فوجوں میں وردی اور حرکت و عمل کی یکسانی ضروری سمجھی گئی ہے اور یکساں اسلحہ اور ہتھیار اور ہمقدم سکون و رفتار کی بھی ضرورت ہے کہ ان ظاہری محرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت میں چند اشخاص ایسے ہوں جو اصلی کیفیت سے متکیف ہوں، ان کی یہ حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسروں کو بھی پر کیف بناتی ہے اور ان سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہو کر کم و بیش پوری جماعت متاثر ہو جاتی ہے۔ اسی لیئے جلسوں میں ایک کی ہنسی سے سب کو ہنسی اور ایک کے رونے سے بہتوں کو رونا آ جاتا ہے۔ نفسیات اجتماع میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہے، غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادت کے لیئے ان طبعی و نفسی اصول کو بڑا لحاظ رکھا ہے، نماز کے آداب، شرائط اور ارکان انہی کا نام ہے۔

ذکر و دعا و تسبیح کے دو طریقے::

یہ بار بار دہرایا جا چکا ہے کہ نماز سے مقصود خضوع و خشوع، ذکر الٰہی، حمد و ثنا اپنے گناہوں پر ندامت و استغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہے، یہ تمام باتیں درحقیقت انسان کے دل سے تعلق رکھتی ہیں، جن کیلئے ظاہری ارکان کی

حاجت نہیں ہے اسی لیئے اسلام نے اپنی عبادتوں کی دو قسمیں کی ہیں' ایک تو وہ جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت میں کسی قید و شرط کے بغیر ادا کر سکے' اس کا نام عام تسبیح و تہلیل اور ذکر الٰہی ہے جس کیلئے نہ زمانہ کی قید ہے نہ مکان کی شرط ہے نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے' یہ عبادت ہر لحظہ اور ہر صورت میں انجام پا سکتی ہے۔ چنانچہ خدا نے فرمایا:

فاذکروا اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبکم (نساء: ۵)

پس تم اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یاد کرو۔

اور محمد ﷺ کے فیض صحبت سے صحابہ کرام کی یہی حالت تھی' خدا نے ان کی مدح فرمائی:

الذین یذکرون اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبھم (آل عمران: ۲۰)

جو کھڑے' بیٹھے اور لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں۔

دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی ان کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے۔ فرمایا:

رجال لا تلھیھم تجارہ و لا بیع عن ذکر اللہ (نور: ۵)

ایسے لوگ ہیں جن کو تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔

نماز متحدہ طریق عبادت کا نام ہے::

دوسری عبادت وہ ہے جو خاص شکل و صورت کے ساتھ خاص اوقات میں اور خاص دعاؤں کے ذریعہ سے ادا کی جائے اس کا نام نماز ہے۔ پہلا طرز عبادت انفرادی چیز ہے اور وہ ہر فرد کے جداگانہ انتخاب پر منحصر ہے۔ اس کو جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے اور نہ اسلام میں اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا مسنون بتایا گیا ہے۔ وہ تنہائی کا راز ہے جس کو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہئے کہ ریا اور نمائش کا شائبہ

بھی پیدا نہ ہو سکے لیکن دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے اور اسی لیئے اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے اور اس کے انکار پر قتل تک جائز ہوسکتا ہے اگر اس کو جماعت کے ساتھ ادا نہ کرے تو اگر چہ وہ ادا ہو جائے گی لیکن جماعت کے ثواب اور برکات سے اس شخص کو محرومی رہے گی' دوسرے لفظوں میں ہم ان کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ عام ذکر وفکر اور تسبیح تہلیل' انفرادی طریقہ عبادت ہے اور نماز ایک جماعتی شعار ہے جو خاص ارکان اور شرائط کے ساتھ اوقات مقررہ پر ادا ہوتی ہے اور جس کے ادا کرنے کا جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت میں حکم ہے' البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کے ساتھ ادا نہ ہو سکے تو تنہا بھی اس کو ادا کرنا ضروری ہے' اس کی مثال اس سپاہی کی سی ہے جو کسی منزل میں اپنی فوج سے جس کے ساتھ اس کو چلنا تھا کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا اب تنہا رہ کر بھی اس کو وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا۔

نماز میں نظام وحدت کا اصول::

اسلام کے عام فرائض و احکام اور خصوصًا نماز اور اس کے متعلقات کی نسبت غور کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے' وہی اصول درحقیت اسلام کا اصلی راز بلکہ سرالاسرار ہے' اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہے اور وہ ''توحید'' ہے۔ یہ توحید نہ صرف ایک فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ نکتہ پروری ہے بلکہ وہ عملی کیفیت ہے جس کو اسلام کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہئے۔ اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اس حقیقت اور کیفیت کا مظہر ہے' نماز کی ایک ایک حرکت' ایک ایک جنبش' ایک ایک لفظ' ایک ایک اشارہ اور ایک ایک طرز سے اس حقیقت و کیفیت کو تراوش کرنا چاہئے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک نماز کی کوئی خاص شکل وصورت آئین وطریق اور سمت ووقت مقرر نہ کیا جاتا جماعتیں اس کو ایک متحد نظام میں ادا نہ کر سکتی تھیں' نماز لاکھوں کروڑوں مسلمانوں پر جنہوں نے دعوت

محمدی ﷺ کو قبول کیا، فرض تھی، اب اگر ان میں سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی کہ جیسے چاہے، جب چاہے، جدھر چاہے منہ کر کے ادا کرے تو اسلام کی وحدت کا نظام قائم نہ رہتا اور نہ اس کے دل کی طرح اس کی جسمانی اداؤں سے بھی توحید کا راز آشکار ہوتا اور نہ کل روئے زمین کے لاکھوں، کروڑوں مسلمان واحد جماعت کی مجسم صورت بن سکتے۔

غرض اس نظام وحدت کا آشکارا وہویدا کرنا، توحید کا سب سے بڑا رمز اور شعار تھا اور کروڑوں دلوں کو جو کروڑوں اشباح و اجسام میں ہیں ایک متحد جسم اور واحد قالب ظاہر کرنا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ان سے واحد نظام کے ماتحت واحد شکل و صورت میں، واحد اعمال و افعال کا صدور کرایا جائے، چنانچہ انسان کے تمام جماعتی نظامات کی وحدت اسی اصول پر مبنی ہے قوم کی وحدت، فوج کی وحدت، کسی بزم و انجمن کی وحدت، کسی مملکت و سلطنت کی وحدت، غرض ہر ایک نظام وحدت اسی اصول پر قائم ہے اور اسی طرح قائم ہو سکتا ہے۔

نماز میں جسمانی حرکات::

یہ بھی ظاہر ہے کہ نماز کی اصل غرض و غایت چند پاکیزہ جذبات کا اظہار ہے، یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے حسب حال اس سے کوئی فعل یا حرکت بھی صادر ہوتی ہے۔ غصہ کی حالت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، خوف میں زرد پڑ جاتا ہے، خوشی میں کھل اٹھتا ہے، غم میں سکڑ جاتا ہے، جب وہ کسی سے سوال کرتا ہے تو اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے، کسی کی تعظیم کرتا ہے تو اس کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، کسی سے عاجزی کرتا ہے تو اس کے آگے جھک جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ اپنا تذلل، فروتنی اور خوشامد مقصود ہو تو منہ کے بل گرتا ہے اور پاؤں پر سر رکھ دیتا ہے، یہ جذبات کے اظہار کے فطری طریقے ہیں جو ہر قوم میں تقریباً یکساں رائج ہیں، اس تشریح کے بعد اب یہ سمجھنا چاہئے کہ جس طرح

نماز کی دعائیں انسانی طرز بیان میں ادا کی گئی ہیں' اس کے ارکان بھی انسان کے فطری افعال وحرکات کی صورت میں رکھے گئے ہیں۔

انسان کے قلبی افعال و اعمال کے مظاہر اس کے جسمانی اعضاء ہیں' کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو ارادہ ونیت اور اس کے دلی جذبات واحساسات کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے ان کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہ ہو' اگر ایسا نہ ہو تو ہر انسان کے اندر کی چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے جس طرح باہر کی اور اس لیئے خدا کو ظاہر اعمال کی ضرورت نہیں مگر خود بندوں کو ان کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ظاہری وباطنی دونوں حیثیتوں سے عرض والتجا اور تذلل و عاجزی کی تصویر بن جائیں۔

انسان اپنے جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے خدا کا مخلوق ہے' اس کی زندگی کے دونوں جز خدا کے احسانات وانعامات سے یکساں گراں بار ہیں' اس لیئے ضرورت ہے کہ اس خالق ورزاق اور اس ارحم الراحمین کے سامنے روح اور جسم دونوں جھک کر سجدہ نیاز ادا کریں' غرض یہ وجود ہیں جن کی بنا پر شریعت نے جسم و جان دونوں کی رعایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کیے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ انسان کی فطری اعمال وحرکات کے قالب میں نماز کا پیکر تیار کیا گیا ہے' جسمانی طریقے سے ہم کسی بڑے محسن کی تعظیم اور اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار تین طریقوں سے کرتے ہیں' کھڑے ہو جاتے ہیں' جھک جاتے ہیں' زمین پر سر رکھ دیتے ہیں' نماز کے بھی تین رکن ہیں' چنانچہ آغاز عالم سے انبیائے کرامؑ نے جس نماز کی تعلیم انسانوں کو دی وہ انہیں تین اجزاء سے مرکب تھی' کھڑے ہو جانا (قیام) جھک جانا (رکوع) اور زمین پر سر رکھ دینا (سجدہ)۔

ارکان نماز ::

معلوم ہو چکا ہے کہ ''نماز'' ملت ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی' حضرت

ابراہیمؑ کو جب خدا کے گھر کی تعمیر و تطہیر کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس کی غرض بھی بتائی گئی:

وطهر بيتي للطائفين و القائمين و الركع السجود

(حج: ۴)

اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، کھڑے ہونے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیئے پاک و صاف کر۔

اس حکم میں نماز کے تینوں ارکان قیام، رکوع اور سجود کا مفصل اور بہ ترتیب ذکر ہے، حضرت مریمؑ کا زمانہ سلسلہ اسرائیلی کا آخری عہد تھا، ان کو خطاب ہوا:

يمريم اقنتي لربك و اسجدي و اركعي مع الراكعين

(آل عمران: ۵)

اے مریمؑ! اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہو کر بندگی اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔

اس نماز مریمی میں بھی نماز کے تینوں ارکان موجود ہیں۔

ان ارکان کی ترتیب::

جب کوئی حقیقت تین مرتب ارکان سے مرکب ہو اور ان میں سے ایک کا اول ہونا اور دوسرے کا سب سے موخر ہونا ثابت ہو جائے تو تیسرے کا وسط میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا، چنانچہ نماز کی ہر رکعت قیام اور رکوع اور سجود سے مرکب ہے اور قیام کا اول اور سجود کا آخر ہونا قرآن پاک کی حسب ذیل آیت سے ثابت ہے تو رکوع کا ان دونوں کے بیچ میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا۔

فاذا كنت فيهم فاقمت لهم الصلوة فلتقم طائفة منهم معك وليأخذوا اسلحتهم فاذا سجدوا

فلیکونوا من ورائکم (نساء: ۱۵)

جب تو ان میں ہے تو ان کیلئے نماز کھڑی کرے تو چاہئے کہ ان میں سے ایک گروہ کے لوگ تیرے ساتھ کھڑے ہوں اور اپنے ہتھیار لیئے رہیں، پھر جب یہ سجدہ کرلیں تو یہ تمہارے پیچھے چلے جائیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایک رکعت میں پہلے کھڑا ہونا اور آخر میں سجدہ پر ایک رکعت تمام ہوئی ہے۔ پس لامحالہ رکوع، قیام و سجود کے بیچ میں ہوگا اور ہر رکعت کے ارکان سہ گانہ کی ترتیب یہ ہوگی کہ اول قیام پھر رکوع پھر سجود۔

تورات کے حوالوں سے بھی نماز کے مختلف ارکان کا پتہ چلتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ مترجموں نے عبرانی اور یونانی لفظوں کے ترجمے اپنے خیالات اور رسم و رواج کے مطابق کر دیئے ہیں جن سے حقیقت کے چہرہ پر بڑی حد تک پردہ پڑ جاتا ہے۔ بہر حال عبادت اور تعظیم کے یہ تینوں طریقے حضرت ابراہیمؑ کی شریعت اور ان کی نسل میں جاری تھے، ذیل میں ہم ان میں سے ہر ایک کا حوالہ تورات کے مجموعہ سے نقل کرتے ہیں۔

قیام::

''پر ابراہام (ابراہیم) ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا'' (پیدائش ۱۸۔۲۲)

رکوع::

''اور (ابراہیم) زمین تک ان کے آگے جھکا اور بولا اے خداوند'' (پیدائش ۱۸۔۲)

سجدہ::

''اور یہ سن کے کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر گیری کی اور ان کے دکھوں پر نظر کی، انہوں نے اپنے سر جھکائے اور سجدے کیئے'' (خروج ۴۔۲۱)

''تب ابراہام (ابراہیم) منہ کے بل گرا اور خدا اس سے ہمکلام ہو کر بولا'' (پیدائش ۱۷۔۳)

''تب ابراہام (ابراہیم) نے اپنے جوانوں سے کہا تم یہاں گدھے کے پاس رہو میں اس لڑکے کے ساتھ (اپنے فرزند کی قربانی کے لیئے) وہاں تک جاؤں گا اور سجدہ کر کے پھر تمہارے پاس آؤں گا'' (پیدائش ۲۲۔۵)

''تب اس مرد (حضرت اسحاق کا ایلچی) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا میرے خداوند ابراہام کا خدا مبارک'' (پیدائش ۲۴۔۲۶)

''اور ایسا ہوا کہ جب داؤد پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا جہاں سے اس نے سجدہ کیا'' (۲ سموال ۱۵۔۲۲)

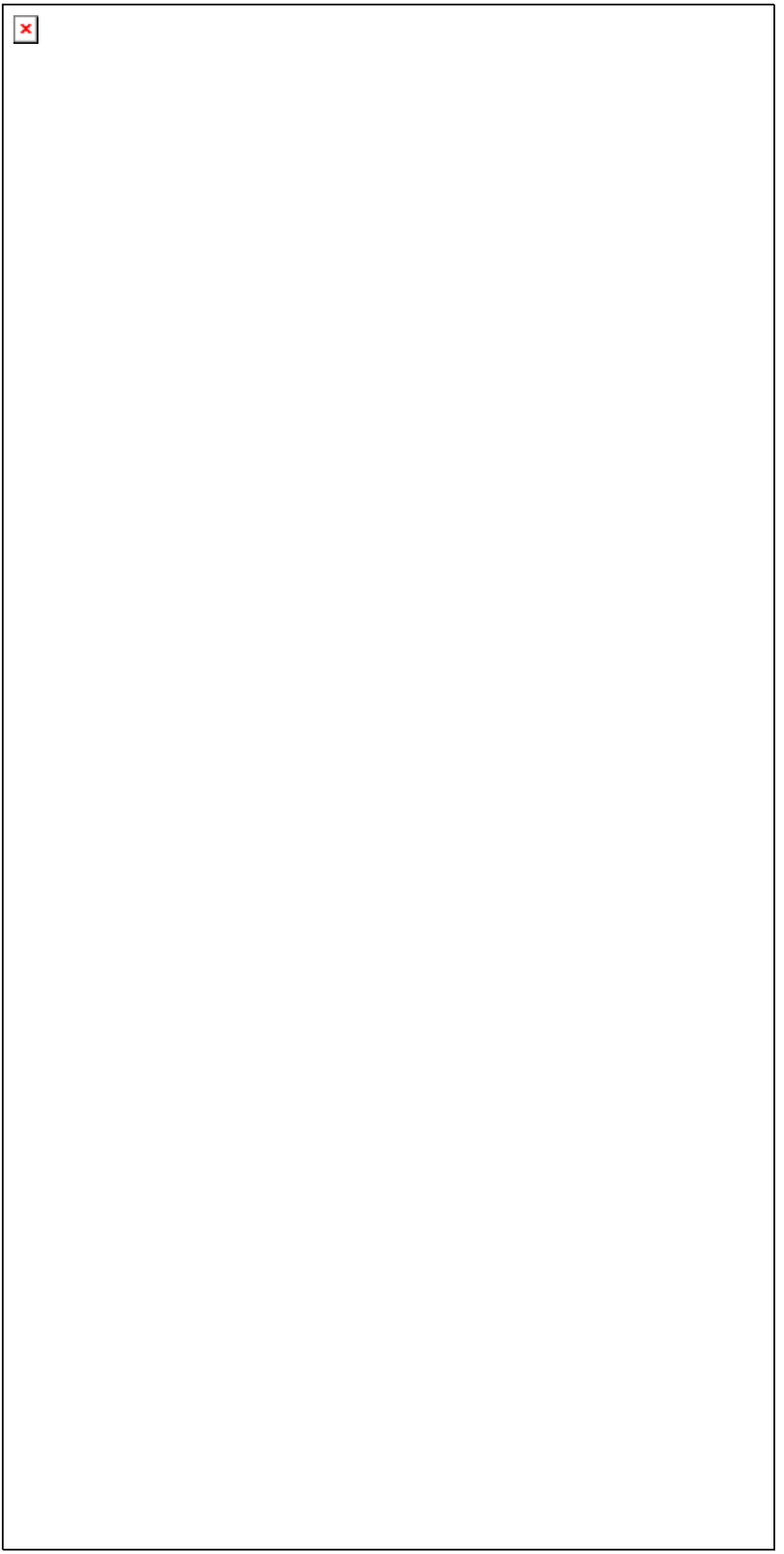
زبور میں حضرت داؤد خدا تعالیٰ سے کہتے ہیں :

''اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا'' (زبور ۵۔۷)

ان حوالوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیمی ملت میں عبادت اور تعظیم الٰہی کے یہ تینوں ارکان موجود تھے اور اسلام نے اسی کی پیروری کی ہے۔ موجودہ انجیل میں دعا و نماز کا ذکر متی ۶۔۵، ۱۷۔۲۱، ۲۶۔۲۶، مرقس ۱۴۔۳۳، لوقا ۲۲۔۴۱ وغیرہ میں ہے، طریقہ نماز میں ایک انجیل میں ایک ہی موقع کے لیئے گھٹنا ٹیکنا (جو گویا رکوع ہے) (لوقا ۲۲۔۴۱) اور دوسری میں (متی ۲۶۔۳۹) منہ کے بل گرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے اور بقیہ انجیلوں میں خاموشی ہے۔

عہد بعثت میں یہود و نصاریٰ میں جو لوگ نماز کے پابند تھے وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے، کھڑے ہو کر تورات یا زبور کی آیتیں تلاوت کرتے تھے اور سجدہ بھی کرتے تھے، قرآن پاک کی شہادت ہے :

لیسوا سواء من اهل الکتب امه قائمه یتلون ایت
لله اناء الیل و هم یسجدون (آل عمران: ۱۲)



فان خفتم فرجالا او رکبانا فاذا امنتم فاذکروا اللہ کما علمکم ما لم تکونوا تعلمون (بقرہ: ۲۳۱)

نمازوں کے بیچ کی نماز کی نگہداشت کرو اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو کرو۔ (پڑھو) پھر جب خوف جاتا جاتا رہے تو اللہ کو ویسے یاد کرو جیسے اس نے تم کو بتایا جو تم نہیں جانتے تھے۔

(۱)۔ فتح الباری ابن حجر، ج ۲، ص ۲۲۷ مصر۔ (۲)۔ مضمون صلوہ ج ۴، ۹۶۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ذکر الٰہی کا کوئی خاص طریقہ تھا جس کی عملی شکل نماز ہے اور اسی کی تفصیل سورہ نساء میں ہے، اسی طرح جنگ کی نماز میں ایک رکعت امام کے ساتھ با قاعدہ ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت کے متعلق کہا گیا ہے:

فاذا قضیتم الصلوہ فاذکروا اللہ قیاما و قعودا و علی جنوبکم فاذا اطمانتم فاقیمو الصلوہ (نساء: ۱۵)

پس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکو تو اللہ کو اٹھے بیٹھے اور پہلوؤں پر یاد کرو، پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو۔

اس آیت میں غور کرنے کی دو باتیں ہیں، اول یہ کہ ایک رکعت جو با قاعدہ ادا ہوئی اس کو الصلوہ (نماز) کہا گیا اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اٹھ کر، بیٹھ کر، جھک کر، لیٹے اور لڑائی، حملہ اور مدافعت کی حالت میں پوری ہوئی اس کو صرف ''ذکر اللہ'' کہا گیا، دوسرے بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی مخفف نماز کو ''اقامت صلوہ'' (نماز کھڑی ہونا'' کے لفظ نے ادا نہیں کیا گیا حالانکہ ذکر الٰہی، تسبیح تہلیل اور بعض ارکان بھی اس میں موجود تھے بلکہ یہ فرمایا گیا کہ ''پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو'' اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰہت (نماز کھڑے کرنے'' کے معنی مطلق ذکر و فکر، تسبیح

وتہلیل، حمد وثناء اور تلاوت قرآن سے جداگانہ ہیں، یعنی اقامت صلوٰۃ کے ضمن میں ذکر وفکر تسبیح وتہلیل، حمد وثناء اور قرات کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہیں جو جنگ کی حالت میں کم یا موقوف ہو گئے تھے اور اب اس عارضی مانع کے دور ہو جانے کے بعد پھر بدستور نماز میں ان کی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، یہی وہ ارکان تھے جن کے متعلق سورہ بقرہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جب خوف جاتا رہے تو پھر خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے بتایا ہے۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام میں نماز کن ارکان کے ساتھ مقرر ہوئی ہے۔ گو اس کے لیئے یہ بالکل کافی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تمام عمر کس طرح نماز پڑھی اور صحابہؓ کو کسی طرح کی نماز سکھائی، کیونکہ نماز کی یہ عملی کیفیت پورے تواتر کے ساتھ اس عہد سے لے کر آج تک موجود ہے اور دوست و دشمن اور مخالف و موافق کو معلوم ہے اور اسلام کے ہر فرقہ میں یکساں طور سے عملاً بلا اختلاف مسلم ہے تاہم نظریہ پسند لوگوں کے لیئے قرآن پاک سے ان کا ثبوت پہنچا دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

ہم پہلے رب العزت کی بارگاہ میں ممودب کھڑے ہوتے ہیں:

حافظو اعلی الصلوات و الصلوہ الوسطی و قوموا للہ قانتین (بقرہ: ۲۳۱)

نمازوں پر (عموماً) اور بیچ کی نماز میں (خصوصاً) نگاہ رکھو اور خدا کے آگے ممودب کھڑے ہو۔

نماز کا آغاز خدا کا نام لے کر کرتے ہیں کہ:

وذکر اسم ربہ فصلی (الاعلی: ۱)

اور اپنے پروردگار کا نام لیا، پس نماز پڑھی۔

و ربك فكبر (مدثر: ۱)

اور اپنے رب کی بڑائی کر۔

لفظ اللہ اکبر جس کی نماز میں بار بار تکرار کی جاتی ہے اسی حکم کی تعمیل ہے :

وسبح بحمد ربك حين تقوم (طور: ۲)

اور جب تو کھڑا ہو تو اپنی پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔

پھر قرآن پڑھتے ہیں :

فاقرء و اما تيسر من القران (مزمل: ۲)

قرآن میں سے جتنا ہو سکے پڑھو۔

قرآن کی ان آیتوں میں خدا کے اسماء اور صفات کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کی حمد خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ جس سے اس کی بڑائی (تکبیر) ظاہر ہوتی ہے :

قل ادعوا الله او ادعو الرحمن ايا ما تدعوا فله الاسماء الحسنى ولا تجهر بصلوتك ولا تخافت بها و ابتغ بين ذلك سبيلا و قل الحمد لله الذى لم يتخذ ولد اولم يكن له شريك فى الملك و لم يكن له ولى من الذل و كبره تكبيرا (بنى اسرائيل: ۴)

کہہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو پکارو، جو کہہ کر پکارو، سب اچھے نام اسی کے ہیں، اپنی نماز نہ بہت زور سے پڑھ اور نہ بہت چپکے بیچ کی راہ تلاش کر، اور کہہ کر حمد اس اللہ کی جس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ سلطنت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ درماندگی کے سبب سے اس کا کوئی مددگار ہے اور اس کی بڑائی کر، بڑی بڑائی۔

چونکہ اس کی یہ حمد سورہ فاتحہ میں بہ تمام و کمال مذکور ہے اس لیئے اس سورہ کو ہر نماز میں پہلے پڑھتے ہیں، اس کے بعد قرآن میں سے جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے اس

کو پڑھتے ہیں، پھر خدا کے سامنے ادب سے جھک جاتے یعنی رکوع کرتے ہیں:

وارکعوا مع الراکعین (بقرہ: ۵)

اور رکوع کرنے کے ساتھ رکوع کر۔

پھر اس کے آگے پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے یعنی سجدہ کرتے ہیں:

یایھا الذین امنوا ارکعوا و اسجدوا و اعبدوا ربکم و افعلوا الخیر لعلکم تفلحون (حج: ۱۰)

اے ایمان والو جھکو (رکوع کرو) اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی پرستش کرو اور نیک کام کرو تا کہ کامیاب ہو۔

ان دونوں (رکوع و سجدہ) میں خدا کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں۔

فسبح باسم ربک العظیم (واقعہ: ۳،۲)

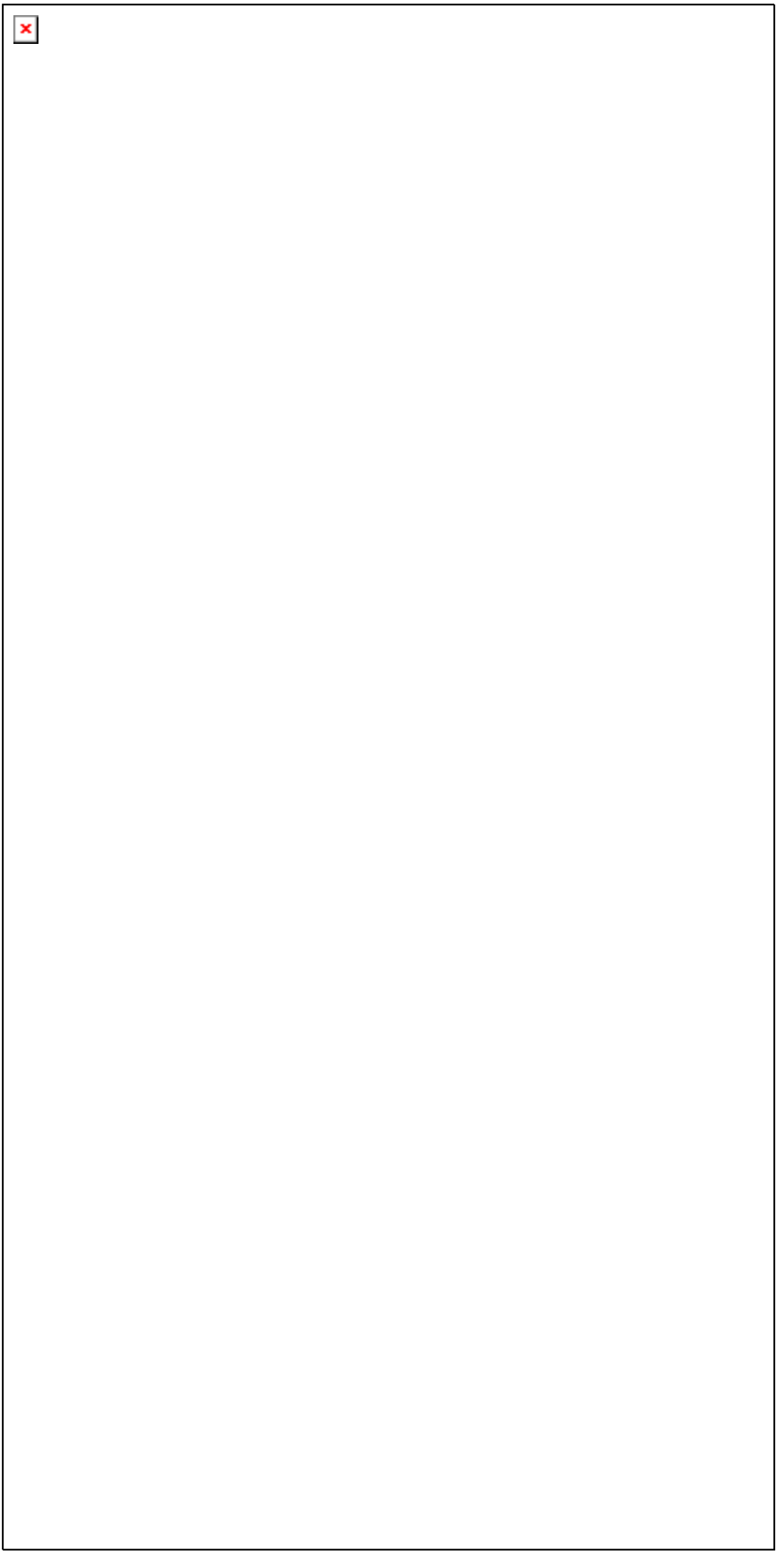
تو اپنے بزرگ پروردگار (رب عظیم) کے نام کی تسبیح کر۔

سبح اسم ربک الاعلی (حج: ۱۰)

اپنی برتر رب (رب اعلیٰ) کے نام کی تسبیح کر۔

آنحضرت ﷺ کی زبانی تعلیم کے مطابق پہلا حکم رکوع میں اور دوسرا سجدے میں ادا ہوتا ہے(۱)۔۔

قیام، رکوع اور سجود کی یہ ترتیب سورہ حج (۴۔ ذکر ابراہیم) اور آل عمران (۵۔ ذکر مریم) سے اور یہ امر کہ سجدہ پر ایک رکعت تمام ہوتی ہے سورہ نساء (۱۵۔ ذکر نماز خوف) سے ثابت ہے، درحقیقت ارکان کی یہ ترتیب بالکل فطری اور عقلی ہے۔ پہلے کھڑا ہونا، پھر جھک جانا، پھر سجدے میں گر پڑنا، اس میں خود طبعی اور فطری ترتیب ہے، تعظیم کی ابتدائی اور کثیر الوقوع شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کھڑا ہو جاتا ہے، جب کیفیات اور جذبات میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جھک جاتا ہے اور جب فرط بےخودی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اپنے بلند ترین حصہ جسم (یعنی پیشانی) کو اپنے



جائے تو ہر فرد سے فرائض الٰہی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے جن پر کبھی عمل نہ ہوتا اور عجب نہیں کہ افراد کی طبعی سستی اور سہل انگاری ان پورے احکام کی تعمیل میں مانع آتی، سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانوں کی عبادات کی واحد اور منظم شکل پیدا نہ ہوتی نہ جماعت ہوسکتی اور نہ نماز کو ایک مذہب کی عبادت خاص کہا جا سکتا اور نہ جماعتی رمز و شعار کی وحدت کی شان اس سے پیدا ہو کر مسلمانوں کی واحد امت بناتی اور بتاتی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعے اپنے رسول کو اس عبادت کی عملاً تعلیم دی (۱)۔ اور رسول نے امت کو سکھایا اور امت نے نسلاً بعد نسل موجودہ اور آیندہ نسل کو سکھایا اور اس پورے تواتر عمل کے ساتھ جس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں، وہ آج تک محفوظ ہے۔

نماز کی دعا::

نماز کی مختلف حالتوں میں ان حالتوں کے مطابق مختلف دعائیں پڑھی جاتی ہیں اور پڑھی جا سکتی ہیں، خود آنحضرت ﷺ سے نماز کی مختلف حالتوں کی بیسیوں دعائیں مروی ہیں اور ہر مسلمان ان میں سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے لیکن نماز کی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے جس کی نماز میں پڑھنے کی تاکید آنحضرت ﷺ نے فرمائی ہے جس کو آپ ﷺ نے تمام عمر نماز کی رکعت میں پڑھا ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہیں، وہ سورہ فاتحہ ہے جو مقاصد نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور محیط ہے اسی لئے وہ اسلام میں نماز کی اصلی دعا ہے، یہ وہ دعا ہے جو خدا نے بندوں کی بولی میں اپنے منہ سے ادا کی:

الحمد لله رب العالمين الرحمن الرحيم ملك يوم الدين اياك نعبدو ا و اياك نستعين اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير

المغضوب علیھم ولا

حمد ہو اس اللہ کی جو سب جہانوں کا پروردگار ہے' رحم والا
مہربان ہے' ہمارے عمل کے بدلے کے دن کا مالک (ہے)
(اے آقا) ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں تو
ہم کو راستہ سیدھا پر چلا' ان کا راستہ

(۱)۔ ممموطا امام مالك و صحیح بخاری کتاب الصلوہ۔

الضالین (فاتحہ:۱)

جن پر تو نے فضل کیا' ان کا راستہ نہیں جن پر غضب آیا اور نہ ان کا جو بہک گئے۔
(اس دعا کو ختم کر کے آمین کہتے ہیں' یعنی اے خدا تو اس کو قبول کر)

یہ وہ دعا ہے جس کو ہر مسلمان ہر نماز میں دہراتا ہے جس کے بغیر ہر نماز نا تمام اور ادھوری رہتی ہے (۱)۔۔ یہ دعا اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے' خدا کی حمد وستائش ہے' توحید ہے' اعمال کی جزا اور سزا کا یقین ہے' عبادت کے مخلصانہ ادا کا اقرار ہے' توفیق وہدایت کی طلب ہے' اچھوں کی تقلید کی آرزو اور بروں کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے جس وقت اس حمد میں خدا کی پہلی صفت ''کل جہانوں کا پروردگار'' زبان پر آتی ہے تو اسکی تمام قدرتیں اور بخششیں جو زمین سے آسمان پر پھیلی ہیں سب سامنے آجاتی ہیں۔ ''جہانوں) کی وسعت کے تخیل سے اسکی عظمت اور کبریائی کی وسعت کا تخیل پیدا ہوتا ہے۔ ''سارے جہانوں کے ایک ہی پروردگار'' کے تصور سے کل کائنات ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے' انسان ہوں کہ حیوان' چرند ہوں کہ پرند' پھر انسانوں میں امیر ہوں یا غریب' مخدوم ہوں یا خادم' بادشاہ ہوں یا گدا' کالے ہوں یا گورے' عرب ہوں یا عجم' کل مخلوقات' خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکساں معلوم ہوتی ہے' خدا کو ''رحمان و رحیم'' کہہ کر پکارنے سے اسکی بے انتہا رحمت' بے پایاں شفقت' غیر محدود بخشش اور نا قابل بیان

کیف محبت کو سمندر دل کے کوزہ میں موجیں مارنے لگتا ہے ''روز جزاء کے مالک'' کا خیال ہم کو اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے باخبر اور خدا کے جلال و جبروت سے مرعوب کر دیتا ہے۔ ''ہم تجھی کو پوجتے ہیں'' کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے ہیں ''ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں'' بول کر ہم تمام دنیاوی سہاروں اور بھروسوں کو ناچیز سمجھتے اور صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور سب سے بے نیاز ہو کر اسی ایک کے نیازمند بن جاتے ہیں۔ سب سے آخر ہم اس سے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں' یہ سیدھی راہ (صراط مستقیم) کیا ہے؟ اسکی شریعت کے احکام ہیں:

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم الا تشرکوا به شیا و بالوالدین احسانا ولا تقتلوا اولادکم من املاق نحن نرزقکم وایاهم ولا تقربوا الفواحش ما ظهر منها و ما بطن ولا تقتلوا النفس التی حرم الله الا بالحق ذالکم وصکم به لعلکم تعقلون ولا تقربوا مال الیتیم الا بالتی هی احسن حتی یبلغ اشده و اوفوا الکیل و المیزان بالقسط لا نکلف نفسا الا وسعها و اذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربی و بعهد الله اوفوا ذلکم وصکم به لعلکم تذکرون و ان هذا صراطی مستقیما فاتبعوه (انعام: ۱۹)

کہہ دے (اے پیغمبر)! آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے' یہ کہ اس کے ساتھ شرک نہ کرو' ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو' غربت کے سبب اپنی اولاد کو قتل مت کرو' ہم تم کو اور ان کو روزی دیتے ہیں' بے حیائی کی

باتوں کے نزدیک نہ جاؤ خواہ وہ ظاہر میں (فحش) ہوں یا باطن میں، جس جان کو خدا نے محترم کیا ہے، اس کو مت مارو لیکن انصاف کے ساتھ یہ وہ باتیں ہیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے شاید کہ تم سمجھو اور یتیم کے مال کے پاس مت جاؤ لیکن اچھی نیت سے یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے اور ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا رکھو، ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ حکم نہیں دیتے، جب تم بات بولو تو انصاف

(۱) ۔ جامع ترمذی، قرات فاتحہ۔

کی، گو وہ تمہارا عزیز ہی کیوں نہ ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو، یہ وہ باتیں ہیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو اور بے شبہ یہی ہے میرا سیدھا راستہ (صراط مستقیم) تو تم اسی کی پیروی کرو۔

ان آیات نے واضح کر دیا کہ وحی محمدی کی اصطلاح میں ''صراط مستقیم'' کیا ہے یعنی شرک نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے بچنا، معصوم اور بے گناہ جانوں کی عزت کرنا (ناحق قتل نہ کرنا) یتیم کے ساتھ احسان، ناپ تول میں ایمانداری، بلا رو رعایت سچ بولنا، اور عہد کو پورا کرنا، یہ وہ صفات عالیہ ہیں جن کو ''صراط مستقیم'' کی مختصر سی ترکیب توصیفی میں ہم خدا سے روزانہ مانگتے ہیں، جو اخلاق کا جوہر اور نیکی کی روح ہے۔

یہی وہ صفات حسنہ ہیں جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے جن پر اس کا فضل و انعام ہوا یہ خاص بندے کون ہیں؟ قرآن پاک نے اس کی تشریح بھی خود کر دی ہے:

ومن یطع اللہ والرسول فاولیک مع الذین انعم اللہ

علیہم من النبین و الصدیقین و الشہدا و الصالحین و حسن اولئک رفیقا (نساء: ۹)

اور جو خدا اور اس کے رسول کے حکم پر چلتے ہیں تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن پر خدا کا فضل اور انعام ہوا' یعنی نبی' صدیق' شہید اور صالح لوگ ان کی رفاقت کیسی اچھی ہے۔

اس بنا پر ہر نمازی جس صراط مستقیم اور راہ راست کے لئے دعا کرتا ہے وہ نیکی کی وہ شاہراہ ہے جس پر خدا کے تمام نیک بندے (انبیاء صدیقین' شہداء اور صالحین) علی قدر مراتب چل سکے۔

سیدھے راستہ سے ہٹنا دو طرح سے ہوتا ہے (۱) افراط (زیادتی کے سبب سے) (۲) تفریط (کمی) کے سبب سے' افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت میں ہم اپنی طرف سے بدعتوں کا اضافہ کریں' یہ گمراہی ہے اور تفریق یہ ہے کہ خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دیں' اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے اور ہر قسم کا انعام و اکرام چھین لیا جاتا ہے' پہلی صورت کی مثال نصاری ہیں جنھوں نے دین میں اپنی طرف سے ہزاروں باتیں اضافہ کر دیں' دوسری کا نمونہ یہود ہیں جنھوں نے احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اور ہر قسم کے انعام و اکرام سے محروم ہو گئے۔ مسلمانوں کی یہ دعا ہے کہ الٰہی ہم کو ان دونوں غلط راستوں سے بچانا اور اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھنا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی یہ دعا (سورہ فاتحہ) دین و دنیا کی دعاؤں کی جامع' جسم و روح کی نیکیوں پر مشتمل اور اخلاق اور ایمان کی تعلیمات کو محیط ہے' اس میں خدا کی حمد بھی ہے اور بندے کی التجا بھی' اسی لئے آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے اس کی نسبت فرمایا:

''جو نماز میں اس سورہ کو نہ پڑھے' اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہے' خدا فرماتا ہے کہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے' آدھی میرے

لئے ہے اور آدھی اس کے لئے' بندہ جب الحمدللہ رب العالمین (حمد ہو سارے جہانوں کے پروردگار) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے ''میرے بندہ نے میری ستائش کی'' پھر جب وہ الرحمن الرحیم (مہربان رحم والا) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے ''میرے بندہ نے میری تعریف کی'' پھر وہ کہتا ہے مالک یوم الدین (نیک و بند کی جزا کے دن کا مالک) تو خدا فرماتا ہے ''میرے بندہ نے میری بڑائی ظاہر کی'' اتنا میرا حصہ ہے اور میرے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک یہ ہے کہ ''ایاک نعبدو ایاک نستعین (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) اور اس کے بعد آخر تک (کہ ہم کو صراط مستقیم دکھا) میرے بندہ کی دعا ہے اور میرے بندہ نے جو مانگا وہ اس کو ملا (۱)''۔

اس حدیث قدسی کے آئینہ میں اسلامی نماز کی اس دعا کو جو دلکش و دلفریب نظارہ نظر آتا ہے وہ روح میں نشاط اور دل میں سرور پیدا کرتا ہے' یہ وہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندلا سا تصور' ایک عیسائی یورپین فاضل اے جی ویننک کو بھی جس نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں اسلامی نماز پر ایک پر معلومات مضمون لکھا ہے تھوڑی دیر کے لئے ہو جاتا ہے وہ لکھتا ہے:

''(اسلام کی رو سے) نماز حضور قلب کے ساتھ ادا ہونی چاہئے ایک دفعہ محمد ﷺ نے ایک پر نقش و نگار کپڑے کو اس لئے اتار دیا کہ اس سے نماز میں توجہ بٹتی ہے' یہ واقعہ کہ نماز صرف ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہیں بلکہ اس میں دلی خضوع و خشوع کی بھی ضرورت ہے' اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے جس میں محمد ﷺ نے کہا ہے کہ مجھے تمہاری دنیا کی دو چیزیں پسند ہیں' خوشبو اور عورت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے'' محمد ﷺ پر نمازوں میں گریہ طاری ہو جانا بھی بعض اوقات منقول ہے' نماز کی ایک سب سے اعلیٰ خصوصیت وہ ہے جس کو ہم ان دو حدیثوں میں پاتے ہیں جن میں بیان ہے کہ ''نماز خدا سے سرگوشی اور مکالمہ ہے'' اور اس کی تشریح ہم کو اس حدیث قدسی میں ملتی ہے کہ ''سورہ الحمد میرے اور میرے بندہ کے درمیان بٹی ہوئی

ہے(۲)۔''۔

اس دعائے محمدیؐ کا موازنہ دوسرے انبیاء کی منصوص دعاؤں سے::

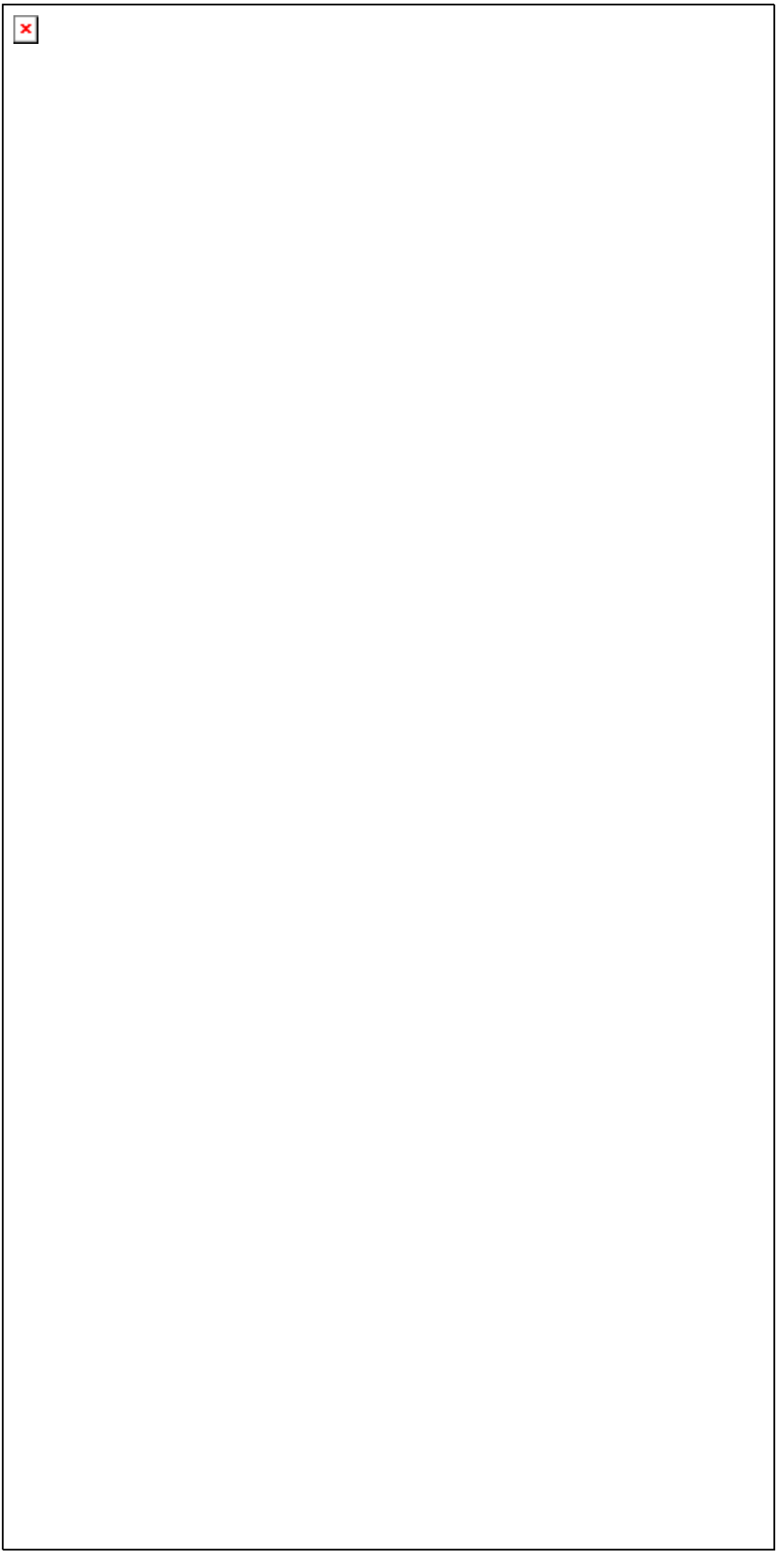
دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور نماز میں پڑھنے کے لئے کوئی دعا تعلیم نہ کی گئی ہو' کوہ طور پر جلوہ ربانی کے وقت حضرت موسٰیؑ نے نماز میں جو دعا پڑھی تھی وہ تورات کی کتاب خروج میں موجود ہے' زبور تو شروع سے آخر تک دعاؤں کا مجموعہ ہی ہے مگر اس میں ایک خاص دعا پر یہ عنوان بھی لکھا نظر آتا ہے کہ ''داؤد کی نماز'' انجیل میں حضرت عیسٰیؑ اپنی وداعی شب میں حواریوں کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہیں جو آج تک عیسائیوں کی نماز کا اصلی جزو ہے' ان دعاؤں کو سامنے رکھ کر محمدؐ کی زبان وحی ترجمان کے ذریعہ سے آئی ہوئی دعا کی تاثیری کیفیت حسن تدبیر' جامعیت' پاکیزگی اور اختصار کا اندازہ ہوگا اور پتہ چلے گا کہ اس کی کیا بے مثالی ہے جس کے سبب سے نمازوں میں پڑھنے کیلئے اسی کا انتخاب ہوا؟ اسی لئے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے اس کی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت ابی بن کعب سے فرمایا تھا کہ ''نماز میں جو سورہ تم پڑھتے ہو یعنی ام القرآن' قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نہ تورات میں اتری نہ انجیل میں' نہ زبور میں اور نہ اس کے مثل کوئی دوسری چیز' خود قرآن میں موجود ہے(۳)۔'' اس حدیث کی صحت اور صداقت کا یقین خود ان دعاؤں پر ایک نظر ڈالنے سے ہوگا۔

---

(۱)۔ جامع ترمذی تفسیر فاتح و مسند اب حنبل ج ۲' ص ۴۶۰ مصر۔ (۲)۔ یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے۔ (۳)۔ جامع ترمذی' فضائل سورہ فاتحہ۔

حضرت موسٰیؑ کی نماز کی دعا::

تورات کی کتاب الخروج میں ہے کہ جب حضرت موسٰیؑ تورات لینے اور ربانی تجلی کا



اے خداوند! ''مجھ کو اپنی راہ دکھا' میں تیری سچائی میں چلوں گا' میرے دل کو یکطرفہ کر' تا کہ میں تیرے نام سے ڈروں' اے خداوند! میرے خدا! میں اپنے سارے دل سے تیری ستائش کروں گا اور ابد تک تیرے نام کی بزرگی کروں گا کہ تیری رحمت مجھ پر بہت ہے اور میری روح کو اسفل پاتال سے نجات دلا' اے خدا! مغروروں نے مجھ پر چڑھائی کی ہے اور کٹر لوگوں کی جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے اور انہوں نے مجھ کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں رکھا لیکن تو اے خداوند! خدا رحیم و کریم اور برداشت کرنے والا ہے اور شفقت اور وفا میں بڑھ کر ہے' میری طرف توجہ ہو اور مجھ پر رحم کر' اپنے بندہ کو اپنی توانائی بخش اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو نجات دے مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا تا کہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہیں دیکھیں اور شرمندہ ہوں کیونکہ تو نے اے خداوند! میری مدد کی اور مجھے تسلی دی''۔

اس دعا میں بھی وہی خدا کی حمد و صفت اور توحید و عبات کا ذکر' راہ راست کی ہدایت کی طلب اور شریروں اور گمراہوں سے بچائے جانے کی درخواست ہے' لیکن طول' تکرار اور دعا مانگنے والے شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب سے یہ ہر انسان کی دعا نہیں بن سکتی اور نہ اس کا طول اس کو ہر وقت کی نماز میں پڑھے جانے کی سفارش کرتا ہے۔

انجیل میں نماز کی دعا::

حضرت عیسیٰؑ حواریوں کو دعا اور نماز کے آداب بتا کر یہ دعا تعلیم کرتے ہیں :

''اے ہمارے باپ! جو آسمان پر ہے تیرا نام مقدس ہو' تیری بادشاہت آوے' تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی پوری ہو' ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قرض ہمیں معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قرض داروں کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں مت ڈال بلکہ برائی سے بچا کیونکہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرا ہی ہے''۔ آمین۔

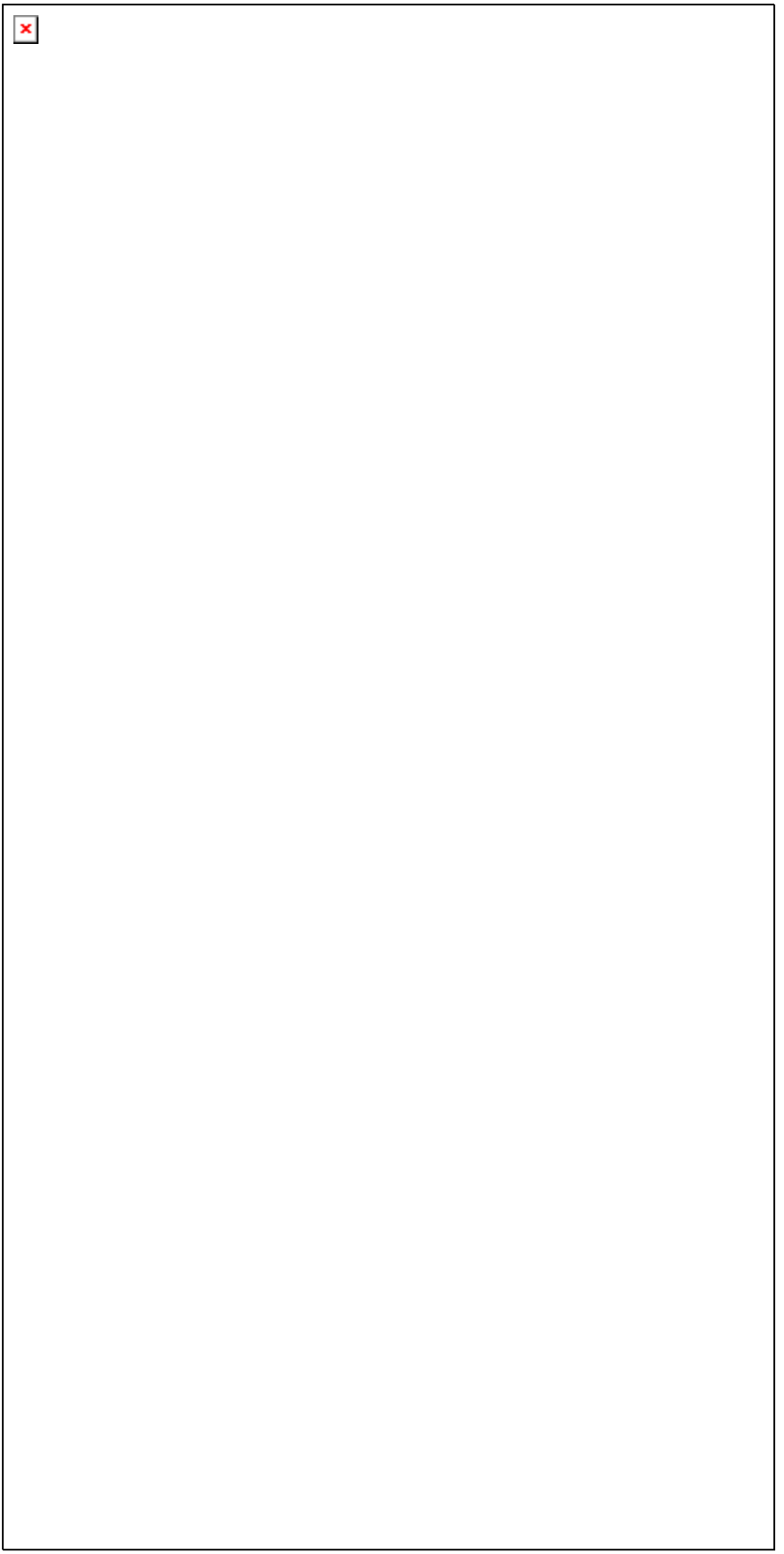
نام کی تقدیس ''خدا کی حمد'' بادشاہت کے آنے سے مقصود شاید قیامت اور اعمال کے فیصلہ کا دن ہے جو دعائے قرآنی میں **ملک یوم الدین** کے لفظ سے ادا ہوا ہے' نیز استعارہ کی زبان میں ''روز کی روٹی'' سے مراد دنیاوی روٹی نہ لی جائے بلکہ روح کی غذا یا صراط مستقیم لی جائے اور ''قرض'' سے مراد فرائض اور حقوق لئے جائیں جو خدا کی طرف سے انسانوں پر عائد ہیں ''آزمائش'' میں نہ پڑنے اور ''برائی'' سے بچنے کے معنی وہی لئے جا سکتے ہیں جو اسلامی دعا کا خاتمہ میں مذکور ہے کہ ''یہ ان کا راستہ ہے جن پر تیرا غضب آیا اور جو سیدھے راستہ سے بہک گئے ہیں''۔

اس تشریح سے مقصود یہ ہے کہ یہ چاروں دعائیں جو چار اولوالعزم پیغمبروں کی زبان نبوت سے ادا ہوئیں' کسی قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہیں جو تکمیل دین کے مختلف مدارج میں کسی کو نظر آ سکتی ہے' دعائے محمدی ﷺ تکمیلی شکل کی آئینہ دار ہے وہ مختصر' تاثیر سے لبریز ہے' خدا کی تمام صفات کاملہ کا مرقع ہے' تمام مقاصد اور احکام شریعت کی جامع ہے' اس کے الفاظ میں ایسی عالمگیری ہے جو ہر وقت اور ہر حالت میں ہر انسان کی دل کی نمائندگی کر سکتی ہے' وہ ایسے استعارات سے پاک ہے جو ظاہر بینوں کی لغزش کا باعث ہوں' اور خدا کو انسانوں سے رحم و کرم کی صفت ''قرض'' لینے پر آمادہ کرتے ہیں' نیز وہ خدا کی رحمت عام کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے جس کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے' خدا کی وہ تین صفتیں جن کا تصور کئے بغیر خدا کا تصور پورا نہیں ہو سکتا (یعنی ربوبیت' رحمت اور مالکیت) یہ سورہ ان سب کی جامع ہے' ربوبیت میں وہ تمام صفتیں داخل ہیں جن کا تعلق پیدائش سے لے کر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے' رحمت اس کی وہ عالمگیر صفت ہے جس میں اس کی تمام جمالی صفتوں کی نیرنگیاں ظاہر ہوتی ہیں' مالکیت اس کی تمام جلالی صفتوں کا مظہر ہے اور پوری سورہ دعا کے اغراض ثلاثہ حمد' اچھائیوں کے لئے درخواست اور برائیوں سے بچانے کی التجا پر مشتمل ہے' طرز بیان خدا اور بندہ کے

شایان شان ہے' درخواستیں حد درجہ مئودبانہ ہیں' اوصاف الٰہی وہی ہیں جو ایک دعا کے مناسب ہو سکتے ہیں' دعا میں عموم ہے وہ ذاتیات تک محدود نہیں ہے' للّٰہیت اور روحانیت کا کمال منتہائے نظر ہے' اس لئے دنیاوی چیزوں کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے' خدا کے اوصاف اور بندہ کی التجاؤں میں کمیت اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے تناسب موجود ہے یعنی دونوں حصوں نے مناسب کے ساتھ جگہ گھیری ہے اور دونوں ٹکڑوں کے مضامین میں ربط اور تعلق قائم ہے' خدا کے عظمت و جلال' رحم و کرم' قدرت وشوکت' شفقت و رافت اور بندہ کے خشوع و خضوع' بلند حوصلگی' صداقت طلبی کا ایسا جامع' مختصر اور پر اثر بیان' سورہ فاتحہ کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے۔

نماز کیلئے تعین اوقات کی ضرورت::

نماز کے سلسلہ میں اسلام کا ایک اور تکمیلی کارنامہ اوقات نماز کی تعیین ہے' ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا اس لئے کسی کام کے کرنے کے لئے وقت سے بے نیازی ممکن نہیں' اب سوال یہ ہے کہ نماز کے لئے خاص خاص اوقات کی تعیین ضرور ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد ﷺ جس دین کامل کو لے کر مبعوث ہوئے اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی ہے' محض نظری نہیں' اس نے نماز کی تعلیم دی تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات میں اس فرض کو ادا بھی کرے' انسان کی نفسی (سائیکولاجیکل) خصوصیت یہ ہے کہ جو کام مداومت کے ساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے جب تک وہ اس کے اوقات نہ مقرر کر لے کبھی وہ اس کی مستعدی کے ساتھ بلا ناغہ انجام نہیں دے سکتا اس لئے ہر منظم' باقاعدہ اور دوائمی عمل کے لئے اوقات کی تعیین ضروری ہے اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے باقاعدہ اور منظم کاموں کے لئے اختیار کیا ہے' اس میں اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لئے ۲۴ گھنٹوں کی مہلت ہے تو وہ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو



اوقات مقرر کر رکھے ہیں، ہندو آفتاب کے طلوع وغروب کے وقت پوجا پاٹ کرتے ہیں، زردشتی صرف طلوع آفتاب کے وقت زمزمہ خواں ہوتے ہیں، رومن کتھولک عیسائی صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے، پھر شام، کو پھر رات کو سوتے وقت دعا مانگے ہیں، یہودیوں میں تین وقت کی نمازیں ہیں جن کو ''تفلا'' کہتے ہیں، دانیال نبی کی کتاب میں ہے:

''جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہو گئے تو وہ اپنے گھر آیا اور اپنی کوٹھری کا دروازہ جو بیت المقدس کی طرف تھا کھول کر اور دن بھر میں تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر خدا کے حضور میں جس طرح سے پہلے کرتا تھا دعا اور شکرگزاری (حمد) کرتا رہا..... پر ہر روز وہ تین بار دعا مانگتا ہے''۔ (۶۔۱۰ تا گ ۱۴)

حضرت داؤدؑ کی زبور میں ان تین وقتوں کی تعیین ان لفظوں میں ملتی ہے:

''پر میں خدا کو پکاروں گا تب خدا مجھے بچا لے گا، شام کو اور صبح کو اور دوپہر کو میں فریاد کروں گا اور نالہ کروں گا سو وہ میری آواز سن لے گا''۔ (۵۵۔۱۷۱۶)

اسلامی اصطلاح میں ہم ان کو فجر، ظہر، اور مغرب کی نمازیں کہہ سکتے ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ نے دعاؤں اور نمازوں کی اہمیت اور زیادہ بڑھائی، لوقا کی انجیل میں:

''پھر اس نے (حضرت عیسیٰؑ نے) اس لئے کہ ان کو ہمیشہ دعا میں لگے رہنا اور سستی نہ کرنا، ضرور ہے ایک تمثیل کہی'' (۱۸۔۱)

حواریوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی شریعت میں بھی نماز کے کچھ اوقات وہی تھے جو یہودیوں میں تھے اور کچھ اور زیادہ تھے، ظہر کی نماز ان کے ہاں بھی تھی، چنانچہ اعمال میں ہے:

''پطرس دوپہر کے قریب کوٹھے پر دعا مانگنے گیا''۔ (اعمال ۱۰۔۹)

لیکن ان کے علاوہ بعض اوقات بڑھائے بھی گئے، ایک جگہ ہے:

''پس پطرس اور یوحنا ایک ساتھ دعا کے وقت تیسرے پہر ہیکل کو چلے''۔ (اعمال

(۳۔۱)

''یونانی میں تیسرے پہر کی بجائے ''نویں گھڑی کو'' لکھا ہے جس کو ہم عصر کہتے ہیں' پھر اسی وقت کی نماز کا ذکر (اعمال ۱۰۔۳) میں بھی ہے۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰؑ کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی' آپ نے بتائی اور فرمایا کہ دعا کا بہترین وقت آدھی رات ہے۔

''اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا' جب مانگ چکا' ایک نے اس کے شاگردوں میں سے اس سے کہا کہ اے خداوند! ہم کو دعا مانگنا سکھا' جیسا کہ یوحنا (حضرت یحییٰؑ) نے اپنے شاگردوں کو سکھایا اس نے ان سے کہا جب تم دعا مانگو تو کہو..... اس نے ان سے کہا' تم میں سے کون ہے جس کا ایک دوست ہو اور وہ آدھی رات کو اس کے پاس آ کر کہے اے دوست! مجھے تین روٹی ادھار دے''۔

(لوقا۔۱۱)

اس تمثیل میں حضرت عیسیٰؑ نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے چنانچہ جس شب کو انہیں گرفتار کیا گیا وہ ایک جماعت کے ساتھ اسی نماز تہجد میں مصروف تھے (لوقا ۲۲۔۳۹)

صبح کی نماز کا ذکر بھی انجیل میں موجود ہے' مرقس کے پہلے باب کی ۳۵ آیت میں ہے ''اور بڑے تڑکے پو پھٹنے سے پہلے وہ اٹھ کے نکلا اور ایک ویران جگہ میں گیا اور وہاں دعا مانگی (۱)۔'' بلکہ عربی ترجمہ سے جو براہ راست یونانی سے ہوا ہے (۲)۔۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ دوامًا اس وقت نماز پڑھا کرتے تھے چنانچہ اس میں اس آیت کا عربی ترجمہ یہ ہے وفی الصبح باکرا قام وخرج الی موضع خلا مکان یصلی ھناک یعنی وہ وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔

اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی کتابوں میں مذکور ہیں ہم جمع کر لیں تو وہی اسلامی نماز کے اوقات ہو جائیں گے جن میں سے صبح (فجر) دوپہر (ظہر) اور شام

(مغرب) کا ذکر زبور (۵۵۔۱۶۔۱۷۷) میں صبح کا مرقس (۱۔۳۵ میں، عصر کا اعمال (۳۔۱، ۳۰۱۰، ۳۰) میں ہے اور عشاء (رات) کی نماز کا لوقا (۱۱، ۲۲۔۳۹) میں!

نماز کیلئے مناسب فطری اوقات::

اصل یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ انسان فرشتوں کی طرح شب و روز صرف دعا و نماز میں مصروف رہتا مگر انسان کی فطری و نوعی ضرورتوں کے سبب ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا۔ اس لئے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لئے چند مناسب اوقات مقرر کر دیے۔ ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کاموں میں اپنی عمر کے یہ ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے، صبح کو بیدار ہوتا ہے، دوپہر تک کام کر کے تھوڑی دیر سستاتا ہے، پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے اور اس کو تمام کر کے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل میں دل بہلاتا ہے، شام ہوتی ہے تو گھر آ کر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لئے تیار ہوتا ہے، اسلامی نمازوں کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے، تا کہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی محسوب ہوں، نور ظہور کے وقت جب صبح کی نسیم سحری حی علی الصلوٰۃ کا نغمہ جانفزا سناتی ہے اور ہر شے کی زبان سے عالم کے صانع کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے، تو یہ وقت غافل انسانوں کے سر جھکانے کے لئے بھی نہایت موزوں ہے کہ کتاب زندگی میں حیات امروزہ کا ایک نیا ورق اس وقت کھلتا ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس دن کے کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدہ نیاز کا طغرا نقش ہو، اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے اور دوپہر تک اس میں مصروف رہتا ہے، دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کر کے آدمی تھوڑی دیر کے لئے آرام کرتا ہے، اس موقع پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ دن کا آدھا کام بخیر و خوبی ختم ہو گیا، پھر سہ پہر کے بعد جب اپنے اس دن کا کام ختم کر کے

سیر وتفریح اور ذاتی آرام کے کام شروع ہوتے ہیں تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے اس کے بعد شام ہوتی ہے اور دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہی' دن بھر کے کاموں کے بعد اب آرام وسکون کا دور شروع ہوتا ہے اس لئے ضرور ہے اس کا سرنامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو' پھر سوتے وقت جب انسان اپنی با احساس زندگی سے کچھ دیر کیلئے بے خبر ہونے لگتا ہے

(۱)۔ مطبوعہ لندن ۱۸۶۵ء (۲)۔ مطبوعہ مطبعہ ادبیہ بیروت ۱۸۸۶ء و مطبع آکسفورڈ ۱۸۹۰ء۔

تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لے کر اس جہان سے بے خبر ہو' کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی ان بند ہونے والی آنکھوں کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہو گا' اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ پہیے اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہیں۔

صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہیں' اسی لئے صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی' اسی طرح عشاء سے لے کر صبح تک کوئی فرض نماز نہیں ہے یہ وقت خواب راحت کے لئے موزوں ہے' ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمام تر انسان کے کام کے ہیں' انہیں کام کے اوقات کے شروع میں نماز پنج گانہ مقرر ہوئی ہے۔

اسلامی اوقات نماز میں ایک نکتہ::

اوقات نماز کی تعیین میں اسلام کے لئے ایک اور اصول کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے' دنیا کے شرکا نہ مذاہب کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے شریک کا سب سے بڑا مظہر جسد کائنات کا سب سے زیادہ تابناک چہرہ (آفتاب) ہے' ہندوستان' ایران' بابل' عرب' مصر' شام' روم' یونان ہر جگہ سورج کی پرستش کی جاتی تھی' جس کی روشنی قلوب انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی' آفتاب پرست قوموں میں آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات مقرر تھے' جب وہ صبح کو اپنے

شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ نمودار ہوتا ہے پھر جب وہ آہستہ مملکت نیمروز کو فتح کر کے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے' پھر شام کو جب وہ عالم کائنات سے رخصت ہو کر نقاب شب میں اپنا چہرہ چھپالیتا ہے۔

سب سے پہلا موحد جس نے آفتاب پرستی کو گل کیا (۱)۔ حضرت ابراہیم خلیلؑ تھے' ملت ابراہیمی میں نماز کے وہ اوقات مقرر کئے گئے جب ستارہ پرستوں کے خدائے اعظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہیں بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے' تاکہ یہ اوقات خود زبان حال سے شہادت دیں کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کی خلاف اس خدائے برحق کی عبادت ہے جس کے آستانہ کمال کے سجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داغدار ہے' دین محمدی ﷺ' ملت ابراہیمی کا دوسرا نام ہے' اس لئے اس میں بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے جو ملت ابراہیمی میں تھے' دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی کا یہ دیوتا (آفتاب) پردہ عدم میں روپوش ہوتا ہے' دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ کر انحطاط اور تنزل کی طرف جھکتا ہے' اس انحطاط اور تنزل کے بھی دو تین دور ہوتے ہیں' جب سر (سمت الراس) سے نیچے اترتا ہے جس کو زوال کہتے ہیں' جب آنکھوں کے دائرہ تقابل سے نیچے اترتا ہے جس کو عصر کہتے ہیں اور پھر جب دائرہ نظر (افق) سے نیچے گرتا ہے جس کو مغرب کہتے ہیں' آفتاب کے ان تینوں اوقات انحطاط میں ایک ایک نماز ادا ہوتی ہے' خوب اچھی طرح ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی قبر میں مدفون ہو جاتا ہے اس وقت عشاء کی نماز ادا کی جاتی ہے' اسی لئے قرآن پاک میں نماز کے اوقات کے ذکر میں آفتاب کے ڈھلنے اور تاریک ہونے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے:

اقم الصلوہ لدلوک الشمس الی غسق الیل و قران الفجر (بنی اسرائیل: ۹)

نماز کھڑی کر آفتاب کے انحطاط کے وقت' رات کی تاریکی

تک(ظہر،عصر،مغرب،عشاء) اور فجر کی نماز۔

(۱)۔ قرآن پاک سورہ انعام۔ ۱۹۔

تفصیل آگے آتی ہے۔

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام میں کوئی فرض نماز صبح سے دوپہر تک نہیں رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے بلکہ تمام نمازیں آفتاب کے ہر تدریجی انحطاط تنزل اور روپوشی کی اوقات میں ہیں نیز یہی سبب ہے کہ اسلام میں آفتاب نکلتے وقت اس کے عروج و کمال کے وقت اور اس کے ٹھیک ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے کہ یہ آفتاب پرستوں کی عبادت کے خاص اوقات ہیں (۱)۔۔

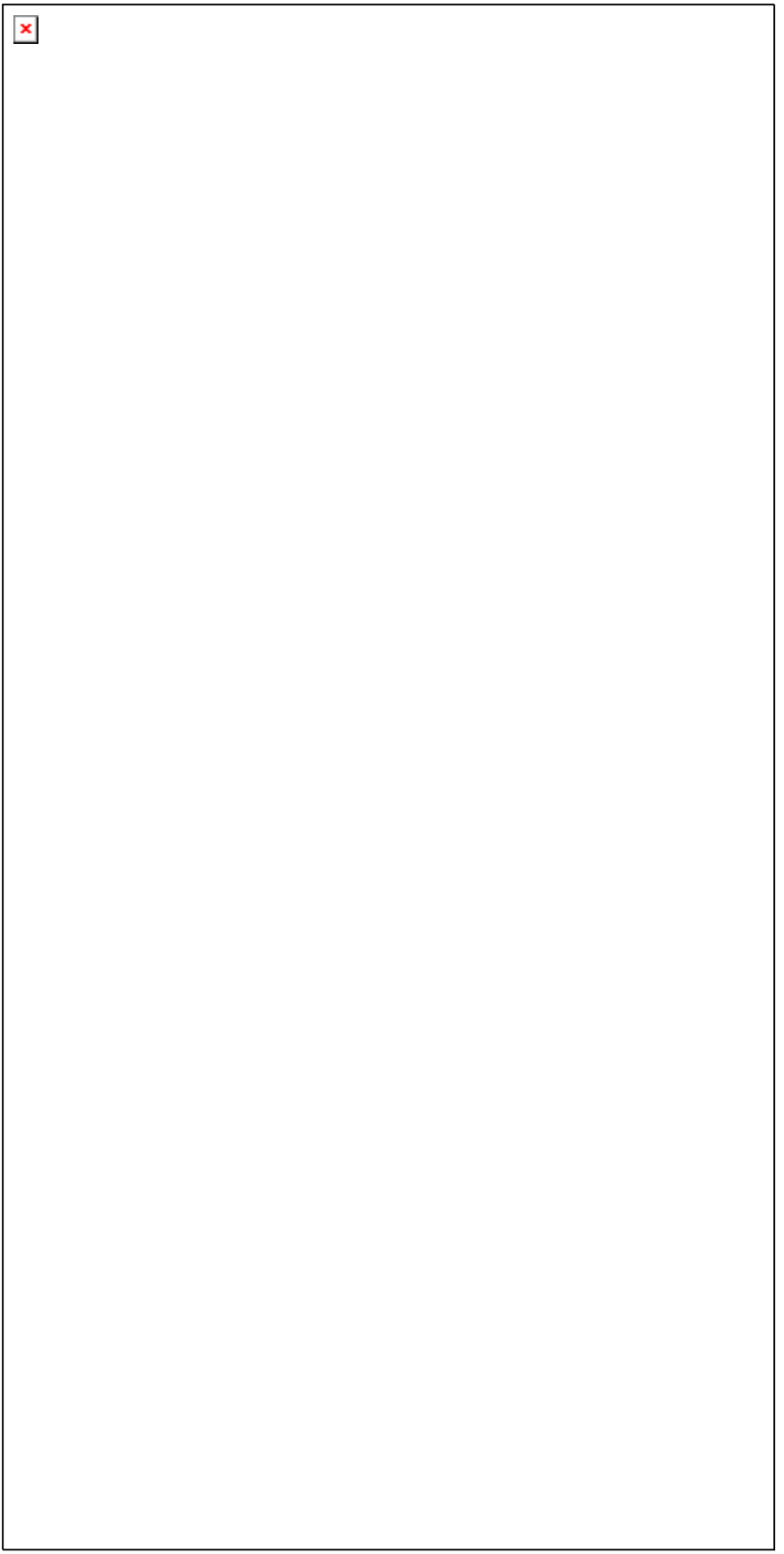
اسلام میں طریق و اوقات نماز::

نماز کس طرح اور کن کن اوقات میں اور کے کے رکعتیں کر کے پڑھنی چاہئے اور اس کے کیا آداب و شرائط ہیں ان سب کے لئے قرآن پاک میں ایک جامع آیت ہے جو لڑائی کی حالت میں نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلہ میں مذکور ہے:

حافظوا علی الصلوت الوسطی و قوموا للہ قانتین فان خفتم فرجالا او رکبانا فاذا امنتم فاذکروا اللہ کما علمکم مالم تکونوا تعلمون۔ (بقرہ: ۲۳۱)

نمازوں پر اور بیچ کی نماز پر پابندی کرو اور اللہ کے لئے (نماز میں) ادب سے کھڑے ہو پھر اگر (دشمنوں کا) خوف ہو تو پیادہ ہو کر یا سوار ہو کر (نماز پڑھو) پھر جب تم کو امن ہو جائے تو خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا جس سے تم پہلے واقف نہ تھے۔

اس آیت پاک سے یہ بات بتصریح ظاہر ہوتی ہے کہ ان باتوں کی کہ ہم کو نماز کس طرح اور کن اوقات میں اور کتنی رکعتوں کے ساتھ پڑھنی چاہئے، خود اللہ تعالیٰ نے



ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ نماز ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال میں معاف نہیں ہوسکتا اور اس کو ہمیشہ پابندی کے ساتھ، وقت پر اور اس کے سارے شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہئے۔

نماز کے اوقات مقرر ہیں::

اس کے بعد یہ مسئلہ ہے کہ نماز کے لئے اللہ تعالیٰ نے کچھ اوقات مخصوص فرمائے ہیں، ارشاد ہے:

ان الصلوہ کانت علی المئومنین کتابا موقوتا

(نساء: ۱۵)

بے شبہ نماز مسلمانوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے۔

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ہماری فرض نمازوں کے لئے اوقات مخصوص ہے۔

وہ اوقات کیا ہیں؟::

ادائے نماز کیلئے قرآن نے زیادہ تر تین لفظ استعمال کئے ہیں۔ صلوہت یا اقامت صلوہت، تسبیح اور ذکر اللہ۔ پہلا لفظ اقامت صلوہ نماز کیلئے مخصوص ہے لیکن دوسرا اور تیسرا لفظ عام تسبیح وتحمید اور یاد الٰہی کیلئے بولا جاتا ہے جس کا جزء اعظم تسبیح وتحمید ہے، احادیث میں بھی تسبیح کے معنی نماز پڑھنے کے ہیں (۱)۔ اور اشعار عرب (۲)۔ و لغت عرب (۳)۔ سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، قرآن میں جب اس لفظ (تسبیح) کے ساتھ وقت کی تخصیص ہوگی تو اس سے کسی شبہ کے بغیر نماز کے علاوہ کوئی اور چیز مراد نہیں ہوسکتی کیونکہ وقت مخصوص کے ساتھ اسلام میں نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہیں ہے، البتہ اوقات کی تخصیص کے بغیر قرآن نے جہاں تسبیح کا حکم دیا ہے اس سے خدا کی عام یاد وثنا وصیف مراد ہوسکتی ہے۔

اس تمہید کے بعد حسب ذیل آیتوں پر نظر کرنی چاہئے:

(۱) قم الیل الا قلیلا نصفه او انقص منه او زد علیه و

رتل القران ترتيلا (مزمل: ۱)

(۱) رات کو کھڑا رہا کر مگر کچھ کم یا آدھی رات یا اس سے کچھ گھٹا دے یا بڑھا لے اور قرآن (اس میں) ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔

(۲) و سبح بحمد ربك بالعشي و الابكار (مومن: ۲)

(۲) اور اپنے رب کی حمد سہ پہر اور صبح کو کر۔

(۳) و سجوه بكره و اصيلا (احزاب: ۲)

(۳) اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو کیا کرو۔

(۴) و تسجوه بكره و اصيلا (فتح: ۱)

(۴) اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو بیان کرو۔

(۵) و اذكر ربك في نفسك تضرعا و خيفه و دون الجهر من القول بالغدو و الاصال و لا تكن من الغافلين (اعراف: ۲۴)

(۵) اور تو اپنے پروردگار کو اپنے دل میں گڑگڑا کر اور پست آواز میں، صبح کو دوپہر کو یاد کر اور بھولنے والوں میں سے نہ ہو۔

(۶) ولا تطرد الذين يدعون ربهم بالغداه و لعشي (انعام: ۶)

(۶) اے رسول! ان کو مت نکال جو اپنے پروردگار کو صبح کو اور سہ پہر کو پکارتے ہیں۔

---

(۱)۔ صحيح مسلم باب الضحى، ما رايت رسول يصلى سبحته الضحى قط و انى لاسبحها۔ نيز صحيح مسلم، باب جواز، النافلته على الدبه باب و كنت اسبح فقام قبل ان اقضى سبحتى۔ (۲)۔ اعشى كا شهر هے وسبح على حين العشيات و الضحى۔ ولا تحمد الشيطان و الله فاحمد، شعراء الجاهليه، ج ۳، ص ۲۶۵۔ (۳)۔ لسان العرب، ج ۳،

(۷)فی بیوت اذن اللہ ان ترفع و یذکر فیھا اسمہ یسبح لہ فیھا بالغدو و الاصال رجال الخ الایتہ (نور: ۵)

(۷) ان گھروں میں جن کے بلند کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے اور ان میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور ان میں وہ لوگ جن کو دنیا کا کاروبار خدا سے غافل نہیں کرتا' صبح اور سہ پہر کو خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں۔

(۸)واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغدہ والعشی (کہف: ۴)

(۸) اور تو (اے رسول) اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رہ جو اپنے پروردگار کو صبح اور سہ پہر کے وقت پکارتے ہیں۔

(۹)وسبح بحمد ربک حین تقوم و من الیل فسبحہ وزدبار النجوم (طور: ۲)

(۹) اور تو اپنے پروردگار کی حمد کی پاکی بیان کر' جب تو اٹھتا ہے اور رات کے کچھ حصہ میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت

(۱۰)و اقم الصلوہ طرفی النھار و زلفا من الیل (ہود: ۱۰)

(۱۰) اور نماز قائم کر دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں۔

(۱۱)و اقم الصلوہ لدلوک الشمس الی غسق الیل

و قران الفجر ان قران الفجر کان مشہودا و من الیل فتہجد بہ نافلہ لک (بنی اسرائیل: ۹)

(۱۱) نماز قائم کر آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کے ابتدائی تاریکی تک اور فجر کا پڑھنا' بیشک فجر کا پڑھنا پر حضور ہے اور رات کو کچھ دیر جاگ کر مزید نماز پڑھ (تہجد)

(۱۲)واذکر اسم ربک بکرہ و اصیلا و من الیل فا سجد لہ و سجہ لیلا طویلا (دہر: ۲)

(۱۲) اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر صبح کو اور سہ پہر کو اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور بڑی رات تک اس کی تسبیح کر

(۱۳)فاصبر علی مایقولون وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس و قبل غروبہا و من اناء الیل فسبح و طواف النہار لعلک ترضی (طہ: ۸)

(۱۳) کافروں کے کہے پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ' آفتاب کے نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ حصوں میں اس کی تسبیح پڑھ اردن کے کناروں میں تا کہ تو خوش رہے۔

(۱۴)فسبحان اللہ حین تمسون و حین تصبحون ولہ الحمد فی السموات و الارض و عشیا و حین تظہرون (روم: ۲)

(۱۴) تو خدا کی تسبیح پڑھو جب شام کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمانوں اور زمین میں اور سہ پہر کو اور جب تم دوپہر کرو۔

(۱۵)فاصبر علی مایقولون وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس و قبل الغروب و من الیل فسجه و ادبار السجود (ق: ۲)

(۱۵) تو ان کافروں کے کہے پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور ڈوبنے سے پہلے اور کچھ رات میں تسبیح پڑھ اور ڈوبنے کے بعد۔

(۱۶)من قبل صلوه الفجر و حین تضعون ثیابکم من الظهیره و من بعد صلوه العشاء (نور: ۸)

(۱۶) فجر کی نماز سے پہلے اور جب دوپہر کی گرمی کے سبب سے کپڑے اتارتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد۔

ان اوپر کی آیتوں میں نماز کے مختلف اوقات کا ذکر ہے' ان میں سے بعض مکرر ہیں اور بعض نہیں' مکرر اوقات کو ملا دینے کے بعد یہ وہی پانچ وقت ہو جاتے ہیں جن میں رسول ﷺ تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے اور آپ ﷺ کے بعد آپ کے صحابہ اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام روئے زمین کے مسلمان نسلاً بعد نسلاً ادا کرتے آئے ہیں اور جن کے مشہور نام فجر' ظہر' عصر' مغرب اور عشاء ہیں۔ غدوۃ' بکرہ' فجر' قبل طلوع شمس اور حین تصبحون کے معنی صبح کی نماز' اصیل' عشی' اور قبل غروب شمس سے مراد عصر' لوک الشمس (زوال) اور حین تظہرون (جب دوپہر کرو) سے مقصد ظہر' طرف النہار (دن کا کنارہ) اور تمسون (جب شام کرو) سے مراد مغرب اور من آنائی الیل (کچھ رات گزرے) غسق الیل (رات کی ابتدائی تاریکی) اور صلوہ العشاء سے مقصود عشاء کی نماز ہے اور یہی نماز کے پانچ اوقات ہیں جن میں خدا کی یاد تسبیح و تحمید کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔

اوقات کی تکمیل

نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل::

اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے کہ کس غربت' مظلومی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا تھا' اس لئے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی' لوگ صرف رات کو کہیں ادھر ادھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے' سورہ مزمل میں جو مکہ کی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے یہ آیتیں آئی ہیں:

یایھا المزمل قم الیل الا قلیلا نصفه او انقص منه قلیلا اوزد علیه ورتل القران ترتیلا انا سنلقی علیك قولا ثقیلا ان ناشئه الیل ھی اشد وطا و اقوم قیلا ان لك فی النھار سجا طویلا (مزمل: ۱)

اے کملی اوڑھ کر سونے والے! تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات اٹھ کر نماز پڑھا کر' آدھی رات تک یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ' ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں (شریعت کے مفصل احکام اتارنے والے ہیں) بیشک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے میں طمانیت قلب کا زیادہ موقع ہے اور قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لئے زیادہ مناسب ہے' بے شبہ تجھ کو دن کی وقت آرام کی فرصت حاصل ہے۔

نماز کا یہ طریقہ غالبًا تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت برملا نہیں دی جاسکتی تھی کیونکہ جہاں

و انذر عشیرتك الاقربین (شعراء: ۱۱)

(اپنے قریب کے اہل خاندان کو ہوشیار کرو) کے ذریعہ سے

دعوت کے اعلان کا حکم آیا ہے' وہی یہ بھی اس کے بعد مذکور ہے۔

و توکل علی العزیز الرحیم الذی یزك حین تقوم و تقلبك فی الساجدین انه هو السمیع العلیم (شعراء: ۱۱)

اور غالب مہربان پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو اس وقت دیکھتا ہے جب تو (نماز کے لئے) اٹھتا ہے اور نمازیوں میں تیرا پھرنا (دیکھتا ہے) بے شک وہی سنتا اور جانتا ہے۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلان دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت ﷺ ان دشمنوں کے بیچ میں راتوں کو اٹھ کر خود نماز پڑھتے تھے اور مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز میں مصروف ہے اور کون سویا ہوا ہے' جس کو نماز کے لئے جگانا چاہئے ایسی پرخطر حالت میں آپ کا راتوں کو تن تنہا یہ فرض انجام دینے کے لئے نکلنا اس اعتماد پر تھا کہ خدا آپ کو خود دیکھ رہا ہے اور آپ کی حفاظت کر رہا ہے۔ اس کے بعد جب نسبتاً اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا اور رات کی طویل نماز (تہجد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشاء) اور تاروں کے جھلملاتے وقت بھی ایک ایک نماز (فجر) اضافہ کی گئی۔

واصبر لحکم ربك فانك باعیننا و سبح بحمد ربك حین تقوم و من الیل فسبحه و ادبار النجوم (طور: ۲)

اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کھینچ' بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر جب تو (رات کو تہجد کے وقت) اٹھتا ہے اور کچھ رات کے حصہ میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت۔

یہ آیت سورہ طور کے آخر میں ہے اور سورہ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی (۱)۔۔اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرت ﷺ کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا کیونکہ اس سورہ میں اسی آیت سے پہلے آپ کے مصائب اور ان پر صبر کرنے اور فیصلہ الٰہی کے انتظار کا حکم اور آپ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے' ابھی تک یہ رات کی نمازوں کی تفریق ہے' سورہ دہر میں جو جمہور کے نزدیک مکی ہے اور غالباً سورہ طور کے بعد اتری ہے انہیں معنوں کی ایک اور آیت ہے جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کی خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہیے اور بڑھتی ہے۔

فاصبر لحکم ربك ولا تطع منهم اثما او كفورا و اذكر اسم ربك بكره و اصيلا و من اليل فاسجد له و سبحه ليلا طويلا (دہر: ۲)

تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا انتظار کر اور ان مخالفوں میں سے کسی گنہگار یا اللہ کی ناشکرگزار کا کہنا نہ مان اور صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام لیا کر اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور رات کو دیر تک اس کی تسبیح کیا کر۔

اب رات کی دیر تک نماز تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے یعنی صبح' اخیر دن اور ابتدائی شب مگر ہنوز ''اصیل'' (۲)۔ میں ظہر و عصر اور ''من الیل'' (رات) میں مغرب اور عشاء کی تفریق نہیں ہوئی تھی کیونکہ کل تین نمازیں تھیں ایک فجر کے وقت ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو' اسی لئے ابھی تک باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا' جیسا کہ آیت بالا سے ظاہر ہے۔

اب یہ ان تین وقتوں کی ''تسبیح و تحمید'' باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہیں' حکم ہوتا ہے:

اقم الصلوه طرفی النهار (۳)۔ و زلفا من اليل (ہود:

(۱۰)

دن کے دونوں کناروں میں (یعنی فجر اور عصر) اور رات کے
ایک ٹکڑے میں نماز پڑھا کر۔

یہ آیت سورہ ہود کی ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہے اس میں اکثر انبیاء علیہم السلام کے متعلق یہ بیان کر کے کہ انہوں نے اپنی امت کو خدائے برحق کی عبادت کی دعوت دی، آنحضرت ﷺ کو بھی نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا اور غالباً نماز کے اوقات کی سلسلہ میں یہ پہلی آیت ہے جس میں ''تسبیح'' کے بجائے باقاعدہ ''صلوٰۃ'' کی اقامت کا حکم آیا ہے، اس وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۱)۔ صحیح بخاری تفسیر طور واقعہ جبیر بن معظم۔ (۲)۔ ''اصیل'' دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں۔ عام کتب لغت میں لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہو اسے اصیل کہتے ہیں، لسان العرب میں اصیل کے معنی عشی لکھے ہیں جو عصر کے لئے سورئہ روم میں استعمال ہوا ہے۔ (۳)۔ طرفی النہار کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں ادا کیا گیا ہے۔ قبل طلوع الشمس و قبل غروبہا، بالعشی و الابکار۔ بالغدو والاصال۔ اس میں پہلا طرف فجر، بکرہ اور غدو ہے، دوسرا طرف عصر، عیشی اور اصیل ہے۔

فاستقم کما امرت و من تاب معك ولا تطغوا (ہود:

(۱۰)

پس تو سیدھا چلا چل، جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے، اور وہ جنہوں
نے تیرے ساتھ توبہ کی (وہ بھی سیدھے چلیں) اور تم لوگ حد
سے آگے نہ بڑھو۔

اب رات کی طویل نماز کو چھوڑ کر تین نمازیں باقاعدہ فرض ہوتی ہیں، ایک دن کے ایک کنارہ میں یعنی رات کے خاتمہ کے قریب، تاروں کے جھلملاتے وقت، دوسری

دن کے دوسرے کنارہ میں دن کے خاتمہ کے قریب' اور تیسری رات کے ابتدائی حصہ میں' پہلی سے صبح کی نماز' دوسری سے عصر کی' جس کو پہلے اصیل کہا گیا تھا اور تیسری سے عشاء کی نماز مراد ہے ابھی تک دن اور رات کی نمازوں میں اجمال و ابہام تھا' دوسری میں ظہر وعصر' اور تیسری میں مغرب وعشاء کی نمازیں چھپی ہوئی تھیں' اب رات کی نمازیں سب سے پہلے علیحدہ ہوتی ہیں' سورہ ق میں جو مکی سورہ ہے' اللہ تعالیٰ اپنے اوقات خلق کو بیان کرنے کی بعد فرماتا ہے:

فاصبر علی مایقولون و سبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس و قبل الغروب و من الیل فسبحه و ادبار السجود

بس ان (مخالفوں) کے کہنے پر (اے رسول) صبر کر اور آفتاب (۱)۔ کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اس کے ڈوبنے (۲)۔ سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد و تسبیح کر اور کچھ رات (۳)۔ گئے پر (عشاء) اس کی تسبیح کر اور (آفتاب کے) سجدہ (۱)۔ کرنے کے بعد (غروب کے بعد یعنی مغرب کے وقت اس کی تسبیح کر)

صبر کی تلقین سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب کفار قریش ہنوز آپ کی ایذا و تحقیر کے درپے تھے' اس آیت پاک میں رات کی نماز کا ابہام دور کر کے مغرب اور عشاء کی تعیین کر دی گئی' ایک کی نسبت کہا گیا' ومن الیل (کچھ رات گئے) اور دوسری کی نسبت کہا گیا وادبار السجود (آفتاب کے ڈوبنے پر) اوقات نماز کی تفصیل کے سلسلہ میں رات سے آغاز اس لئے کیا گیا کہ یہ نسبتاً کفار سے محفوظ رہنے کا وقت تھا' زوال کے بعد سے غروب تک کی نماز جس کو پہلے اصیل اور پھر طرفی النہار (دن کے دونوں کناروں میں) اور یہاں ''قبل غروب'' کی نماز کہا گیا ہے' ہنوز تفصیل

طلب ہے، جس کے اندر ظہر وعصر دونوں نمازیں داخل ہیں، چنانچہ سورہ روم میں جو مکہ میں نازل ہوئی ہے اس کی تفصیل کی گئی ہے، اس سورہ کے اترنے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیوں کی شکست کامل کے بعد ہے جس کا زمانہ نبوت کے پانچویں، چھٹے سال سے لے کر آٹھویں نویں سال تک ہے۔

(۱)۔ آفتاب کا لفظ چونکہ پہلے آ چکا ھے اس لئے ادبار السجود سے ادبار الشمس مراد ھے جیسا کہ قبل الغروب سے قلب غروب الشمس مقصود ھے آفتاب کے سجدہ کرنے سے مراد اس کا ڈوب جانا ھے جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث میں ھے کہ غروب کے بعد آفتاب خدا کو سجدہ کرتا ھے۔ چونکہ آفتاب کے ڈوبنے کے لئے غروب کا لفظ پہلے آ چکا تھا اس لئے کلام کی فصاحت کا اقتضاء یہ تھا کہ اب اس کے لئے دوسرا لفظ لایا جائے چنانچہ اس معنی کیلئے سجود کا لفظ استعارہ لایا گیا سجود اصل میں زمین پر پیشانی رکھنے کو کہتے ھیں اور غروب کے وقت آفتاب کی یہی حالت ھوتی ھے اس طرز ادا سے آفتاب پرستوں کی تردید مقصود ھے اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے نماز کے لئے سجود شمس کا ذکر کیا کہ جس وقت آفتاب کا سر اپنے خالق کے آگے سجدہ میں ھو تو تم بھی اپنا سر اپنے خالق کے آگے جھکاؤ۔ تفسیروں میں حضرت علیؓ سے روایتیں ھیں کہ اس سے مراد مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتیں ھیں۔

فسبحان اللہ حین تمسون و حین تصبحون۔ ولہ الحمد فی السموات والارض و عشیا و حین تظہرون (روم: ۲)

اللہ کی تسبیح کرو جب شام (یا رات) کرو، اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمان اور زمین میں ہے اور اخیر دن کو اس کی تسبیح کرو اور جب ظہر کرو۔

اس آیت پاک میں زوال کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل (عصر) کی مبہم نمازوں کی توضیح کی گئی ہے ایک کو عشی (عصر) اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے، تمام آیتوں کو سامنے

رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر کا بالتصریح ذکر طٰہٰ' طور' دہر' ہود' ق' روم اور نور میں' ظہر کا بالا جمال' دہر' ق' طٰہٰ' اور اسراء میں اور بالتصریح اسراء اور روم میں' عصر کا بقرہ' دہر' ہود' طٰہٰ' ق اور روم میں' مغرب کا بالا جمال ہود' طٰہٰ اور روم میں اور بالتصریح ق میں' عشاء کا بصورت صلٰوۃ اللیل مزمل' طور اور دہر میں اور بصورت عشاء بالا جمال طٰہٰ' ہود اور روم میں اور بالتصریح ق اور ہود میں ہے' تمام نمازوں کا بالا جمال تذکرہ بقرہ' اسراء اور طٰہٰ میں ہے' طور سے فجر اور عشاء دو وقتوں کی نماز' اسراء' ہود اور طٰہٰ سے کم از کم بظاہر تین وقتوں کی' روم سے چار وقتوں کی (اگر مساء سے صرف مغرب مراد لیں) اور طٰہٰ اور روم سے پانچ وقتوں کی نماز ثابت ہے۔

ایک نکتہ

جمع بین الصلٰوتین::

اوپر کی آیتوں پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے' پہلی آیتوں میں ظہر اور عصر کی نمازیں مجمل ہیں' یعنی دونوں کو ایک لفظ ''قبل الغروب'' یا ''اصیل'' یا ''طرف النہار'' کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے' آخری آیت میں جو سورہ روم کی ہے' ظہر و عصر کی نمازوں کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے' مگر شام کی نماز میں اجمال ہے یعنی مغرب و عشاء دونوں کو حین تمشون (جب رات کرو) کے ذیعہ سے ادا کر دیا گیا ہے' اس لئے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علیحدہ بھی ہیں' اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے (۱)۔ ہیں اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علیحدہ ذکر کی گئی ہے۔ اس لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے' احادیث میں جمع بین الصلٰوتین کے عنوان سے آنحضرت ﷺ کی عملی مثالیں اس نکتہ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں۔

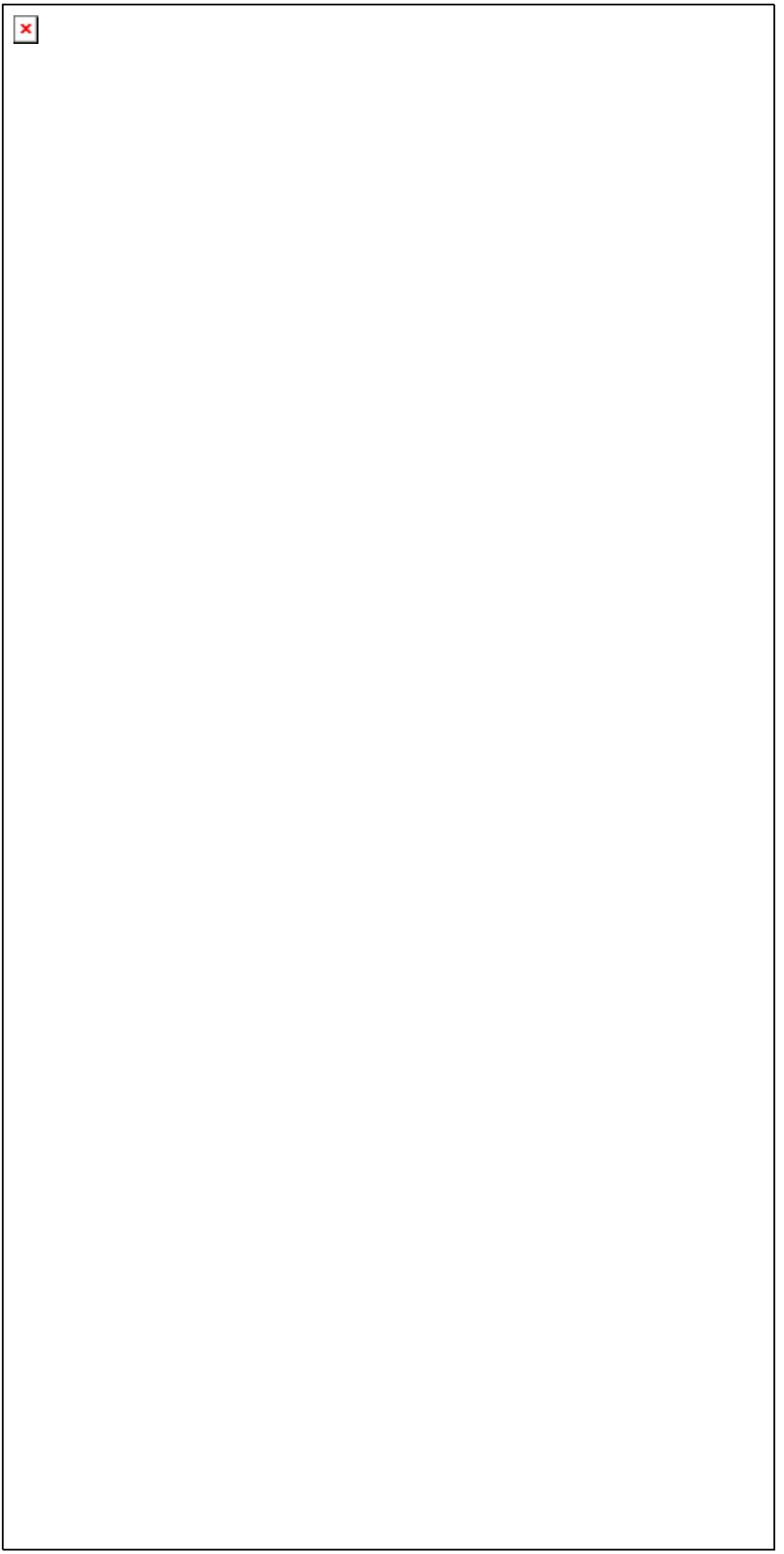
---

(۱)۔ مموطا امام مالك' مسلم' ترمذی باب القصر فی الصلوۃ فی

السفر والحضر' بعض مستشرقین کو جمع بین الصلوتین کی حدیثیں دیکھ کر یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ زمانئہ نبوی میں شاید تین وقت کی نمازیں ادا ہوتی تھیں (انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں فاضل کو بھی یہی شبہ ہوا ہے) (دیکھو اس کا مضمون صلوۃ) مگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ نمازیں ہمیشہ پانچ وقتوں کی ہوتی ہیں البتہ بضرورت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ ملا کر پڑھ لیتے ہیں۔ رکعتیں اتنی ہی رہتی تھیں' صرف وقت میں کمی ہو جاتی تھی' فقہاء میں باہم اس کے متعلق اختلاف ہے کہ دو دو نمازوں کو یکجا کن صورتوں میں پڑھا جا سکتا ہے' احناف کے نزدیک حقیقی طور سے صرف ایک موقع پر حج میں عرفات میں نو ذی الحجہ کو ظہر اور عصر دونوں ظہر کے وقت ادا کی جاتی ہیں کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص حج کی دعاؤں کیلئے بقیہ نمازوں میں حنفیہ کے نزدیک حقیقی یکجا نہیں بلکہ محض صورہ دو دو نمازیں ایک ساتھ ادا کی جا سکتی ہیں اس کی صورت یہ ہے کہ ایک نماز اخیر وقت میں اور دوسری اول وقت میں پڑھی جائے حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء کے نزدیک سفر میں حقیقتاً دو نمازیں یکجا ایک وقت میں پڑھی جا سکتی ہیں اور آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا ہے۔ شیعوں میں دو دو نمازوں کے ایک ساتھ پڑھنے کا عام رواج ہے۔

اوقات پنجگانہ اور آیت اسراء::

محدثین اور مورخین کا اتفاق عام ہے کہ نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعیین معراج میں ہوئی ہے جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے بارہویں سال اور ہجرت سے ایک سال پہلے واقع ہوئی تھی' گو اوقات پنجگانہ کا ذکر سورہ ق اور روم میں موجود ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں لیکن اقامت صلوہ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورہ اسراء (معراج) میں نماز پنجگانہ کا حکم ہوتا ہے' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ کی تکمیل بصورت صلوہ اسی معراج میں ہوئی' جس طرح وضو پر عمل گو پہلے سے تھا مگر اس کا حکم قرآن میں مدنی سورتوں کے اندر نازل ہوا ہے سورہ اسراء (معراج) کی وہ آیت جس میں نماز پنجگانہ کا ذکر ہے' حسب ذیل ہے:



الفجر'' (صبح کا پڑھنا) بتایا گیا ہے' یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لئے ادا کی جاتی ہے' کہ عنقریب وہ ظاہر ہو کر اپنے پرستاروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا اس لئے ضروری ہے کہ دنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالق اکبر کا نام لے اور اس باطل پرستی سے جس میں آفتاب پرست عنقریب مبتلا ہونے والے ہیں' بتری ظاہر کرے' غرض اس آیت پاک سے اقامت صلوٰۃ کے اوقات پنجگانہ کا ثبوت ملتا ہے' اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ کلام عرب میں آفتاب کے ان تینوں جھکاؤں یا میلانات پر دلوک کا اطلاق ہوتا ہے' اگر کلام عرب سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقات پنجگانہ کی تشریح کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا۔

دلوک کی تحقیق::

مفسرین میں سے بعض نے ''دلوک'' سے زوال کا وقت اور بعض نے غروب کا وقت مراد لیا ہے اور اہل لغت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں اور ایک تیسرے معنی اور بھی بیان کئے ہیں' یعنی مقابل نقطۂ نگاہ سے ہٹ جانا اور اس ثبوت میں ایک جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے' چنانچہ لسان العرب میں ہے:

ودلکت الشمس تدلك دلوکا غربت و قیل اصفرت و مالت للغروب۔ وفی التنزل العزیز ''اقم الصلوہ لدلوك الشمس الی غسق الیل''۔ وقد دلکت زالت عن کبد السماء... وقال الفراء عن ابن عباس فی دلوك الشمس انه زوالها الظهر۔ قال ورایت العرب یذهبون بالدلوك الی غیاب الشمس قال الشاعر:

آفتاب کا دلوک ہوا یعنی وہ غروب (۱)۔ ہوا اور کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آفتاب (۲)۔ زرد ہو گیا اور غروب

کیلئے جھک گیا اور قرآن میں ہے کہ ''دلوک شمس کے وقت رات تاریکی تک نماز کھڑی کر''۔ اور آفتاب کو دلوک ہوا یعنی وہ آسمان کے بیچ (۳)۔ سے ہٹ گیا... اور فراء نے کہا کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ دلوک شمس کے معنی ظہر کے وقت آفتاب کے زوال کے ہیں اور اس نے بیان کیا کہ میں نے اہل عرب کو دلوک سے آفتاب کا غروب مراد لیتے دیکھا ہے' شاعر کہتا ہے

هذا مقام قدمی رباح ذبب حتی دلکت برح یعنی الشمس۔

''یہ وہ جگہ ہے جہاں لڑائی میں رباح کے دونوں قدم جمے تھے اس نے دشمنوں سے اپنی عزت کی حفاظت کی' یہاں تک کہ سورج ہتھیلی سے جھک گیا''۔

قال ابو منصور و قدر دینا عن ابن مسعود انه قال دلوک الشمس غروبها و روی ابن هانی عن الاخفش انه قال دلوک الشمس من زوالها الی غروبها۔ وقال الزجاج دلوک الشمس زوالها فی وقت الظهر۔ و ذالک میلها للغروب و هود لوکها ایضا یقال دلکت براح و براج۔ ای قد مالت للزوال حتی کا دالناظر یحتاج اذا تبصرها ان یکسر الشعاع عن بصره براخته ... فان قیل ما معنی الدلوک فی کلام العرب قیل الدلوک الزوال و لذلک قیل للشمس اذا زالت نصف النهار دالکته و قیل لها اذا

افلت دالكته لا نها فى الحالتين زائله ... قال الفراء فى قوله براح جمع راحته و هى الكف يقول يضع كفه على عينيه ينظر هل غربت الشمس بعد۔

ابو منصور نے کہا کہ ہم نے اب مسعود سے روایت کی کہ دلوک شمس ''آفتاب کا غروب ہے'' اور ابن ہانی نے اخفش سے نقل کیا ہے کہ دلوک شمس ظہر کے وقت آفتاب کا زوال ہے اور اس کے معنی غروب کیلئے جھکنا بھی ہیں اور یہ بھی اس کا دلوک ہے' محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ دلکت براخ و براح یعنی آفتاب زوال کیلئے جھک گیا یہاں تک کہ دیکھنے والا جب اس کو دیکھنا چاہے تو اسکی کرن کی شدت کو توڑنے کیلئے اس کو آنکھ پر ہتھیلی رکھنے کی ضرورت ہے... تو اگر کہا جائے کہ عرب کے محاورہ میں دلوک کے کیا معنی ہیں؟ تو جواب دیا جائے گا کہ دلوک کے معنی زوال کے ہیں اور اسی لئے آفتاب کو ''دالکتہ'' کہتے ہیں' جب وہ دوپہر کو جھک جائے اور جب آفتاب ڈوب جاتا ہے تب بھی اس کو ''دالکتہ'' کہتے ہیں کیونکہ وہ ان دونوں حالتوں میں جھک جاتا ہے... فراء نے کہا کہ اس قول (شعر یا محاورہ) میں جو براح کا لفظ ہے یہ راحتہ کی جمع ہے جس کے معنی ہتھیلی کے ہیں کہنے والے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر دیکھتا ہے کہ آفتاب ابھی غروب ہوا یا نہیں۔

شعرائے عرب نے آفتاب کے ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آجانے کے وقت آنکھوں پر ہتھیلی رکھنے کا اکثر ذکر کیا ہے۔ عجاج (۱)۔ کہتا ہے:

والشمس قد كادت تكون دلفا

اوفحها بالراح كي تزحلقا

اور آفتاب قریب تھا کہ بیمار ہو کر دبلا ہو جائے

میں اس کو ہتھیلی سے ہٹاتا تھا تاکہ وہ ہٹ جائے

اس دوسرے شعر سے پہلے شعر کے معنی کھل جاتے ہیں کہ اس میں دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے جب آفتاب ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے' الغرض دلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے' اس کا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمت الراس سے ہٹتا ہے' دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے جب وہ مقابل کی سمت نظر سے ہٹتا ہے اور مغرب کی طرف چلنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پڑتا ہے' اس وقت شعاعوں کی تیزی سے بچنے کیلئے آدمی آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے جب وہ سمت افق سے نیچے ہو کر ڈوب جاتا ہے' ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جو زوال سے لے کر غروب تک کے زمانہ پر مشتمل ہیں' بعض اہل لغت نے جیسا کہ اوپر گزرا ''الستاما'' یہ کہہ دیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں' حالانکہ اس کے اطلاق تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے اول اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے' پھر اس میلان پر جو سمت نظر سے ہوتا ہے اور بالآخر اس کامل میلان پر جو سمت افق سے ہوتا ہے اور یہ اوقات زوال سے غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹوں کے بعد آتے ہیں' اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ :

اقم الصلوہ لدلوك الشمس۔

آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر۔

سے مراد تین نمازیں ہیں کیونکہ تین دلوک ہوتے ہیں' ظہر (۱)۔ جب آفتاب کے دلوک (جھکاؤ) سمت الراس سے ہوتا ہے عصر (۲)۔' جب اس کا دلوک سمت نظر سے ہوتا ہے اور مغرب (۳)۔' جب اس کا کامل دلوک سمت افق سے ہوتا ہے (۲)۔' اس کے بعد غسق اللیل (رات کی تاریکی) اور قرآن الفجر (فجر کی قرات) سے ظاہر ہے کہ عشاء اور فجر کی نمازیں مراد ہیں اس طرح اس آیت پاک سے جو سورہ اسراء میں واقع ہے اوقات پنجگانہ میں اقامت صلوٰۃ کے اوقات کی تشریح ہو جاتی ہے۔

(۱)۔ شعر تفسیر طبری میں۔ (۲)۔ تفسیروں میں بھی صحابہ کی روایتوں سے انھیں نمازوں کا باختلاف روایت مراد ہونا مذکور ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ دلوک غروب آفتاب اور حضرت ابن عباسؓ زوال آفتاب مراد لیتے ہیں' اسی طرح غسق اللیل کو بھی بعض لوگ مغرب اور بعض عشاء سمجھتے ہیں اور فیصلہ یہ کرتے ہیں کہ دلوک شمس سے ظہر اور عصر اور غسق اللیل سے مغرب اور عشاء اور قرآن الفجر سے نماز صبح مراد ہے اور اس طرح ان کے نزدیک یہ آیت اوقات پنجگانہ کو بتاتی ہے۔

اوقات نماز کا ایک اور راز::

اس آیت کریمہ کو ایک دفعہ اور پڑھو تو معلوم ہوگا کہ نماز کے اوقات کا آغاز ظہر (میلان اول آفتاب) سے ہوتا ہے اور یہی اس حدیث سے ثابت ہے جس میں بذریعہ جبریل نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعلیم کا ذکر (۲)۔ ہے' اس میں پہلے ظہر کا نام آتا ہے' پھر بہ ترتیب اور چاروں نمازوں کا' ظہر کے بعد عصر پھر مغرب' پھر سونے سے پہلے عشاء' یہ چار نمازیں تقریباً دو تین گھنٹوں کے فاصلہ سے ہیں اس کے بعد صبح کی نماز ہے جو عشاء سے تقریباً سات آٹھ گھنٹوں کا فصل رکھتی ہے اور پھر صبح سے ظہر تک تقریباً اسی قدر فصل ہے چنانچہ اس آیت میں ظہر سے عشاء تک ایک ساتھ نماز کا مسلسل حکم ہے' چند گھنٹے ٹھہر کر صبح کا حکم ہوتا ہے' پھر خاموشی ہو جاتی ہے' یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہو کر ایک لمبے وقفے کے بعد ظہر کا وقت آتا ہے اور اس طرح دور قائم

ہو جاتا ہے' غرض ظہر سے عصر' عصر سے مغرب اور مغرب سے عشاء تک مسلسل نمازیں ہیں' پھر صبح تک استراحت کا طویل وقفہ ہے' صبح اٹھ کر خدا کی یاد ہوتی ہے اور پھر انسانی کاروبار کے لئے ایک طویل وقفہ رکھا گیا ہے جو صبح سے ظہر تک ہے اور اس میں کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی ہے۔

اوقات پنجگانہ کی ایک اور آیت::

سورہ اسراء کی آیت کی طرح سورہ طہ میں بھی ایک آیت ہے جس میں اوقات پنجگانہ کی تفصیل ہے' وہ یہ ہے:

وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس و قبل غروبها و من اناء اليل فسبح و اطراف النهار (طه: ۸)

اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ' آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس (آفتاب کے) ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ وقت میں تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں۔

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر (۱)۔ ہے' ڈوبنے سے پہلے عصر (۲)۔ ہے' رات کے کچھ وقت سے عشاء (۳)۔ مراد ہے اور دن کے کناروں میں ظہر (۴)۔ اور مغرب (۵)۔ ہے۔

اطراف النہار کی تحقیق::

یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ''اطراف'' کا لفظ جمع ہے جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے' اس بنا پر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئیں' دن کے کنارے یا تو دو ہی ہیں' صبح اور شام' یا تین ہیں' اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے یعنی صبح' دوپہر اور شام' پہلی شق لی جائے تو صبح کا ذکر مکرر ہو جاتا ہے اور ظہر غائب ہو جاتی ہے' دوسری شق اختیار کی جائے تو گویا ظہر آ

جاتی ہے مگر پھر بھی صبح مکرر ہی رہتی ہے۔

(۱)۔ سیرت ابن ھشام باب ابتداء فرضیت صلوٰۃ۔

اس لفظی اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اطراف گو جمع ہے مگر کلام عرب میں تثنیہ یعنی دو پر بھی جمع کا اطلاق ہے اور خود قرآن مجید میں اس کے استعمال موجود ہیں مثلاً ایک جگہ مشرقین اور مغربین' دو مشرق اور دو مغرب ہے' دوسری جگہ انہیں کو ''مشارق اور مغارب'' کہا گیا ہے' سورہ تحریم میں ہیقفد صغت قلو بکما (تم دونوں کے قلوب) ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کے دو قلب ہوں' قلوب (بصیغہ جمع) نہیں ہوسکتا مگر یہ زبان کا محاورہ اور بول چال ہے' اس میں قیاس اور عقلیت کو دخل نہیں' اس بنا پر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہیں' یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ دن کے دو ہی ممتاز حصے ہیں' ایک صبح سے دوپہر تک اور دوسرا دوپہر سے شام تک اطراف سے انہیں دونوں حصوں کے آخری کنارے یہاں مراد ہیں' صبح سے دوپہر تک کے حصہ کا آخری کنارہ ظہر ہے اور دوپہر سے غروب تک کے حصہ کا آخری کنارہ عصر یا مغرب ہے' لیکن چونکہ عصر کا ذکر قبل غروبھا کے اندر مستعمل موجود ہے اس لئے متعین ہوگیا کہ یہاں اس سے مراد مغرب ہے۔

ایک اور طریقہ ثبوت ::

اگر ہم قرآن پاک علیحدہ علیحدہ آیتوں سے اوقات پنجگانہ کا استدلال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں مثلاً:

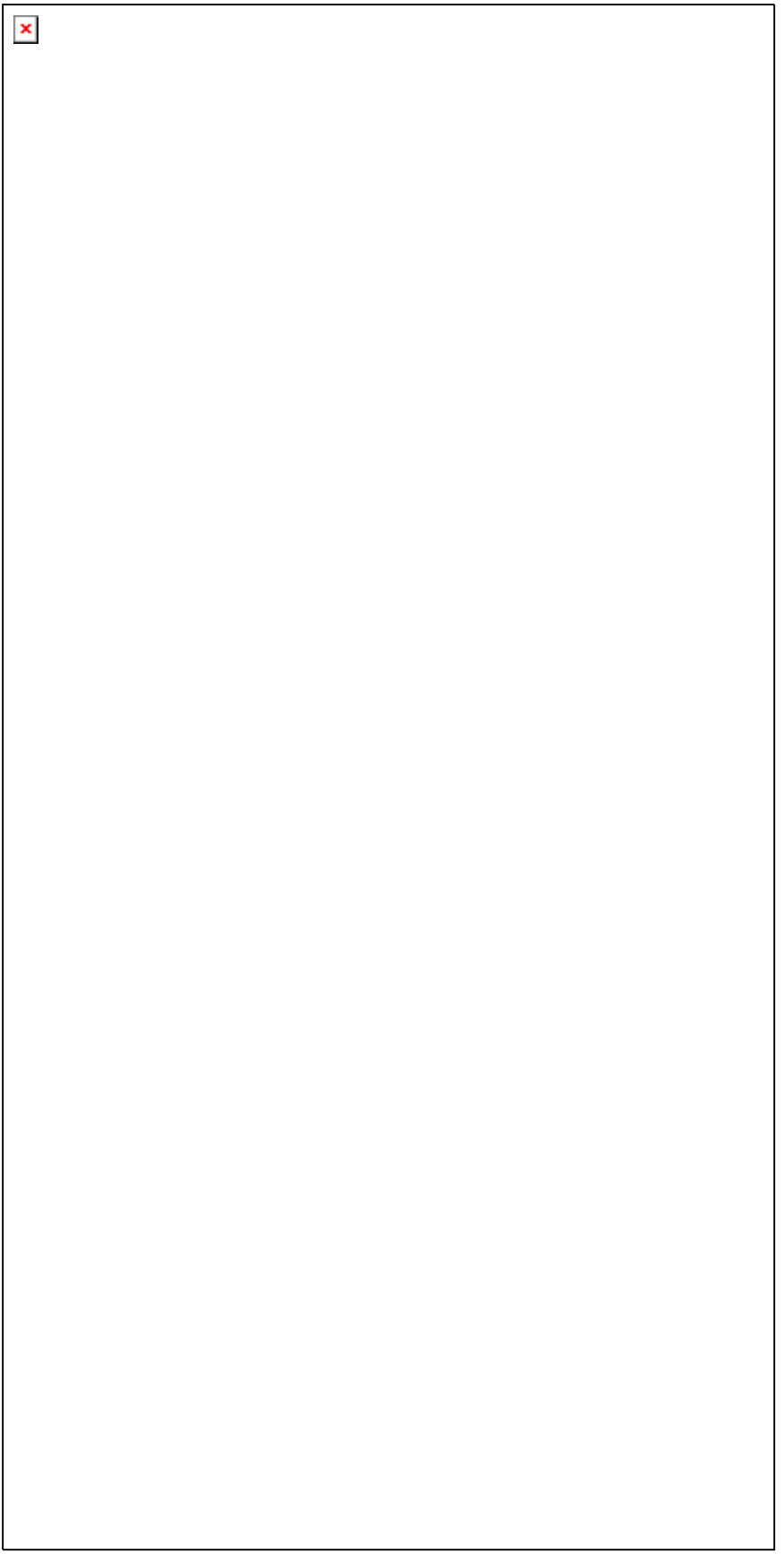
(۱) اقم الصلوہ لدلوک الشمس (اسراء: ۹)

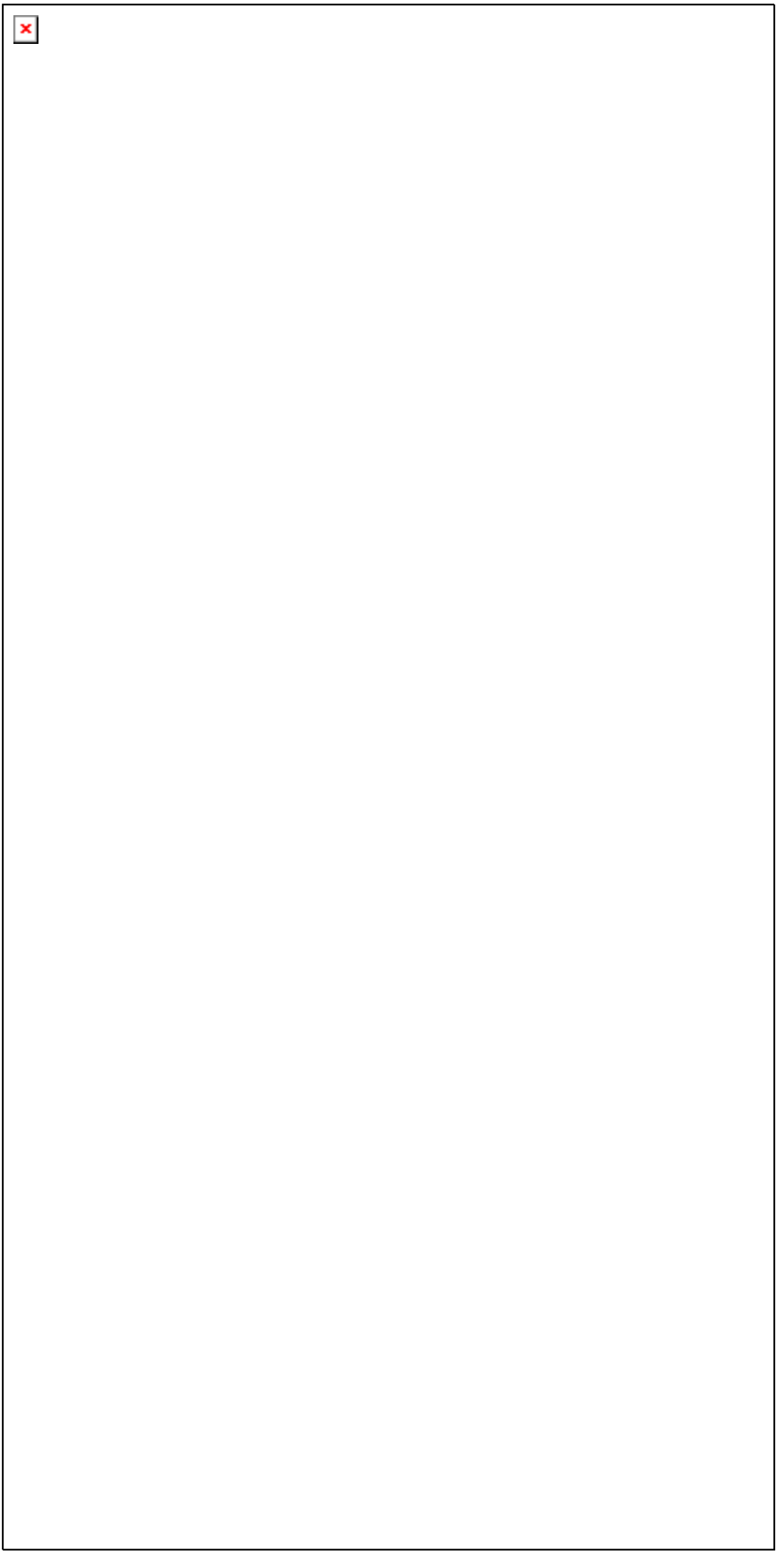
زوال آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر۔

یہ ظہر کی نماز ہے۔

(۲) و قبل الغروب (ق: ۳)

اور غروب آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کرو۔





ضروری اور اہم متعلقہ ارکان وشرائط واحکام روایتاً متواتر اور عملاً محفوظ وقائم ہیں' نماز وہ فریضہ الٰہی ہے جس کی فرضیت خمسہ کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس ساعت سعید میں دیا جب آنحضرت ﷺ معراج کے تقرب خاص سے ممتاز ہوئے' حکم ہوا کہ شب و روز میں پانچ نمازیں تم پر اور تمہاری امت پر لکھی گئیں جو پچاس (۱)۔ نمازوں کے حکم میں ہیں' قرآن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے' ارشاد ہے کہ من جاء بالحسنہ فلہ عشر امثالھا۔ (انعام: ۲۰) یعنی جو ایک نیکی کرے گا اس کو دس گنا ثواب ملے گا' اس لئے پانچ نمازیں یقیناً پچاس کے حکم میں ہیں۔

نماز کی فرضیت کے بعد فرشتہ الٰہی نے اتر کر خود نماز کے طریق ادا اور اس کے اوقات خمسہ کی تعلیم کی اور ہر وقت کی ابتداء اور انتہا پر ایک ایک نماز پڑھا کر عملاً ہر چیز کی تلقین کی (۲)۔ اور وہی آپ نے اپنے پیروؤں کو بتایا اور اس پر ان سے عمل کرایا۔

چنانچہ آپ نے شیوع اسلام کے بعد ہر جگہ احکام شریعت کی تبلیغ و اعلان کے مبلغ جب متعین فرمائے تو ایک بدوی نے جو نجد کے دور دراز راستہ سے سفر کر کے آیا تھا' خدمت اقدس ﷺ میں آ کر عرض کی یا رسول اللہ ﷺ آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں کیا یہ سچ ہے؟ فرمایا ہاں سچ ہے' عرض کی کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا ہاں (۳)۔۔

خود آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ جبرائیلؑ اترے اور انہوں نے میری امامت کی تو میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی (۱)۔' پھر پڑھی (۲)۔' پھر پڑھی (۳)۔' پھر پڑھی (۴)۔' پھر پڑھی (۵)۔۔ یہ فقرے منہ سے کہتے

---

(۱)۔ بخاری و مسلم و ابوداؤد وغیرہ کتاب الصلوٰۃ و کتاب الاسرار۔ (۲)۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم باب اوقات الصلوٰت الخمس۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الایمان الزکوٰہ من الاسلام ص ۱۱ ۰ و صحیح مسلم کتاب الایمان فی شرائع الدین ۲۴' ۲۵ مصر۔

جاتے تھے اور انگلی سے ایک' دو' تین' چار' پانچ گنتے جاتے تھے (۱)۔۔ ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر کسی کے گھر کے سامنے کوئی صاف شفاف نہر جاری ہو اور وہ اس میں دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل رہ سکتا ہے؟ سب نے عرض کی نہیں' نہیں رہے گا' فرمایا تو یہی مثال پانچوں نمازوں کی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو دھو دیتا ہے' (۲)۔ اوقات کی تعیین میں فرمایا کہ جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج کی پہلی کرن نہ نکل آئے' پھر جب ظہر پڑھو تو اس کا وقت اس وقت تک ہے جب تک عصر کا وقت نہ آ جائے' پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اس وقت تک ہے کہ آفتاب زرد پڑ جائے' پھر جب مغرب پڑھو تو شفق ڈوب جانے تک اس وقت ہے پھر جب عشاء پڑھو تو آدھی رات تک اس کا وقت ہے (۳)۔۔

ابو برزہؓ ایک صحابی کہتے ہیں کہ حضور صبح کی نماز میں ساٹھ سے سو آیتیں تک قرات کرتے تھے اور ظہر زوال کی بعد ادا کرتے تھے اور عصر اس وقت پڑھتے تھے کہ ایک آدمی مدینہ کے آخری کنارہ تک جا کر لوٹ آتا تھا' پھر بھی آفتاب میں جان رہتی' مغرب کی بابت راوی کو سنا ہوا بیان یاد نہیں رہا' اور عشاء کو تہائی رات تک ادا کرنے میں آپ تامل نہیں فرماتے تھے (۴)۔۔ حضرت جابرؓ دوسرے صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ظہر کی نماز دوپہر میں پڑھا کرتے تھے اور عصر اس وقت جب سورج باقی رہتا تھا' اور مغرب جب سورج ڈوب جاتا تھا اور عشاء میں کبھی دیر کرتے اور کبھی عجلت اور صبح اندھیرے میں پڑھتے تھے (۵)۔۔ صحابہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ ظہر اور عصر کی نمازوں کی دو پہلی رکعتوں میں آہستہ آہستہ سورہ فاتحہ کے ساتھ سورہ پڑھتے تھے کبھی کبھی کوئی آیت سنائی بھی دیتی تھی' مغرب میں سورہ المرسلات پڑھی اور کبھی سورہ طور پڑھی' عشاء میں اذا السماء انشقت اور والتین والزیتون قرات کی ہے اور صبح میں سورہ طور پڑھی ہے (۶)۔۔

اس قسم کی بیسیوں روایتیں ہیں اور روایتوں پر کیا موقوف ہے اس وقت سے آج تک تمام امتیان محمد ﷺ کا عملی تواتر دوست و دشمن سب کے نزدیک نا قابل تردید حجت (۷)۔ ہے۔

تہجد اب نفل ہوگئی لیکن کیوں؟::

اب نماز پنجگانہ کی تکمیل کے بعد صلوۃ اللیل (تہجد کی نماز) جو پہلے فرض تھی، عام امت کیلئے نفل ہوگئی چنانچہ پوری آیت یہ ہے:

اقم الصلوہ لدلوک الشمس الی غسق الیل و قران الفجر ان قران الفجر کان مشھودا و من الیل فتھجد بہ نافلہ لک عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا (اسراء: ۹)

نماز کو آفتاب کے جھکاؤ کے بعد کھڑی کر (ظہر، عصر، مغرب) رات کی تاریکی تک اور صبح کی قرات قائم کر بیشک صبح کی قرات میں حضور ہوتا ہے اور رات کے حصہ میں تو اٹھ کر (اوقات مقررہ سے) زیادہ نماز پڑھ شاید کہ تجھ کو تیرا رب قابل تعریف مقام میں اٹھائے۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم و مئوطا باب اوقات الصلوت الخمس۔ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب الصلوت الخمس کفارہ۔ (۳)۔ صحیح مسلم باب اوقات الصلوۃ الخمس۔ (٤)۔ صحیح بخاری باب وقت الظھر عندالزوال۔ (٥)۔ صحیح بخاری باب وقت العشاء اذا اجتمع الناس او تاخروا۔ (٦)۔ ایضًا باب القراہ فی الظھر و العصر والمغرب والعشاء والفجر بروایات متعددہ۔ (۷)۔ چونکہ بعض مستشرقین نے (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ صلوۃ) دانستہ یا نادانستہ طور پر اوقات نماز میں غلطی فہمی پھیلانی چاہی ہے اس لئے اتنی تفصیل کی ضرورت پڑی تاکہ ان کی غلط فہمی دور

غور کرو جب تک اوقات مقرر نہ ہوئے تھے' رات کو دیر تک نماز اور نماز میں جتنا زیادہ قرآن پڑھا جا سکے پڑھنے کا حکم تھا' گویا یہ پانچوں وقت کی ایک ہی وقت میں نماز تھی یعنی نماز کی پانچ پتیوں والا پھول ابھی تک غنچہ کی طرح ورق بر ورق تھا' جب دو اور تین وقتوں کی نمازیں الگ الگ ہوئیں تو ان کے بقدر رات کی طویل نماز میں تخفیف ہوگئی اور حکم آیا کہ فاقرءوا ما تیسر من القران (یعنی قرآن سے اس قدر حصہ پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکو (۱)۔) اسکے بعد اس آیت پاک میں جب اقام صلوٰہ کے اوقات پنجگانہ کا ذکر آیا تو رات کی نماز (تہجد) کی فرضیت ساقط ہوگئی' یہاں ایک قابل ذکر بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ آیت پاک اوقات نماز کی تکمیل کی آخری اطلاع ہے کیونکہ اس کے نازل ہونے سے پیشتر قدیم فرض نماز تہجد نفل نہ تھی اور اب نفل ہوگئی۔

قبلہ::

انسان کا کوئی کام جس طرح زمانہ سے خالی نہیں ہوسکتا جس کی بنا پر اوقات نماز کی تعیین کی گئی ہے' اسی طرح مکان سے بھی خالی نہیں ہوسکتا' جب انسان کوئی کام کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا منہ کسی نہ کسی سمت ہوگا' اگر نماز میں کسی خاص سمت کا تعیین نہ ہوتا اور یہ عام اجازت دے دی جاتی کہ جس کا جدھر جی چاہے منہ کر کے نماز ادا کرے تو جماعت کی یکسانی کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے اور نمازیوں کی وحدت صوری قائم نہ رہتی بلکہ اگر ایک ہی مسجد میں ایک ہی وقت میں کوئی پورب' کوئی پچھم' کوئی اوتر اور کوئی دکھن رخ کر کے کھڑا ہوتا تو یہ وحدت نظام کے خلاف ہونے کے علاوہ اچھا خاصہ مضحکہ انگیز تماشا بن جاتا ہے۔ اس لئے ہر مذہب میں عبادت کے لئے کوئی نہ کوئی سمت خاص کر لی گئی ہے۔ صابی (ستارہ پرست) قطب شمالی کی طرف منہ کرتے تھے کہ ستاروں میں وہی ہے جو نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ

سے حرکت نہیں کرتا بلکہ برقرار رہتا ہے (۲)۔۔آفتاب پرست سورج کی طرف منہ کرتے تھے' آتش پرست آگ کو سامنے رکھتے ہیں اور بت پرست کوئی نہ کوئی بت آگے رکھ لیتے ہیں' اکثر شامی قومیں مشرق کی طرف رخ کرتی تھیں' یہاں تک کہ یہودیوں کے فرقہ ایسینی نے آفتاب کے مطلع کو قبلہ بنالیا تھا۔شامی عیسائی بھی اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے (۳)۔ تھے۔بنی اسرائیل میں بھی قبلہ ضروری تھا' تورات سے حضرت ابراہیمؑ' حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کا یہ دستور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں عبادت کرنا چاہتے تھے اس کو چند پتھروں سے گھیر کر خدا کا گھر ''بیت ایل'' بنا لیتے (۴)۔ تھے۔قرآن مجید میں ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں تھے تو حضرت موسیٰؑ کے ذریعہ سے ان کو حکم ہوا تھا کہ وہ اپنے گھروں کو قبلہ رخ بنائیں اور نماز ادا کریں:

واجعلو ابیوتکم قبله و اقیمو الصلوه (یونس: ۹)

اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ کرلو اور نماز کھڑی کرو۔

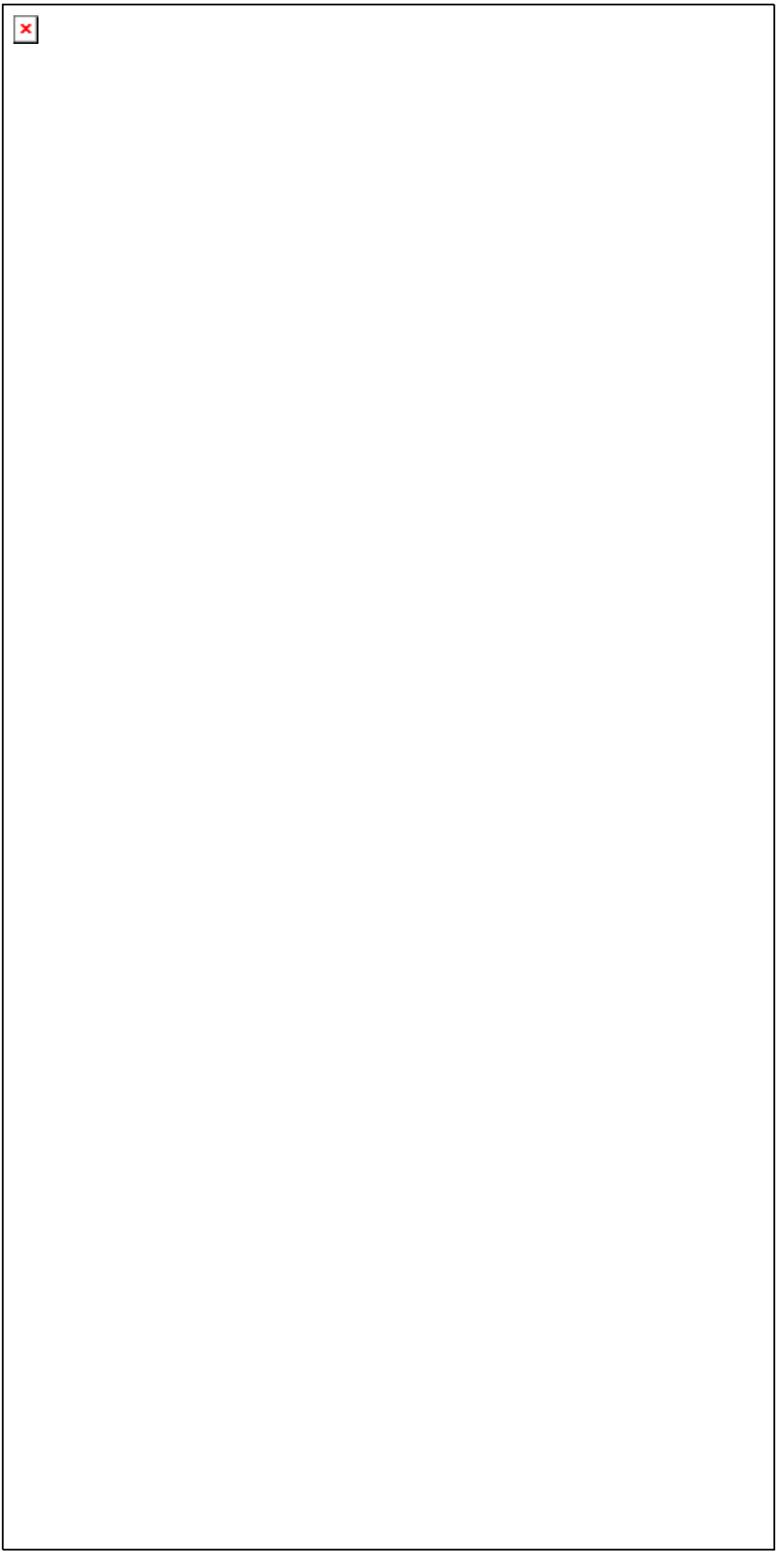
بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر عہد قدیم کے مجموعہ صحف میں متعدد موقعوں پر آیا ہے' حضرت داؤدؑ کے زبور میں ہے:

''لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر میں آؤں گا اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف' تجھے سجدہ کروں گا''۔(۵۔۷)

(۱)۔صحیح مسلم ج ۱ باب وجوب قراءہ الفاتحہ۔حدیث ارجع فصل فانك لم تصلی۔نیز دیکھو فتح الباری ج ۱ ص ۳۹۳۔(۲)۔الرد علی المنطقیین لابن تمیمہ۔(۳)۔یہ تفصیلات انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ''قبلہ'' میں ہیں۔(٤)۔سفر تکوین باب ۱۲۔۸' ۱۳۔٤' ۱۷۔۲۸' ۱۹۹۸' ۳۱۔۱۳

سلاطین اول میں ہے:

''جب تیرا گروہ لڑائی کے لئے اپنے دشمن کے برخلاف نکلے جہاں کہیں تو انہیں بھیج دے اور خداوند کے آگے دعا مانگے' اس شہر کی طرف جس کو تو نے پسند کیا اور اس کے



المقدس دونوں سامنے پڑ جاتے تھے لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی کیونکہ بیت المقدس مدینہ سے شمال اور خانہ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا' تاہم کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک چونکہ اجازت نازل نہیں ہوئی تھی' آپ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے کہ وہی انبیائے بنی اسرائیل کے قبلہ گاہ تھا لیکن آپ کی طبعی خواہش یہ تھی کہ اس تازہ ملت ابراہیمی کے لئے وہی ابراہیمی مسجد (خانہ کعبہ) قبلہ قرار پائے۔ جس کی تولیت اس کے بانی (حضرت ابراہیمؑ) کی طرف سے بنی اسمٰعیل کے سپرد ہوئی تھی چنانچہ سورہ بقرہ کے وسط میں اس کے متعلق احکام نازل ہوئے جن میں سب سے پہلے بتایا گیا کہ خدا کو کسی خاص جہت اور سمت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ بے سمت ہے اور سب کی سمتیں اسی کی ہیں۔

ولله المشرق و المغرب فاينما تولوا فثم وجه الله ان الله واسع عليم (بقرہ: ۱۴)

اور خدا ہی کے لئے ہے پورب اور پچھم' تو جدھر رخ کرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے' بیشک اللہ بڑی گنجائش اور وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔

اس گنجائش اور وسعت میں ہر سمت داخل ہے اور ہر جہت کی اس کو خبر ہے' یہ آیت کریمہ قبلہ کے تعین کی کسی ایسی تشریح کو جس سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے قطعاً غلط قرار دیتی ہے اور دوسری آیت میں بھی یہی مضمون ادا ہوا ہے:

سيقول السفهاء من الناس ما ولهم عن قبلتهم التى كانوا عليها قل لله المشرق و المغرب يهدى من يشاء الى صراط مستقيم (بقرہ: ۱۷)

بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے اس قبلہ سے کس نے ہٹا دیا' جس پر وہ تھے' کہہ دے کہ پورب

اور پچھم دونوں خدا کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

یہود جن کو سب سے زیادہ اعتراض یہ تھا کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر، مغربی مسجد یعنی خانہ کعبہ کو کیوں قبلہ قرار دیا گیا، ان کو خطاب کر کے فرمایا:

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من امن باللہ و الیوم الاخر والملئکہت والکتب والنبیین واتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتمی والمسا کین وابن السبیللا والسائلین وفی الرقابج واقام الصلوہت واتی الزکوہت والموفون بعھدھم اذا عاھدوا ج والصابرین فی الباساء والضرآء وحین الباسط اولئك الذین صدقوا واولئك ھم المتقون۔ (بقرہ:۲۲)

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو، البتہ نیکی یہ ہے کہ خدا، قیامت، فرشتوں، کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور اپنی دولت کو اس کی محبت کے باوجود (یا خدا کی محبت) رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کو (آزاد کرانے میں) دے اور نماز پڑھے اور زکوٰۃ دے اور (نیکی یہ ہے) جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور سختی اور تکلیف اور جنگ میں صبر کرتے ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے ہوئے اور یہی پرہیزگار ہیں۔

اس تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام میں قبلہ کی کیا حیثیت ہے، قبلہ یعنی وہ سمت یا جگہ کا رخ کیا جائے عبادت کے لئے کوئی ضروری چیز نہیں ہے

لیکن چونکہ نمازوں میں امت کے نظام وحدت کو قائم رکھنے کے لئے کسی ایک رخ کی تخصیص کی حاجت تھی اس لئے سن اھ میں خانہ کعبہ کے قبلہ بنانے کا حکم ہوا۔

قول وجهك شطر المسجد الحرام وحيث ما كنتم فولوا وجوهكم شطره۔ (بقرہ:۱۷)

پس تو اپنا منہ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر اور تم لوگ جہاں بھی ہو اسی کی طرف اپنے منہ پھیرو۔

اسلام نے قبلہ کے لئے کسی خاص سمت کا نہیں بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا' جس کے چاروں طرف چاروں سمتوں سے نماز پڑھی جا سکے۔اس طرح مشرق' مغرب' جنوب' شمال' سب بہ یک وقت مسلمانان عالم کا قبلہ ہیں' جس سے ایک لطیف رمز یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کی خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعین سے اس سمت کی مرکزی چیز (مثلاً آفتاب یا قطب شمالی وغیرہ) کی مسجودیت اور معبودیت کا جو تخیل پیدا ہوتا تھا اور جس سے بت پرستی اور ستارہ پرستی کا رواج ہو گیا تھا اس کا کلیتہ خاتمہ ہو گیا۔

لیکن یہ مرکزی مسجد مسجد بیت المقدس کی بجائے مسجد حرام (کعبہ) قرار دی گئی جس میں بہت سی مصلحتیں تھیں۔

ا۔ یہ ضرور تھا کہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف ہر شخص ہر جگہ سے' ہر ملک میں منہ پھیر سکے' ایسی چیز یا تو کوئی مصنوعی شے ہو سکتی تھی مثلاً چراغ' کوئی مومی شمع' کوئی تصویر' کوئی مجسمہ' کوئی کتاب' جیسا کہ اوپر گزرا' بعض اہل مذاہب ان چیزوں کو سامنے رکھتے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے مثلاً بت' مجسمہ' آگ' پانی' آفتاب وغیرہ اشیاء و عناصر و کواکب' ظاہر ہے کہ اسلام اگر ایسا کرتا تو وہ بھی کھلی ہوئی بت پرستی میں گرفتار ہو جاتا' دوسری صورت یہ تھی کہ اشیاء کو نہیں بلکہ سمت خاص کیا جاتا' مثلاً شمال یا مشرق کو پہلی سمت میں جگہ سے نہ ٹلنے والا۔قطب تھا' اور دوسری چہرۂ خورشید کا مطلع

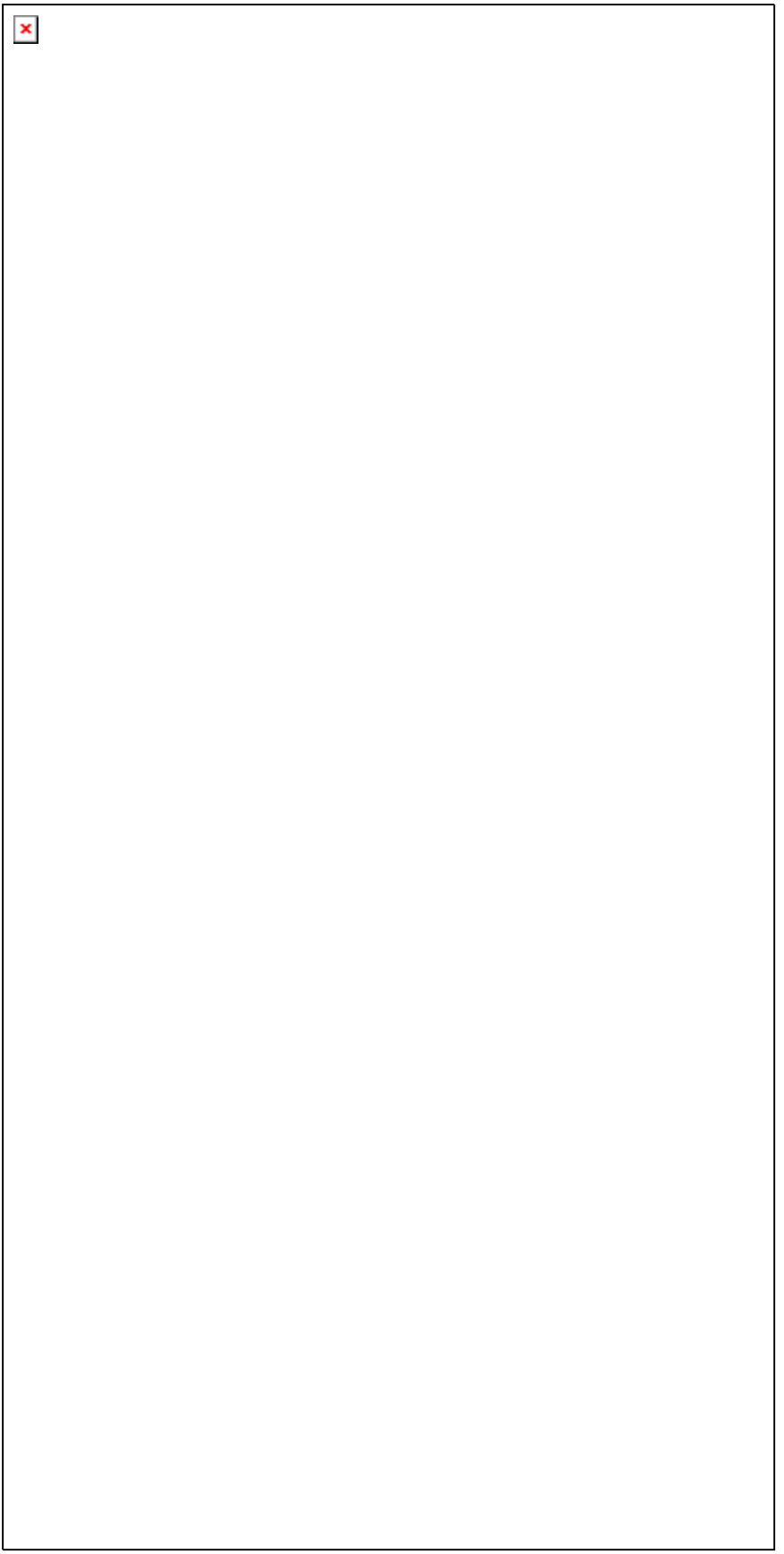
اور بیاض سحر کا دیباچہ تھی' دین توحید کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ ستارہ پرستی کے ابطال کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے علامات اور امتیازات کو قائم رکھے۔

۲۔ یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منہ کرنا ستارہ پرستی ہوتی' کسی اور سمت کا انتخاب کیا جاسکتا تھا۔ مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ چار سمتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کسی نہ کسی مرجح سبب ہی کی بناء پر ہوسکتا ہے ورنہ خدا کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی اب جو بھی سمت اختیار کی جاتی اس کے لئے ضرور تھا کہ اس کی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بھی ہوتی' سمت کی تعیین آفتاب یا دوسرے ممتاز ستاروں کا طلوع وغروب کا لحاظ کئے بغیر ممکن ہی نہیں کیونکہ ہر سمت کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے جس کی سیدھ سے وہ سمت متعین کی گئی ہے' اس لئے جو سمت بھی اختیار کی جاتی اس سے اس سمت کا خاص ستارہ کے متعلق وجوہ ترجیح کا پیدا کرنا ضروری تھا اور اس ترجیح سے دین توحید کا دین شرک بن جانا لازمی تھا۔

۳۔ اسی لئے ملت ابراہیمی نے ان صورتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو اپنا قبلہ بنایا' تاکہ شرک کے ہر قسم کے شائبہ سے اس کی نماز محفوظ رہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی بنائی ہوئی مسجدوں میں ان کی نسل نے دو مرکزی مسجدوں کو محفوظ رکھا تھا' ایک بیت المقدس جس کو حضرت ابوداؤدؑ اور حضرت سلیمان (ا)۔ نے اپنے اپنے زمانوں میں بڑے اہتمام سے تیار کرایا' اور یہ بنی اسرائیل کا قبلہ بنی' دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھی۔

۴۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانہ کعبہ' بیت المقدس سے پہلے بنا تھا' وہ دنیا میں پہلا گھر تھا جو خدا کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ تھے۔

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکہت مبارکا۔
(آل عمران: ۱۰)



عورتیں دو عہد تھیں، یعنی ان کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیمؑ سے خدا نے دو وعدے کئے تھے۔ ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا جب وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ مصر سے آ رہی تھیں اور راستہ میں سینا پڑتا تھا، اس سے وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی ''غلام اولاد'' نے عرب میں عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا تھا، اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے متولی ہو گئے، یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادت گاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا۔ سارہ کے وعدہ کا یہاں ذکر نہیں ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطاء ہوئی تھی۔ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیشتر تک خدا کا عہد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا۔ چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی بغاوت، تمرد، سرکشی اور قساوت کے سبب سے اس عہد کو توڑ دیا تھا اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد خدا نے ان کو متنبہ کیا جس کا ذکر سورۂ اسراء کی آیتوں میں ہے اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو خدا نے ان سے اپنا عہد توڑ کر بنو اسماعیل کا وہ عہد شروع کیا جو سینا پر ہاجرہ کے متعلق باندھا گیا تھا۔

معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) میں نماز ادا کرنا اور اس سے چند سال بعد خانہ کعبہ کا قبلہ بن جانا، گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتداء کا اعلان تھا، جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلدی میں سلسلۂ معراج۔

سبحان الذی اسری بعبدہ لیلا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حولہ۔ (بنی اسرائیل: ۱)

پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے اس مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے

گیا۔ جس کے چاروں طرف ہم نے برکت دی ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس جو عہد اسرائیلی کا نشان تھا' اسلام کے بعد اس میں قبلہ ہونے کی شان باقی نہیں رہی بلکہ حضرت ابراہیمؑ کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی جس کا تعلق عہد اسماعیلی سے تھا (یعنی خانہ کعبہ) وہ عہد کیا تھا؟ اس کی تفصیل یہ ہے:

واذا بتلی ابراھیم ربہ بکلمت فاتمھنط قال انی جاعلك للناس اساساط قال ومن ذریتیط قال لا ینال عھدی الظالمین۔ واذ جعلنا البیت مثابہت للناس واسناط واتخذوا من مقام ابراھیم مصلیط وعھدنا الی ابراھیم واسماعیل ان طھرا بیتی للطفائفین والعاکفین والرکع السجود۔ (بقرہ:۱۵)

اور جب خدا نے چند باتوں میں حضرت ابراہیمؑ کو آزمایا تو اس نے ان باتوں کو پورا کیا' خدا نے کہا میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں (ابراہیم نے) کہا اور میری نسل میں سے (خدا نے) فرمایا میرا عہد ظالموں کو شامل نہ ہوگا اور جب ہم نے گھر (کعبہ) کو لوگوں کے اجتماع کی جگہ اور امن بنایا اور تم ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں' اعتکاف کرنے والوں' رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کیلئے پاک رکھو۔

غرض یہ رمز الٰہی تھا جو ہزاروں برس پہلے سے خدا کے علم میں تھا اور جس کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے بعد عالم کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ قرار پایا جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر تھا جہاں کھڑے ہو کر

حضرت ابراہیمؑ نے توحید کی آواز بلند کی تھی اور دنیا میں اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پانا جو اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور زمین پر خطیرۃ القدس کا عکس تھا' اس لئے حکم ہوا:

ومن حیث خرجت فول وجهك شطر المسجد الحرام۔ (بقرہ:۱۸)

اور تو جہاں بھی نکلے' مسجد حرام ہی کی طرف منہ کر۔

درحقیقت ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی اسی طرح کھڑا ہو کر فریضہ عبودیت ادا کرے جہاں حضرت ابراہیمؑ کھڑے ہوئے تھے لیکن چونکہ ہر مسلمان کو ہر جگہ اور ہر وقت ایسا کرنا ممکن نہیں تو کم از کم نماز کے وقت ادھر رخ ہی کر لے' ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہر طرف برابر ہے' اسی لئے قبلہ کی تعین کے موقع پر فرمایا:

فاینما تولوا فثم وجه الله (بقرہ:۱۴)

پس جدھر منہ پھیرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔

خانہ کعبہ کی دیواریں اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبود و مسجود نہیں' نہ مشرکوں' بت پرستوں اور ستارہ پرستوں کی طرح نماز و دعا میں قبلہ سے خطاب ہوتا ہے' نہ اس سے کچھ مانگا جاتا ہے نہ اس کی دہائی دی جاتی ہے' نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے اور نہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس کے اندر بیٹھا ہے' خانہ کعبہ کی دیواریں اگر (بالفرض) ٹوٹ جائیں اس کی چھت گر جائے اور صرف فضاء باقی رہ جائے تب بھی کعبہ قبلہ رہے گا' اسی طرح خود خانہ کعبہ کے اندر جا کر بلکہ اس کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی نماز جائز ہے' اگر سمت قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے تو جدھر قبلہ کا گمان ہو ادھر ہی نماز پڑھی جا سکتی ہے' سواری میں نفل نماز ہر سمت جدھر سواری جا رہی ہو پڑھ سکتے ہیں۔ گھمسان کی لڑائیوں میں بھی ایسا کیا جا سکتا ہے' یہ باتیں ان تمام مشرکانہ غلط فہمیوں کی جو خانہ

کعبہ کے قبلہ ہونے سے پیدا ہوسکتی ہیں، قطعی تردید کرتی ہیں اور یہی اس باب میں دین محمدی ﷺ کی تکمیلی حیثیت ہے۔

یہ قبلہ گویا مسلمانوں کا ارضی مرکز، ملت ابراہیمی کے پیرو ہونے کا عملی ثبوت، دنیا کے قدیم موحدوں کی پہلی یادگار، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیرو ہونے کا شعار اور مسلمانان عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی طرف رخ کرنے کو قبول اسلام کی علامت قرار دیا اور فرمایا کہ ''جو ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھے اور ہمارے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھائے وہ مسلمان ہے۔(۱)'' اگر خیال کے پر پرواز سے اڑکر اور فضائے آسمانی کی نیلگوں سطح پر کھڑے ہوکر دنیا کے مسلمانوں کو نماز کی حالت میں کوئی شخص دیکھے تو نظر آئے گا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے جس کے چاروں طرف تمام مسلمانان عالم دائرہ کی صورت میں خدا کے آگے صفہ بستہ اور سربسجود ہیں۔

رکعتوں کی تعداد::

ایک قیام، اس کے بعد رکوع، پھر سجدہ، اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے، نماز میں کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئیں، صبح کو دو، ظہر، عصر اور عشاء کے وقت چار چار اور مغرب میں تین، ایک رکعت کی مستقل نماز نہیں رکھی گئی اور نہ چار سے زیادہ رکعتیں رکھی گئیں کیونکہ مصلحت یہ تھی کہ نماز نہ اتنی مختصر ہو کہ دل میں ذرا اثر بھی پیدا نہ کرسکے، نہ اتنی لمبی کہ انسان کو بددل بنادے، ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب میں خضوع وخشوع پیدا نہ ہوتا کیونکہ صرف چند سکینڈ میں تمام ہو جاتی اور چار سے زیادہ رکعتوں کی نماز بددلی کا باعث ہوتی کیونکہ دیر لگنے کی وجہ سے جی گھبراتا اس لئے فرض نماز کی رکعتیں دو سے کم اور چار سے زیادہ نہیں رکھی گئیں۔

مکہ میں مسلمانوں کو جو بے اطمینانی اور بے سروسامانی اور جس طرح کفار کے ڈر سے چھپ کر وہ نماز پڑھتے تھے اس کے لحاظ اس وقت نماز میں زیادہ رکعتیں ہونا ممکن نہ

تھا اسی لئے مکہ معظمہ میں ہر نماز صرف دو رکعتوں کی تھی۔ جب مدینہ منورہ آ کر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں کر دی گئیں لیکن مسافر کے لیئے وہی دو رکعتیں (۲)۔ قائم رہیں کیونکہ اس کی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے جو اس تخفیف کی علت تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ مقیم کے لئے چار رکعتیں ہیں، مسافر کے لیئے دو اور بحالت خوف ایک۔ (۳)۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اطمینان کی زیادتی اور کمی کی بناء پر ان رکعتوں کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

مغرب اور صبح کی نمازیں قیام وسفر دونوں حالتوں میں یکساں ہیں، مغرب کی تین رکعتوں کا آدھا اور صبح میں کچھ دو رکعتیں ہیں ان میں کیا کمی ہوسکتی ہے؟ لیکن مغرب اور صبح میں یہ تین اور دو رکعتیں کیوں ہیں؟ اس کی گرہ کشائی ام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمائی ہے "مغرب میں تین اس لئے ہیں کہ وہ دن کا وتر ہے اور صبح میں دو اس لئے کہ اس میں دو رکعتوں کے بڑھانے کے بجائے قرأت لمبی کر دی گئی ہے۔ (۴)۔"

حضرت عائشہؓ کے ارشاد میں تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔ گزر چکا ہے کہ عین طلوع اور غروب کے وقت نماز کی ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ کنار (آفتاب پرستوں کی عبادت کا وقت (۵)۔ تھا۔ مغرب کی نماز غروب

(۱)۔ بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فضل استقبال القبلۃ۔ (۲)۔ صحیح بخاری باب الہجرہ و صحیح مسلم صلوٰۃ المسافر فرومسند ابن حنبل ج ٦ ص ٢٤١ و ابن خزیمہ ابن حبان والبیہقی (فتح الباری ج ١ ص ٣٩٣) (٣)۔ صحیح مسلم صلوٰۃ المسافر۔ (٤)۔ مسند احمد بن حنبل ٦۔ ٢٤١۔ (٥)۔ صحیح مسلم النہی عن الصلوٰۃ فی الاوقات الثلث۔

آفتاب کے بعد فوراً ہوتی ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اہل توحید آفتاب پرستی کے شرک سے پوری برأت ظاہر کریں اسی لئے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد ہ

وہ رہ گئی جس سے خدا کے واحد اور وتر ہونے کا ثبوت مل سکے۔(۱)۔ یہ عدد واحد تو نہیں ہوسکتا کہ اس سے خضوع وخشوع اور تاثر کا مقصد فوت ہوتا' دو کا عدد بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ زوج اور جوڑا ہے' طاق نہیں۔ بنابرین توحید کا رمز آشکارا کرنے والا' سب سے قریب ترین طاق عدد تین ہی ہے جس سے خدا کا واحد ہونا اور وتر ہونا دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ نیز نماز کے خشوع وخضوع کا کمال بھی فوت نہیں ہوتا جو ایک رکعت ہونے میں فوت ہو جاتا۔ اس لئے مغرب میں رکعتوں کی تعداد تین رکھی گئی اور چونکہ آفتاب کا کامل زوال و انحطاط جس کو غروب کہتے ہیں اسی وقت ہوتا ہے اس لئے اس توحید کے رمز کو اسی وقت آشکارا ہونا چاہئے' اس مفہوم کی تشریح اس حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وتر نماز کی تاکید فرمائی ہے:

او تروا یااھل القران فان اللہ وتر یحب الوتر۔

(ابو دائود)

اے قرآن والو! وتر (طاق) پڑھا کرو' کیونکہ خدا بھی وتر (طاق) ہے اور وہ وتر (طاق) کو پسند کرتا ہے۔

صبح کا وقت وہ دلکش ہے جب انسان پورے آرام وسکون کے بعد بیدار ہوتا ہے۔ یہ بڑا سہانا وقت ہوتا ہے طبیعت موزوں ہوتی ہے' دل مطمئن ہوتا ہے' تمام عالم اس وقت سراپا اثر مجسم کیف نظر آتا ہے اس لئے یہ وقت نماز و دعا کیلئے خاص طرح سے موزوں ہے اور قرآن مجید میں اسکے اس خاص امتیاز کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے۔

ان قران الفجر کان مشھودا۔ (بنی اسرائیل: ۹)

صبح کی نماز کی قرأت کا وقت حضوری کا ہوتا ہے۔

اس بناء پر شریعت محمدیہ نے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد کے بجائے اس کی

اصل کیفیت کو پیش نظر رکھا یعنی رکعتیں تو دو ہی رہیں مگر حکم دیا گیا کہ قرأت لمبی کر دی جائے اور سورتیں بڑی بڑی پڑھی جائیں۔ چنانچہ خود آنحضرت ﷺ اور نمازوں میں ایک رکعت میں تقریباً پندرہ آیتیں تلاوت فرماتے تھے مگر صبح کی نماز میں ساٹھ آیتوں سے لے کر سو آیتوں تک قرأت کرتے (۲)۔ تھے' اور اسی نسبت سے رکوع وسجود بھی ہوتا تھا۔ (۳)۔

رکعتوں کی تعداد اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کی سنت متواترہ سے ثابت ہے اور تمام مسلمان اس تواتر پر بلا استثناء عامل بھی ہیں تاہم اس کا عملی اشارہ قرآن پاک میں نماز خوف سے ظاہر ہوتا ہے۔ جس میں یہ حکم ہے کہ اسلامی فوج کے دو حصے ہو جائیں' پہلے اگلا حصہ امام کے پیچھے کھڑا ہو کر ایک رکعت ادا کرے اور دوسرا دشمن کے مقابل کھڑا رہے پھر اگلا حصہ دشمن کے سامنے کھڑا ہو جائے اور دوسرا امام کے پیچھے آ کر ایک رکعت ادا کرے اس طرح امام کی دو رکعتیں ہو جاتی ہیں اور مقتدیوں کی جماعت کے ساتھ ایک' اور اگر دوسری رکعت کا موقع ملتا ہے' تو وہ ارکان کے ساتھ اور یہ ممکن نہ ہو تو اشاروں سے علیحدہ علیحدہ ادا کرتے ہیں' جب نماز خوف میں قصر کی دو رکعتیں ثابت ہوئیں تو اصل رکعتیں چار ہوں گی' اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قصر چار ہی رکعت والی نمازوں میں ہے' نماز قصر کی آیات سورۂ نساء کے پندرہویں رکوع میں ہیں۔

---

(۱)۔ عشاء کی بعد کی وتر نماز کو بھی وتر اسی لئے کہتے ھیں کہ وہ طاق ھوتی ھے۔ یعنی تین جو رات کی نماز ھے۔ (۲)۔ صحیح مسلم کتاب الصلوۃ باب القرائہ۔ (۳)۔ مسلم کتاب الصلوٰۃ باب اعتدال ارکان الصلوٰۃ و تخفیفھافی تمام۔

نماز کے آداب باطنی ::

قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں نماز کے لئے متعدد لفظ آئے ہیں مثلاً صلوٰۃ' دعاء تسبیح اور ذکر الٰہی یہ الفاظ خود نماز کے روحانی خصوصیات و آداب کو ظاہر کرتے ہیں'

نماز جسم و روح دونوں کی عبادت ہے اگر اس میں جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو اور روح میں اہتزاز پیدا نہ ہو جائے تو ایسی نماز گل بے رنگ اور شراب کیف سے زیادہ نہ ہوگی۔

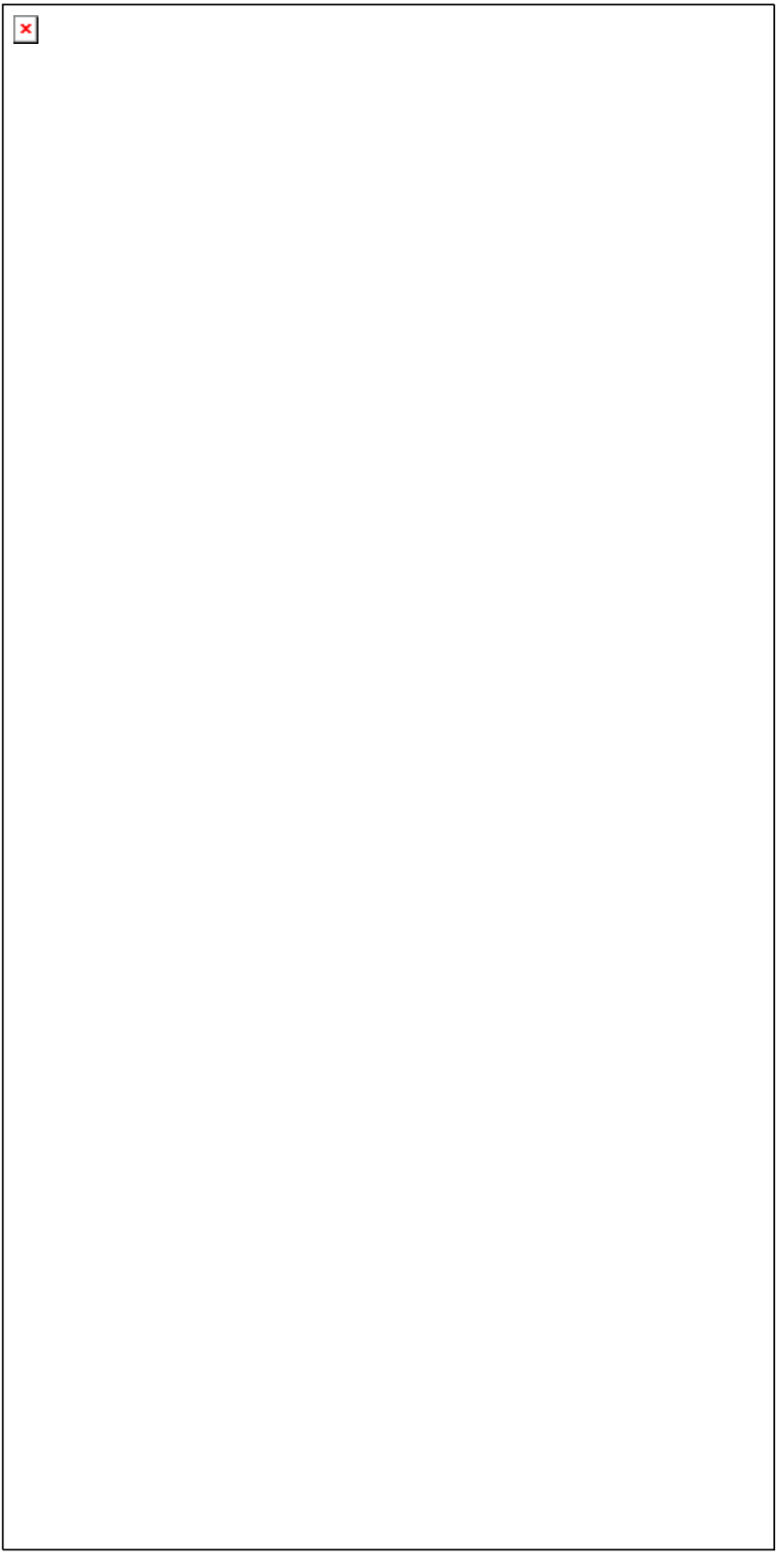
اقامت صلوٰۃ: نماز پڑھنے کیلئے قرآن پاک میں جا بجا ''اقامت صلوٰۃ'' (نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہیں بلکہ نماز کو اسکے آداب و ارکان و سنن کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں چنانچہ خوف کی حالت میں جہاں نماز کے بعض آداب و ارکان و شرائط کو معاف کر دیا گیا ہے' اسکے بعد ہی یہ کہا گیا ہے فاذا اطمانتم فاقیموا الصلوٰۃ ''پھر جب تم کو اطمینان ہو جائے تو نماز کو قائم کرو۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو اس کے تمام آداب و ارکان و شرائط کے ساتھ بجالایا جائے اس بناء پر نماز میں اطمینان' ارکان کا اعتدال' باطنی خضوع و خشوع ملحوظ رہنا چاہئے جس کے بغیر نماز ناقص رہتی ہے۔

قنوت: نماز کے آداب باطنی میں دوسری چیز قنوت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وقوموا للہ قانتین۔ (بقرہ: ۲۳۱)

اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو۔

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ پہلے نماز میں باتیں کر لیا کرتے تھے لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا کہ یہ یکسوئی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف ہے۔ قرآن پاک میں جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے وہ عجیب جامع لفظ ہے لغت میں (دیکھو لسان العرب) اس کے حسب ذیل معنی ہیں' چپ رہنا بندگی کرنا' دعا مانگنا' عبادت کرنا' کھڑے رہنا' دیر تک کھڑے رہنا' عاجزی کرنا۔ نماز کے جس کا اس آیت میں ذکر ہے اس کے متعدد معنوں میں سے ہر معنی نماز میں مقصود ہے کیونکہ نماز میں ذکر و قرأت' تسبیح و استغفار سلام و تشہد کے



نماز پڑھ' آدھی رات یا اس کے کچھ کم و بیش اور اس میں
قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ' ہم تجھ پر ایک بھاری بات اتارنے
والے ہیں' بیشک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنا نفس کو خوب زیر کرتا
ہے اور مؤثر ہوتا ہے' تیرے لئے دن کو بڑی فرصت ہے۔
اپنے پروردگار کا نام لے اور ہر چیز سے کٹ کر اس کی طرف
ہو جا۔

یعنی نماز کی حالت میں خدا کا ذکر کرتے وقت اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات نکل جانے چاہئیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عبسہ سلمی سے روایت ہے کہ مجھے آنحضرت ﷺ نے جو نماز سکھائی' اس کے متعلق یہ فرمایا کہ وضو کر کے جب کوئی نماز کیلئے کھڑا ہوا' پھر خدا کی حمد و ثناء کی اور خدا کی اس بزرگی کا اظہار کیا جس کا وہ سزاوار ہے اور اپنے دل کو خدا کے لئے ہر چیز سے خالی کر لیا (وفرغ قلبہ للہ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس کی ماں نے اس کو اسی وقت پیدا کیا ہو' یہ حدیث گویا اسی آیت کی تفسیر ہے۔

تضرع: تضرع کے معنی زاری اور عاجزی' اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہیں (لسان العرب) نماز میں بندہ پر عاجزی' زاری اور عجز و الحاح کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت ہونی چاہئے ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہوگا۔

ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ (اعراف:۷)

تم اپنے پروردگار کو مسکنت اور زاری کے ساتھ اور دھیمی آواز
سے پکارو۔

اخلاص: نماز کے باطنی سنن و آداب کا اصلی جوہر ''اخلاص'' ہے یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو کیونکہ اگر ایسا نہیں ہے تو نماز نماز نہیں بلکہ ریاء اور نمائش ہوگی اور بعض اہل حق کے نزدیک شرک لازم آئے گا۔ فرمایا:

واقیموا وجوھکم عند کل مسجد وادعوہ مخلصین لہ الدینط (اعراف:۳)

اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رخ کو ٹھیک رکھو اور خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارو۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اخلاص کا پیدا کرنا اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ ذکر: ''نماز'' خدا کی یاد کے لئے ہے' اگر دل میں کچھ اور زبان پر کچھ ہو تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہوگی اس لئے فرمایا:

اقم الصلوٰۃ لذکری۔ (طٰہٰ: ۱)

میری یاد کے لئے نماز کھڑی کر۔

ظاہر ہے کہ ''یاد'' صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں ہے' اس کے ساتھ دل کی معیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہئے اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے۔

فہم وتدبر: نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے اگر بے پروائی کی وجہ سے معنوں کی طرف دل متوجہ نہ ہوا تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا اس لئے نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے کہ اس حالت میں سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو میں نہیں' فرمایا:

لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون۔ (نساء:۷)

نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ (اتنا ہوش آ جائے کہ) جو تم کہو اس کو سمجھو۔

اس آیت پاک نے یہ واضح کیا کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے اسی بناء پر آپ نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے کہ اس میں بھی انسان فہم اور تدبر سے عاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث

میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''نماز میں جب تم پر نیند غالب آ جائے تو سو جاؤ کیونکہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کے بجائے اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگو۔(۲)۔'' دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا ''نمازی کو جب نیند آئے تو سو جانا چاہئے تا کہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے۔(۳)۔'' حاکم کی مستدرک میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے' یہاں تک کہ نماز ختم کر لے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔(۴)۔''

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہیں جن کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت برتنا' نماز سے غفلت ہے' اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لحاظ نہ کرنا بھی نماز سے غفلت ہے اور اس لئے اس آیت ذیل کے مصداق دونوں ہیں:

فویل للمصلین الذین هم عن صلاتهم ساهون الذین هم یرآء ون۔ (ماعون: ۱)

پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں جو دکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں۔

ذرا ان الفاظ پر غور کیجئے ''ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں' پھٹکار ہو۔'' نمازی ہونے کے باوجود نماز سے غافل ہونے کے یہی معنی ہیں کہ نماز کیلئے جو ظاہری آداب' مثلاً وقت کا لحاظ اور ادائے ارکان میں اعتدال وغیرہ اور جو باطنی آداب' مثلاً خشوع وخضوع' تضرع وزاری اور فہم وتدبر وغیرہ ضروری ہیں' ان سے نماز میں تغافل برتا جائے۔

نماز کے گذشتہ آداب کے مطابق آنحضرت ﷺ کی ہدایات' تعلیمات اور عملی مثالیں ہیں جن میں آپ نے نماز کی اصلی حقیقت کو آشکار کیا ہے۔ ایک دفعہ مسجد

نبوی میں ایک شخص نے آ کر نہایت عجلت میں نماز پڑھی' آپ نے فرمایا ''اے شخص! اپنی نماز پھر پڑھ کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔'' اس نے دوبارہ اسی طرح نماز ادا کی' آپ نے پھر وہی ارشاد فرمایا۔ جب تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے عرض کی یا رسول اللہ! کیسے نماز پڑھوں؟ فرمایا ''اس طرح کھڑے ہو' اس طرح قرأت کرو' اس طرح اطمینان وسکون کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرو (۵)۔''

(۱)۔ صحیح مسلم جلد اول باب الاوقات التی نهی عن الصلوٰة فیها۔ (۲)۔ مسلم کتاب الصلوٰة باب امر من نعس فی صلاته ج ۱ ص ۲۹۳۔ (۳)۔ بخاری و ابوداؤد و مسند احمد عن انسؓ۔ (۴)۔ مستدرک (ترغیب و ترهیب حافظ منذری جلد اول ص ۷۳ مصر) اس سے ان مسلمانوں کو جو عربی زبان نہیں سمجھتے عبرت حاصل کرنی چاہئے ورنہ چاہئے کہ نماز میں جو سورتیں اور دعائیں وہ پڑھتے ہیں' ان کے معنی ذہن نشین کرلیں اور یہ ہر مسلمان کیلئے بہت آسانی سے ممکن ہے' بشرطیکہ وہ تھوڑی توجہ کرے۔ (۵)۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم و ابوداؤد کتاب الصلوٰة۔

نماز میں نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا خشوع کے خلاف ہے اس سے انسان کی توجہ ہٹتی اور حضور قلب میں خلل پڑتا ہے۔ اس لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''نماز میں ادھر ادھر نہ دیکھا کرو' کیا تمہیں یہ ڈر نہیں کہ تمہاری نظر واپس نہ آ سکے۔ (۱)۔'' آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ''جب تک بندہ نماز میں دوسری طرف ملتفت نہیں ہوتا خدا اس کی طرح ملتفت رہتا ہے اور جب وہ خدا کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے تو خدا بھی اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے۔ (۲)۔'' طبرانی میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص نماز کیلئے کھڑا ہو تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ رہے یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے اور نماز میں منہ پھیر کر ادھر ادھر نہ دیکھو کیونکہ جب تک تم نماز میں خدا سے باتیں کر رہے ہو۔ (۳)۔ مسند بزار میں ہے کہ ''جب بندہ نماز میں ادھر ادھر دیکھتا ہے تو خدا فرماتا ہے تو کدھر دیکھتا ہے؟ کیا تیرے نزدیک مجھ سے بھی بہتر کوئی چیز ہے؟ تو میری طرف دیکھ۔'' دوسری دفعہ بھی

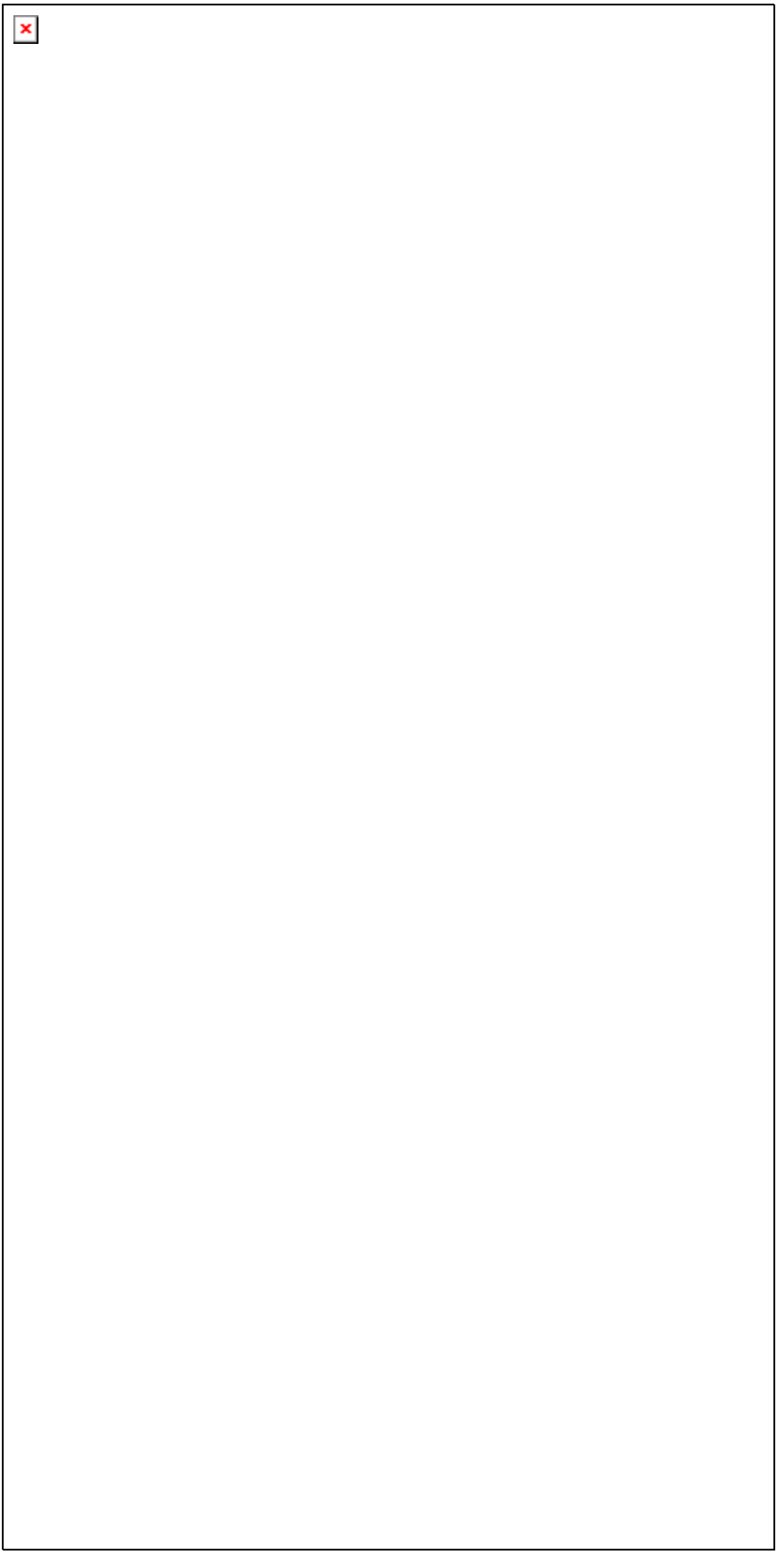
خدا یہی فرماتا ہے۔ پھر تیسری دفعہ جب اس سے یہ حرکت صادر ہوتی ہے' تو خدا اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے۔(۴)۔''

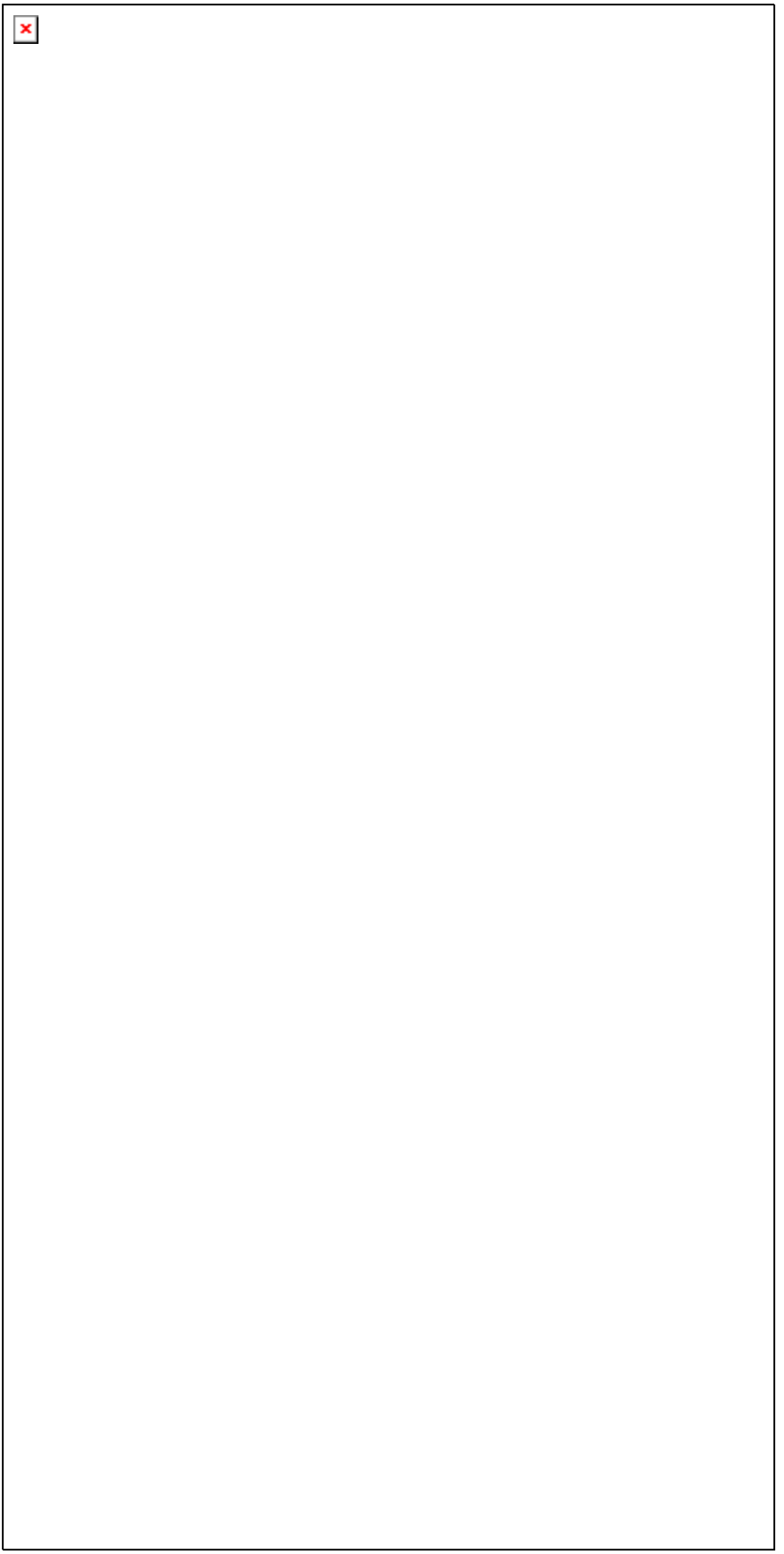
ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا ''سب سے بڑا چور وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے۔'' صحابہؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! نماز کی چوری کیا ہے؟ فرمایا ''رکوع اور سجدہ اچھی طرح نہ کرنا اور خشوع نہ ہونا۔(۵)۔'' ایک دفعہ آپؐ نے نماز سے فارغ ہو کر آخری صف کے ایک شخص کو آواز دی کہ ''اے فلاں! تو خدا سے نہیں ڈرتا کس طرح نماز پڑھتا ہے؟ جب کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنے رب سے باتیں کرتا ہے پس سوچنا چاہئے کہ اس سے کس طرح باتیں کرے۔(۶)۔'' صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ ''کیا تو نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھتا' کیا نماز پڑھنے والا جب نماز پڑھتا ہے تو یہ نہیں سمجھتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھ رہا ہے۔ تو اپنے ہی فائدے کیلئے نماز پڑھتا ہے۔(۷)۔'' نماز کی حالت میں تھوکنا اور خصوصًا سامنے تھوکنا ادب کے خلاف ہے' آپؐ نے صحابہ سے فرمایا کہ ''نماز کی حالت میں خدا تمہارے سامنے ہوتا ہے تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اس کے سامنے تھوکو۔(۸)۔'' دوسری روایتوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''نماز میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کہ اس وقت وہ خدا سے باتیں کرتا ہوتا ہے۔(۹)۔'' مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''نماز میں خدا تمہارے منہ کے سامنے ہوتا ہے۔(۱۰)۔''

نماز میں سکون اور اطمینان پیدا کرنے کی بھی آپ نے ہدایتیں فرمائی ہیں ارشاد ہوا کہ ''جب نماز ہو رہی ہو (اور تم باہر سے آؤ) تو دوڑ مت آؤ بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پر سکون اور وقار طاری ہو۔(۱۱)۔'' اس اول تو یہ مقصود ہے کہ خود اس شخص پر سکون و اطمینان طاری رہے' دوسرے یہ کہ اس کی دوڑ یا چال سے دوسرے نمازیوں کے

---

(۱)۔ مسند احمد بن جابر بن سمرہ۔ (۲)۔ مسند احمد جلد ۵ ص ۲۷۲ و ابوداؤد باب الالتفات فی الصلوۃ۔ (۳)۔ طبرانی فی الاوسط





مسلم و ابوداؤد و موطائے امام مالک و ترمذی و حاکم فی الصلوٰۃ۔ (۳)۔ صحیح مسلم باب تحریم الکلام فی الصلوٰۃ۔ (۴)۔ صحیح مسلم باب کراہتہ الصلوٰۃ فی ثواب لہا اعلام۔ (۵)۔ صحیح بخاری و مسلم کتاب اللباس۔ (۶)۔ صحیح مسلم باب النہی عن الاوقات الثلث۔ (۷)۔ صحیح بخاری کتاب الایمان۔ (۸)۔ ترمذی و ابوداؤد باب البکاء فی الصلوٰۃ۔

رات کی نمازوں میں آنحضرت ﷺ پر عجیب ذوق وشوق کا عالم طاری ہوتا تھا۔ قرآن پڑھتے چلے جاتے جب خدا کی عظمت و کبریائی کا ذکر آتا پناہ مانگتے' جب رحم وکرم کی آیتیں آتیں تو دعا کرتے۔(۱)۔آپؐ نے فرمایا کہ ''نماز دو رکعت کر کے ہے' اور ہر دوسری رکعت میں تشہد ہے اور تضرع وزاری ہے' خشوع اور خضوع ہے' عاجزی ہے اور مسکنت ہے اور ہاتھ اٹھا کر اے رب! اے رب! کہنا ہے' جس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص ہے۔(۲)۔''

ایک دفعہ آپ ﷺ اعتکاف میں تھے اور لوگ مسجد میں زور زور سے قرأت کر رہے تھے' آپ ﷺ نے فرمایا ''لوگو! تم میں سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے' تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور ایک دوسرے کی مناجات میں اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو۔(۳)۔''

ایک صحابی نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے کچھ ہدایت فرمائیے' ارشاد ہوا کہ ''جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تمہاری نماز ایسی ہونی چاہئے کہ یہ معلوم ہو کہ تم اسی وقت مر رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو۔(۴)۔'' کیا نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے۔

اس پوری تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لے کر اترا ہے؟ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی اصلی کیفیتیں کیا کیا ہیں؟ اور اگر نماز یہ نماز ہو تو وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا مؤثر ذریعہ ہے' اسی لئے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے۔

والذین یئومنون بالاخرۃ یئومنون بہ وھم علی صلوتھم یحافظون۔ (انعام: ۱۱)

اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن کو مانتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں۔

نماز کی اس نگہداشت اور محافظت کے دو معنی ہیں اور دونوں یہاں مقصود ہیں یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرے اس کے باطنی آداب کی رعایت۔

نماز کے اخلاقی' تمدنی اور معاشرتی فائدے::

نماز تو درحقیقت ایمان کا ذائقہ' روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی' اخلاقی' تمدنی اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے اخلاقی و تمدن و معاشرت اصلاحات وجود میں آئیں ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا۔ اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی' وحشی اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر' پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا اب اکسیر بن جاتا ہے۔

(۱)۔ مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۹۳ (۲)۔ ابوداؤد باب الصلوۃ

النسائی و ترمذی باب ما جاء فی التخشع فی الصلوٰۃ ص ۷۱ مطبوعہ دھلی۔ (۳)۔ ابوداؤد صلوٰۃ اللیل۔ (٤)۔ مسند احمد' جلد ۵ ص ٤۱۲ عن ابی ایوب۔

۱۔نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز ''ستر پوشی'' کا خیال ہے' انسان کا' شرم وحیا کی نگہداشت کے لئے' اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے۔عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے' بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پرواہ تھے' یہاں تک کہ غیر قریشی عورتیں جب حج کے لئے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھیں' اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں' اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا' یہاں تک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں' آیت نازل ہوئی:

خذوا زینتکم عند کل مسجد۔ (اعراف:۳)

ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔

مردوں کے لئے کم از کم ناف سے گھٹنے تک اور عورتوں کے لئے پیشانی سے لے کر پاؤں تک چھپانا نماز میں ضروری قرار پایا' اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہاں جہاں گیا وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر عورت پر مجبور کیا اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لئے ان کو ستر پوش بنا دیا۔ افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لباسوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے' دوسری طرف متمدن قومیں زیب و زینت اور حسن و آرائش اور تمدن کے بے اعتدالی سے بے حیائی پر اتر آئی ہیں' مرد گھٹنوں سے اونچا لباس اور عورتیں نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنتی ہیں' نماز ان کی بھی اصلاح کرتی ہیں اور ان متمدن قوموں کو اعتدال سے تجاوز نہیں کرنے دیتی۔ چنانچہ عورتوں کو تیز خوشبو لگا کر مسجد میں جانے سے منع فرمایا اور بے حیائی کے کپڑوں کے پہننے سے عموماً روک دیا

ہے اور کہہ دیا ہے کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

۲۔ اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے جو اسلام کے اولین احکام میں سے ہے' اقراء کے بعد دوسری ہی وحی کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی اس میں یہ حکم تھا:

وثیابك فطهر۔ (مدثر: ۱)

اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے اور نماز کی درستی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن اور اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہو۔ اہل عرب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت و نظامت کو مطلق تمیز نہ تھی' یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجد نبوی میں آ کر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا' صحابہؓ اس کو مارنے کو دوڑے' آپ ﷺ نے ان کو روکا اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ ''یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ اس قسم کی نجاستوں کے لئے یہ موزوں نہیں ہے۔'' اور صحابہؓ سے فرمایا کہ اس نجاست پر پانی بہا دو۔ ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے آپ ﷺ گزرے تو فرمایا کہ ''اس قبر والے پر اس لئے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔'' غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لئے تھی' اہل عرب اور عام مسلمانوں کو پاک و صاف رہنے کا خوگر بنایا اور استنجاء بیت الخلاء اور طہارت کے وہ آداب سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومیں بھی ناآشنا ہیں۔

نجاستوں سے اپنے بدن' کپڑے اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم دی' جو صحابیؓ طہارت کا اہتمام کرتے تھے خدا نے ان کی مدح فرمائی:

فیہ رجال یحبون ان یتطھروا واللہ یحب المطھرین۔ (توبہ:۱۳)

اس مسجد میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ وہ پاک اور صاف رہیں اور اللہ تعالیٰ پاک و صاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

جب اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کرسکتا ہے۔

۳۔نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضاء کے پاک اور ستھراء رکھنے پر مجبور کرتی ہے' دن میں عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منہ ہاتھ پاؤں جو اکثر کھلے رہتے ہیں' ان کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے' ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہے' ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے یہ کہا کہ آج کل کے جراثیم کے نظریہ کی بناء پر بہت سی بیماریوں ناک کی سانس کے ذریعہ جراثیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہیں اور ناک کے نتھنوں کو پانی ڈال کر صاف کرنے سے یہ جراثیم دور ہوتے ہیں۔

دنیا میں اسلام کے سواء اور کوئی مذہب نہیں ہے جس نے ناک میں پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو۔ حالانکہ طبی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری ہے' اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر طبعی اصولوں پر مبنی ہیں نمازیوں کو پختہ وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہے کہ یہ حکم نازل ہوا اس ملک میں جہاں پانی سب سے زیادہ کمیاب ہے۔

اہل عرب اور خصوصاً بدو دانتوں کو بہت کم صاف کرتے تھے' جس سے گندہ دہنی اور بدنمائی کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں' آنحضرت ﷺ نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی اور

فرمایا کہ ''اگر میری امت پر یہ شاق نہ گزرتا تو میں اس کو ضروری قرار دیتا۔''
اسی پانی کی وجہ سے اہل عرب نہاتے کم تھے' ان کے کپڑے عموماً اون کے ہوا کرتے تھے' وہ محنت مزدوری کرتے تھے جس سے پسینہ میں شرابور ہو جاتے تھے اور چونکہ ایک ایک کپڑے کو ہفتوں پہنے رکھتے تھے اس لئے جب مسجد میں وہ نماز پڑھنے آتے تو ان کے بدن اور کپڑوں سے بدبو آتی تھی۔ اس بناء پر اسلام نے ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمعہ کو نماز سے پہلے غسل کرنا اور نہانا سب پر واجب کر دیا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

غسل یوم الجمعہ واجب علی کل محتلم

(بخاری' کتاب الجمعہ)

جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری ہے۔

اسی کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا' خوشبو ملنا اور صفائی و نظافت کے دوسرے امور کو مستحسن قرار دیا' بعض حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا جس کے بغیر کوئی نماز ممکن ہی نہیں' فرمایا:

وان کنتم جنبا فاطھروا۔ (مائدہ:۲)

اور اگر تم ناپاک ہو گئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ۔

۴۔ پابندی وقت::

انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے کہ اس کے تمام کام مقررہ اوقات پر انجام پائیں۔ انسان فطرۃً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے اس کو پابند اوقات بنانے کیلئے ضروری ہے کہ اسکے بعض کاموں کے اوقات جبراً مقررہ کر دیئے جائیں' جیسا کہ کاروبار کے کاموں میں آپ کو اصول نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی ان کی خاطر مقررہ کر لیتا ہے اور اس طرح اسکی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے اور اس کا وقت فضول برباد نہیں

ہوتا۔نماز کے اوقات چونکہ مقررہ ہیں اس لئے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں خصوصًا نماز باجماعت کے‘ان کے اوقات خودبخود منظم ہوجاتے ہیں۔وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا ان کیلئے ضروری ہوجاتا ہے‘مشہور صحابی حضرت سلیمان فارسی کا مقولہ ہے۔

الصلوہت مکیال فمن ادنی اوفی بہ و من طفف فقد علمتم مالمطففین۔ (۱)۔

نماز ایک پیمانہ ہے جس نے اس سے پورا ناپا اس کو پورا ناپ کر دیا جائے گا اور جس نے ناپنے میں کمی کی تو تمہیں کم ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے۔

اس قول کے جہاں اور مطلب ہوسکتے ہیں‘یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہے اسی لئے اس کی ہر چیز ناپی جاسکتی ہے۔

۵۔صبح خیزی::

طب اور حفظان صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے وہ مخفی نہیں‘جو لوگ نماز کے پابند ہیں وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرسکتے جب تک رات کو وقت پر سویا نہ جائے گا‘صبح کو وقت پر آنکھ نہیں کھل سکتی‘اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رات کو نماز عشاء کے بعد بیکار باتیں کرنے سے اور قصہ کہانی کہنے سے منع فرمایا ہے۔(۲)۔ تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے اور صبح خیزی مسلمانوں کی عادت ہوجائے اور صبح کو مؤذن کی پرتاثیر آواز:

الصلوہت خیر من النوم۔

سونے سے نماز بہتر ہے۔

ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھادے۔

۶۔خدا کا خوف::

ایک مسلمان جونماز پڑھتا ہے جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم ڈگمگاتا ہے تو رحمت الٰہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے' اس کو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے' اس کا ضمیر ملامت کرتا ہے' وہ لوگوں سے اس بناء پر شرماتا ہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے کہ اس کے پاؤں بدی کے راستہ پر پڑتے وقت کانپتے ہیں' غرض نماز انسان کے اخلاقی حاسہ کو بیدار کرتی ہے اور برائیوں سے بچاتی ہے اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے:

ان الصلوہت تنہی عن الفحشاء و المنکر۔):(

بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔

۷۔ہشیاری::

نماز عقل' ہوش' بیداری اور آیات الٰہی میں تدبر اور غور' خدا کی تسبیح و تہلیل اور اپنے لئے دعائے مغفرت کا نام ہے اس لئے وہ تمام چیزیں جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم و احساس کو کھو دیں' نماز کی حقیقت کی منافی ہیں' اسی لئے اس وقت بھی جب شراب کی ممانعت نہیں ہوئی تھی اس کو پی کر نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا جائز نہ تھا۔

(۱)۔ کنزالعمال مندوبات الصلوۃ ٤ ص ۲۳۰ بحوالہ مصنف عبدالرزاق۔ (۲)۔ بخاری کتاب الصلوۃ باب ما یکرہ من السمر بعد العشاء۔

لا تقربوا الصلوہت و انتم سکاری۔ حتی تعلموا ما تقولون۔ (نساء:۷)

نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب نہ جاؤ یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو کچھ کہتے ہو۔

اس بناء پر ایک نماز کا پابند تمام ایسی چیزوں سے جو اس کی عقل و ہوش کو گم دیں قطعاً پرہیز کرے گا۔

۸۔ مسلمان کا امتیازی نشان::

مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین اور منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی۔ قانون ان دونوں گروہوں میں کوئی امتیاز نہیں کرسکتا تھا' احکام میں حج ایک ایسی چیز ہے جس کے اہل عرب مدت سے خوگر تھے اس کے علاوہ ان کے مذاق کی چیز تھی' خلائق کا اجتماع ایک میلے کی صورت اختیار کرلیتا تھا۔ جو عرب کے تمدن کا ایک لازمی جزو تھا' فخر و امتیاز کے موقعے بھی اس میں حاصل ہو سکتے تھے' گو اسلام نے اس کی اصلاح کر دی' زکوٰۃ کوئی حد فاصل نہیں ہوسکتی تھی۔ کیونکہ اکثر منافقین متمول تھے اور یہ جاہ و فخر کا بھی ذریعہ ہوسکتی تھی اس کے ساتھ یہ عرب کے فیاض طبیعت پر بھی گراں نہیں ہوسکتی تھی۔ فقراء کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے' صرف معمولی تحریک کی ضرورت تھی' روزہ بھی اس کا معیار نہیں قرار دیا جا سکتا تھا کیونکہ روزہ میں چھپے چوری کھا پی لینے کا موقع بہ آسانی حاصل ہوسکتا ہے' صرف نماز ایک ایسی چیز ہے جو ان دونوں گروہوں میں حد فاصل ہوسکتی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے اس فریضہ میں سستی کو منافقین کی خاص پہچان قرار دیا:

واذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالی۔

(نساء: ۱۲)

اور جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہیں تو کسل مندی کے ساتھ اٹھتے ہیں۔

نیز فرمایا:

وانھا لکبیرۃ الا علی الخاشعین۔ (بقرہ:۵)

خضوع و خضوع والوں کے علاوہ نماز سب پر گراں ہے۔

خصوصًا عشاء اور فجر کی نماز کی نسبت کہ یہ راحت کے اوقات ہیں' آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

لیس صلوہت اثقل علی المنافقین من الفجر والعشاء (۱)۔

منافقین پر فجر وعشاء سے زیادہ کوئی نماز گراں نہیں ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ "جب ہم (صحابیؓ) کسی کو عشاء اور صبح کی نمازوں میں غیر حاضر پاتے تھے' تو ہم اس سے بدگمان ہو جاتے تھے۔(۲)۔

مدینہ میں آ کر نماز میں قبلہ کی تبدیلی جہاں اور مصلحتوں سے تھی' وہاں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اس سے مخلصین اور منافقین کی تمیز ہو سکے۔ مکہ معظمہ کے لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قائل تھے' بیت المقدس کی طرف منہ کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ مدینہ میں یہود آباد تھے جن میں کچھ مسلمان ہو گئے تھے وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہیں کرتے تھے' اس لئے عرب منافقین کی پہچان بیت المقدس کے قبلہ بنانے سے' اور یہود منافقین کی پہچان کعبہ کے قبلہ بنانے سے ہو سکتی۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

(۱)۔ بخاری کتاب الصلوٰۃ باب فضل صلوٰۃ العشاء فی الجماعۃ۔
(۲)۔ مستدرک حاکم (علی شرط الشیخین) ج ۱ ص ۲۱۱

وما جعلنا القبلۃ التی کنت علیہا الا لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیہ وان کانت لکبیرۃ الا علی الذین ہدی اللہ (بقرہ:۱۷)

اور جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے قبلہ نہیں بنایا لیکن اس لئے تا کہ ہم ان کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں' ان سے الگ کر دیں جو الٹے پاؤں پھر جائیں گے اور یہ قبلہ گراں ہوا لیکن ان پر جن کو خدا نے راہ دکھائی۔

یہ پہچان اور شناخت اب قیامت تک قائم رہے گی اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، وہ مسلمان ہے۔(۱)۔

۹۔ باطل کی شکست اور حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے اس فرض کے انجام دینے کے لئے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہئے، اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازیں ہیں۔ چنانچہ ابوداؤد میں ہے:

کان النبی ﷺ وجیوشہ اذا علوا الثنایا کبروا واذ اھبطوا سجوا فوصنعت الصلوہت علی ذلک۔ (ابو دائود)

آنحضرت ﷺ اور آپ کا لشکر جب پہاڑی پر چڑھتا تھا تو تکبیر اور جب نیچے اترتا تھا تو تسبیح کہتا تھا، نماز اسی طریقے پر قائم کی گئی۔

صف بندی، ایک افسر (امام) کی اطاعت، تمام سپاہیوں (نمازیوں) کی باہم محبت اور دستگیری اور ایک تکبیر کی آواز پر پورے صفوف کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو صف جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے اور ان کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے۔ جاڑوں میں پانچ وقت وضو کرنا، ظہر کے وقت دھوپ کی شدت میں گھر سے نکل کر مسجد کو جانا، عصر کے وقت لہو ولعب کی دلچسپیوں سے وقت نکال کر خدا کو یاد کرنا، رات کو سونے سے پہلے دعا و زاری کر لینا، صبح کو خواب سحر کی لذت کو چھوڑ کر حمد باری میں مصروف ہونا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم فرضی راحت و تکلیف سے بے پروا ہو کر عمل کی طاقت اپنے میں پیدا کریں اور کام کی ضرورت کے وقت احساس فرض کے تقاضے کو بجالانا ضروری سمجھیں اور اس کیلئے عارضی تکلیفوں کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائیں ہفتہ میں ایک دن نماز جمعہ کے لئے شہر کے سب مسلمانوں کا ایک جگہ جمع

ہونا' دن رات کے پر آرام سے پر آرام وقت میں ممکن تھا مگر اس کیلئے بھی دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا تا کہ اس اجتماعی اور مظاہرہ میں بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہیں اور نماز جمعہ کا ہر پابند شہادت دے گا کہ اس کی اتنی سی یہ عادت مشکلات وقت کے اتفاقات میں اس کیلئے کس قدر ممد ثابت ہوتی ہے۔

۱۰۔تمام عبادات' بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیل اخلاق ہے لیکن اصلاح اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہر وقت بیدار اور اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ رہے' تمام عبادات میں صرف نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار رکھ سکتی ہے' روزہ' حج' زکوٰۃ اولاً ہر شخص پر فرض نہیں ہیں اس کے ساتھ روزہ سال میں ایک بار فرض ہوتا ہے' زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے' حج عمر میں ایک بار ادا کرنا پڑتا ہے۔اس لئے یہ فرائض نفس کو تنبہ اور بیداری کا دائمی اور ہر روزہ ذریعہ نہیں ہو سکتے۔برخلاف ان کے نماز دن میں پانچ بار ادا کرنی ہوتی ہے' ہر وقت وضو کرنا پڑتا ہے' سجدہ' رکوع' قیام وقعود' جہر وخفاء' تسبیح وتہلیل' تکبیر وتشہد نے اس کے ارکان و اعمال میں نوع و امتیاز پیدا کر دیا ہے جن میں ہر چیز نفس میں تدریجی اثر پذیری کی قابلیت پیدا کرتی ہے اور ہر چوبیس گھنٹہ میں چند گھنٹوں کے وقفہ سے نفس انسانی کو ہشیار اور قلب خفتہ کو بیدار کرتی ہے اس طرح نفس کو دن رات تنبہ ہوا کرتا ہے۔

(۱)۔ بخاری باب فضل استقبال القبلته۔

۱۱۔ الفت ومحبت ::

نماز مسلمانوں میں باہمی الفت ومحبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔محلّہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن میں پانچ دفعہ جمع ہوں اور باہم ایک دوسرے سے ملیں تو ان کی بیگانگی دور ہو گی' ان میں آپس میں محبت اور الفت پیدا ہو گی' اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے۔قرآن پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے:

واتقوہ واقیموا الصلوہت ولا تکونوا من المشرکینلا من الذین فرقوا دینھم و کانوا شیعا۔ (روم: ۳۲)

خدا سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔ ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور بہت سے جتھے ہو گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اجتماع مسلمانوں کو جتھابندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا ہے کہ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی رہے گی تو غلط فہمیوں کا موقع کم ملے گا۔

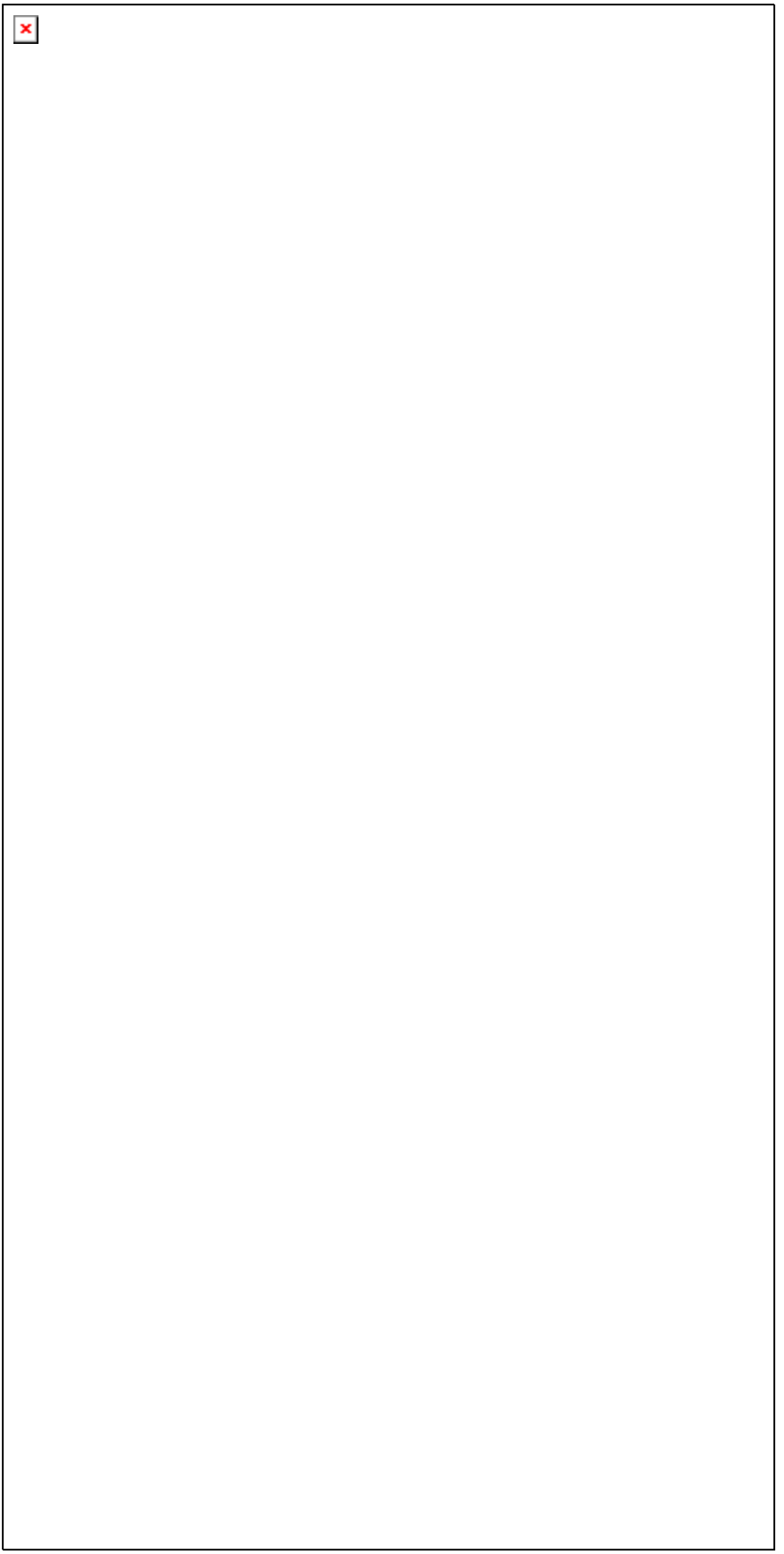
۱۱۔ غمخواری::

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانوں میں باہمی ہمدردی اور غمخواری کا ذریعہ بنتی ہے۔ جب امیر و غریب سب ایک جمع ہوں گے اور امراء اپنی آنکھ سے غریبوں کو دیکھیں گے تو ان کی فیاضی کو تحریک ہوگی' ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہوگی اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی۔

ابتدائے اسلام میں اصحاب صفہ کا ایک گروہ تھا جو سب سے زیادہ مستحق اعانت تھا' یہ گروہ مسجد میں رہتا تھا۔ صحابہ نماز کو جاتے تو ان کو دیکھ کر خود بخود ہمدردی پیدا ہوتی تھی۔ چنانچہ اکثر صحابی کھجور کے خوشے لے جا کر مسجد میں لٹکا دیتے تھے جس پر یہ گروہ گزر اوقات کرتا تھا۔ اکثر صحابہ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر ان لوگوں کو ساتھ لاتے اور اپنے گھروں میں کھانا کھلاتے تھے' اب بھی مساجد خیرات وصدقات کا ذریعہ ہیں' یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز اور زکوۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔

ویقیمون الصلوہت و مما رزقنھم ینفقون۔ (بقرہ: ۱)

اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے



۱۴۔کاموں میں تنوع::

انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ ہمرنگی کے باوجود تفنن اور تجدد کا طالب ہے لیکن اگر انسان کے دل و دماغ' اعضاء و جوارح ہر وقت اسی ایک کام میں مصروف رہیں تو سکون و اطمینان' عیش و راحت اور دلچسپی کی لذت جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے' مفقود ہو جائے' مفید سے بھی مفید کام سے دنیا چیخ اٹھے' اسی لئے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مفید طریقے پر کی ہے جس میں انسان کو حرکت و سکون دونوں کا یکساں موقع ملتا رہتا ہے' رات اور دن کا اختلاف اس بناء پر آیات الٰہی میں شمار کیا گیا ہے کہ اس تغیر و تبدل سے نظام عالم میں نیرنگی پیدا ہوتی ہے اور اس تقسیم سے انسانوں میں اپنے کام کی لذت قائم رہتی ہے' نماز ایک ایسا فریضہ ہے جو نہ تو ہر لمحہ اور ہر لحظہ انسان پر فرض ہے اور نہ سال میں ایک دفعہ یا عمر بھی میں صرف ایک دفعہ فرض ہے بلکہ ہر روز پانچ دفعہ اس کو ادا کرنا پڑتا ہے' صبح سے کام شروع کیا تو ظہر پر آ کر توڑ دیا۔ پھر مشغولیت ہوئی اور عصر پر پہنچ کر ختم ہوئی۔ پھر جو سلسلہ چھڑا اس کا مغرب پر خاتمہ ہوا۔ بعد ازیں خانگی مصروفیت شروع ہوئی اور عشاء پر جا کر منتہی ہوئی' اب نیند آ گئی اور صبح تک بے خبری رہی۔ اٹھے تو دعاؤں کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا۔ وہ دولت مند جو جسمانی یا دماغی محنت و مشقت اور مزدوری سے اپنی روزی نہیں حاصل کرتے وہ اس روحانی ''انٹرول'' (وقفہ) کے لطف سے آگاہ نہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان چند گھنٹوں تک ایک ہی قسم کی محنت کے بوجھ سے جو دبا جاتا ہے۔ وہ چند منٹ میں ہاتھ منہ دھو کر دعا و تسبیح' اور نشست و برخاست کے ذریعہ اس سے ہلکا ہو گیا اور پھر سے اس نے اپنے کام کے لئے نئی قوت پیدا کر لی۔

۱۵۔تربیت::

انسان کی عملی کامیابی استقلال اور مواظبت پر موقوف ہے کہ جس کام کو اس نے شروع کیا پھر اس پر عمر بھر قائم رہے اسی کا نام عادات و اخلاق کی استواری اور کیرکٹر

کی مضبوطی ہے جس کام میں اس خلق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضرور ہے کہ روزانہ ہو بلکہ دن میں کئی دفعہ ہو۔ نماز ایک ایسا فریضہ ہے جس کے بار سے عہدہ برآ ہونے کے لئے انسان میں استقلال، مواظبت اور مداومت شرط ہے اس لئے انسان میں اس اخلاقی خوبی پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی اسی لئے قرآن پاک نے صحابہؓ کی مدح میں فرمایا:

الذین ھم علی صلوتہم دآئمون۔ (معارج: ۱)

وہ جو اپنی نماز مداومت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

احب العمل الی اللہ ادومہ وان قل۔ (ابوداؤد باب مایومر بہ من القصد فی الصلوہت)

محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے گو وہ کم ہو۔

۱۶۔ نظم جماعت::

کسی قوم کی زندگی، اس کی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے، اسلام میں نماز با جماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا، ایک دوسرے سے شانے سے شانہ ملانا اور یکساں حرکت و جنبش کرنا ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے۔ جس طرح نماز کی درستی اس صف اور نظام جماعت کی درست پر موقوف ہے اسی طرح پوری قوم کی زندگی اس باہمی تعاون، تضامن، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صفوف کی درستی پر بہت زور دیتے تھے

اورفرماتے تھے کہ ''جب تم خوب مل کر کھڑے نہ ہوگے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے۔(۱)۔''

۱۷۔مساوات::

یہی جماعت کی نماز مسلمانوں میں برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی درسگاہ ہے یہاں امیر وغریب' کالے گورے' رومی' حبشی' عرب وعجم کی کوئی تمیز نہیں ہے سب ایک ساتھ' ایک درجہ ایک صف میں کھڑے ہوکر خدا کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں' جماعت کی امامت کے لئے حسب ونسب' نسل وخاندان' رنگ وروپ' قومیت اور جنسیت' عہدہ اور منصب کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ علم و دانش' فضل وکمال اور تقوی وطہارت کی ضرورت ہوتی ہے' یہاں شاہ وگدا اور شریف ورذیل کی تفریق' سب ہی ایک زمین پر ایک امام کے پیچھے' ایک صف میں دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی مشق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے۔کیا مسلمانوں کی معاشرتی جمہوریت کی یہ درسگاہ کہیں اور بھی قائم ہے۔

۱۸۔اطاعت::

جماعت کی سلامتی بغیر ایک مفترض الطاعۃ امام کے ناممکن ہے جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرے نماز باجماعت مسلمانوں کو اسی زندگی کا رمز ہے کہ جس طرح ان کی اس عبادت کا ایک امام ہے جس کے اشارہ پر وہ حرکت کرتے ہیں۔اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہئے جس کے اللہ اکبر کی آواز قوم کے کاروان کے لئے بانگ درا اور صدائے جرس ثابت ہو۔

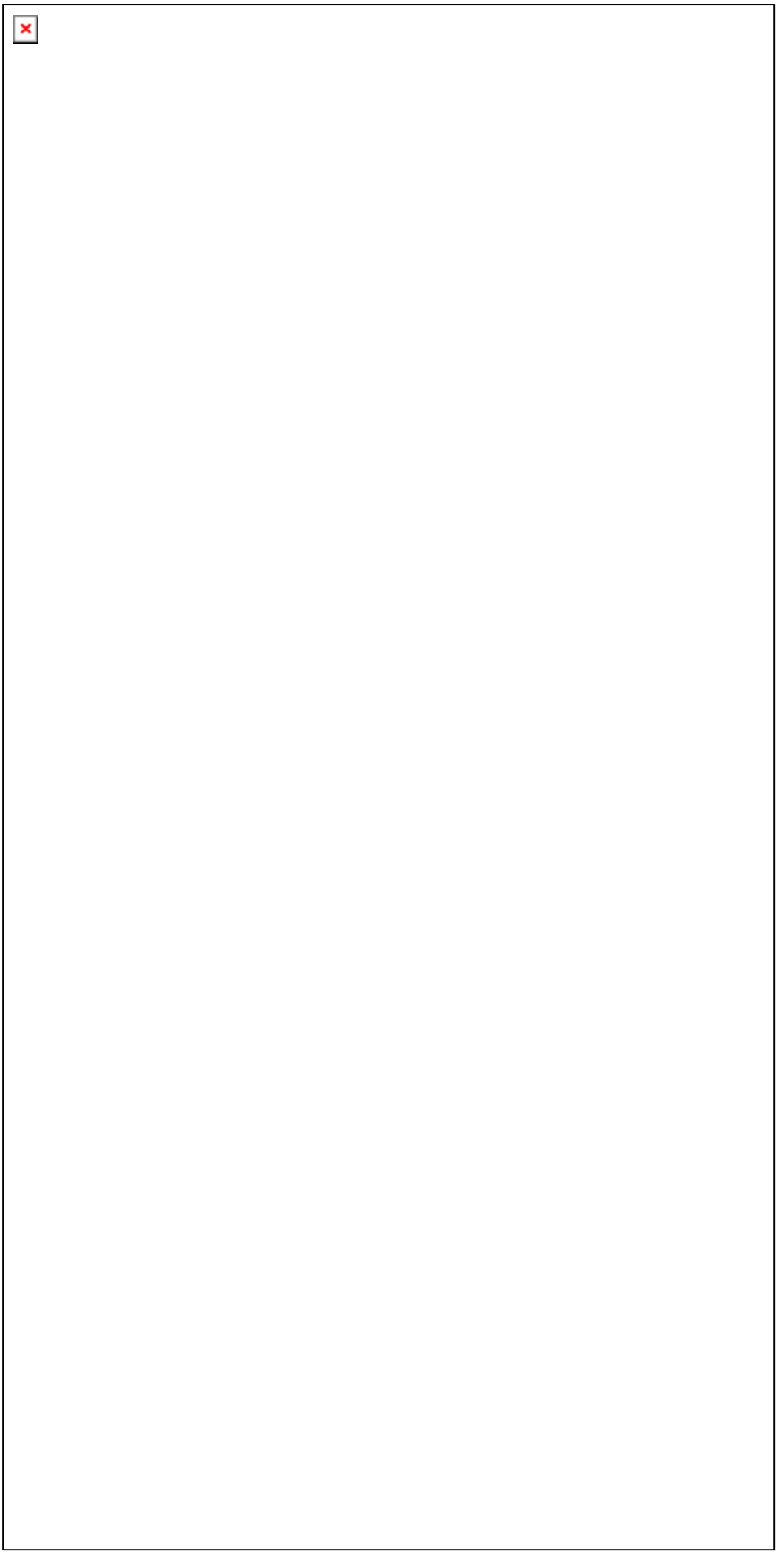
اطاعت امام کیلئے ایک طرف تو قوم میں فرمانبرداری کی قابلیت موجود ہونی چاہئے جس کی تعلیم مقتدیوں کو نماز میں ہوتی ہے۔دوسری طرف امام کو اخلاق صالحہ کی ایک ایسی مثال پیش کرنی چاہئے جو ہمیشہ لوگوں کے پیش نظر رہے۔نماز ان دونوں

چیزوں کا مجموعہ ہے۔ وہ ایک دائمی حرکت ہے جو قوم کے اعضاء و جوارح کو ہر وقت اطاعت گزاری کے لئے تیار رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ نماز پنجگانہ اور جمعہ و عیدین کی امامت خاص امام کا حق ہے۔ اس لئے ہر وقت قوم کو اس کے اعمال کے احتساب' اس پر نکتہ چینی' اس سے اثر پذیری کا موقع ملتا ہے' نماز کے اوقات خاص طور پر موزوں ہیں جو ایک عیاش اور راحت طلب شخص کا پردہ فاش کر دیتے ہیں ایک ایسا شخص جو شب بھر عیش و عشرت میں مصروف ہو۔ نماز صبح میں شریک نہیں ہو سکتا' ایک راحت طلب آدمی ظہر کے وقت دھوپ کی شدت برداشت کر کے شریک جماعت ہونا پسند نہیں کر سکتا۔ چنانچہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنو امیہ کا زمانہ آیا تو صحابہ کو خاص طور پر اس کا احساس ہوا اور بے خوف نگاہوں نے ان پر نکتہ چینیاں کیں' احادیث میں بھی خاص طور پر اس زمانہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں آئمہ وقت پر نماز ادا کرنے میں غفلت کریں گے۔

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الصلوۃ باب تسویتہ الصفوف عند الاقامتہ و بعدھا و ابوداؤد کتاب الصلوۃ باب تسویتہ الصفوف۔

۱۹۔ معیار فضیلت::

نماز کی امامت کیلئے چونکہ سوائے علم و فضل اور تقوی کے کوئی اور قید نہیں ہے' اس لئے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لئے ہر وقت ہے' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحب علم (اقراء) ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے' ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کیلئے آئے' دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ان میں سے جو صاحب سب سے زیادہ کمسن ہیں انہیں کو قرآن زیادہ یاد ہے۔ چنانچہ آپ نے اسی کمسن صحابی کو ان کا امام مقرر فرمایا' اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں اس کے ذریعہ سے علمی و عملی فضائل کے حاصل کرنے کی تشویش و ترغیب بھی پیدا ہوتی ہے۔



اطاعت وفرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے' اسلام کی نماز انہیں رموز و اسرار کا گنجینہ ہے' یہ مسلمانوں کی نظم و جماعت اطاعت پذیری وفرمانبرداری اور وحدت قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے اسی لئے اس کے بغیر مسلمان مسلمان نہیں اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے' نہ انقیاد امامت ہے نہ زندگی ہے اور نہ زندگی کا نصب العین ہے اسی بناء پر داعی اسلام علیہ السلام نے یہ فرمادیا:

العهد الذی بیننا و بینهم الصلوٰة فمن ترکها فقد کفر۔ (احمد ترمذی' نسائی' ابن ماجه)

ہمارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ ہے وہ نماز ہے تو جس نے اس کو چھوڑا اس نے کفر کا کام کیا۔

کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالب بے جان' شراب بے نشہ اور گل بے رنگ و بو ہو کر رہ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اس سے رخصت ہو جاتی ہے اسی لئے نماز اسلام کا اولین شعار ہے اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے۔

عرب کی روحانی کایا پلٹ::

وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بیگانہ تھا' وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی' وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا نہ تھا' وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح و تحمید کے ذائقہ سے واقف نہ تھی' وہ جس کی آنکھوں نے شب بیداری کا اضطراب انگیز منظر نہیں دیکھا تھا' وہ جس کی روح ربانی تسکین و تسلی کے احساس سے خالی تھی' محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے دفعتًا کیا ہو گیا؟ اب عبادت الٰہی اسکے ہر کام کا مقصد بن گئی' اب اس کو اپنے ہر کام میں اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی اسکی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہیں چاہتی تھی' اسکے دل کو لذت کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہیں آتی تھی۔ اسکی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا

اسکی آنکھیں اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی طالب نہ تھیں اسکی روح یادالٰہی کی تڑپ اور ذکرالٰہی کی بےقراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلی نہ پاتے تھے۔

دل راکہ مردہ بود حیاتے زنو رسید

تا بوئے از نسیم میش درمشام رفت

وہ عرب جن کی حالت یہ تھی کہ:

ولا یذکرون اللہ الا قلیلا۔ (نساء: ۱۲)

اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔

دعوت حق اور فیض نبوت کے اثر و برکت نے ان کی یہ شان نمایاں کی کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتیں بھی ان کو ذکرالٰہی سے غافل نہ کرسکیں۔

رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ۔ (نور: ۵)

ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید وفروخت کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔

اٹھتے بیٹھے، چلتے پھرتے، غرض ہر حال میں ان کے اندر خدا کی یاد کیلئے بےقراری تھی۔

یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلی جنوبھم۔ (آل عمران: ۲۰)

جو خدا کو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے یاد کرتے ہیں۔

راتوں کو جب غافل دنیا نیند کے خمار میں ہوتی، وہ بستروں سے اٹھ کر خدا کے سامنے سربسجود اور راز و نیاز میں مصروف ہوتے تھے۔

تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفا وطمعا۔

جن کے پہلو (رات) کو خوابگاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں، وہ
خوف اور امید کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔

وہ جن کا یہ حال تھا کہ:

واذا قیل لھم ارکعوا لا یرکعون۔ (مرسلات:۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے آگے جھکو تو نہیں
جھکتے۔

اب ان کی یہ صورت ہوگئی کہ:

ترلھم رکعا سجدا ایبتغون فضلا من اللہ ورضوانا۔
(فتح:۲۹)

تم ان کو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے سجدہ میں پڑے
ہوئے خدا کے فضل اور خوشنودی کو تلاش کرتے ہیں۔

وہ جن کے دلوں کی یہ کیفیت تھی کہ:

و اذا ذکر اللہ وحدہ اشمازت قلوب الذین لا
یئومنون بالاخرہت۔ (زمر:۵)

اور جب تنہا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل جو آخرت پر
ایمان نہیں رکھتے، مکدر ہو جاتے ہیں۔

آفتاب نبوت کے پرتو نے ان مکدر آئینوں میں خشیت الٰہی کا جوہر پیدا کر دیا۔

الذین اذ ذکر اللہ وجلت قلوبھم۔
(انفال۔۱: حج۔۵)

وہ لوگ کہ جو خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل دہل جاتے
ہیں۔

یہ خود قرآن پاک کی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے

عمل اور تعلیم نے عرب کی روحانی کائنات میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا وہ تمام لوگ جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے' خواہ وہ کھیتی کرتے ہیں یا تجارت یا محنت مزدوری مگر ان میں سے کوئی چیز ان کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھی' قتادہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ (صحابہ) خرید وفروخت اور تجارت کرتے تھے لیکن جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا تھا تو یہ شغل وعمل ان کو یاد الٰہی سے غافل نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اس کو پوری طرح ادا کرتے تھے۔(۱)۔حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ بازار میں تھے' نماز کی تکبیر ہوئی' دیکھا کہ صحابہ نے فوراً دکانیں بند کر دیں اور مسجد میں داخل ہو گئے۔(۲)۔

صحابہؓ تمام تر راتیں خدا کی یاد میں جاگ جاگ بسر کرتے تھے' یہاں تک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتوں میں بھی وہ عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔خدا نے گواہی دی:

ان ربك يعلم انك تقوم ادنى من ثلثى اليل ونصفه وثلثه وطائفهت من الذين معك۔ (مزمل:۲)

بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات کے قریب اور آدھی رات اور تہائی رات کے بعد اٹھتا ہے اور تیرے ساتھ ایک جماعت بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے۔

اس زمانہ میں صحابہ کو راتوں کے سوا خدا کے یاد کرنے کا موقع کہاں ملتا تھا' جلوۂ دیدار کے مشتاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو کہیں کسی مخفی گوشہ میں جمع ہوتے تھے' ذوق وشوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے زمین پر رکھ دیتے تھے' دیر تک سجدہ میں پڑے رہتے تھے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے اس والہانہ انداز عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے' قرآن پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کی ہے:

وتوکل علی العزیز الرحیملا الذی یرك حین تقوم
لا وتقلبك فی الساجدین۔ (شعراء: ۱۱)
اور اس غالب رحم والے پر بھروسہ کر جو رات کو جب تو نماز
کیلئے اٹھتا ہے اور سجدہ میں پڑے رہنے والوں کے درمیان
آنا جانا تیرا دیکھتا ہے۔

(۱)۔ صحیح بخاری باب التجارہ فی البزمز مرسلاً (۲)۔ فتح الباری
ج ٤ ص ۲۵۳ بحوالہ عبدالرزاق۔

مدینہ منورہ میں آ کر سب سے پہلا فقرہ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا:

یاایھا الناس اطعموا الطعام وافشوا السلام وصلوا
باللیل والناس نیام۔ (ترمذی)
اے لوگو! غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور اسلام کو پھیلاؤ اور نماز پڑھو
جب لوگ سوتے ہیں۔

بعض صحابی نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ انہوں نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان لوگوں کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا۔ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعون رات بھر نماز میں مصروف رہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ ''عثمان! تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہی' نماز بھی پڑھو اور سوؤ (۱)۔ بھی'' حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ صحابہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور بہت کم سوتے تھے۔ (۲)۔ ابو ہریرہؓ نے رات کے تین حصے کر دیئے تھے ایک میں خود نماز پڑھتے تھے' دوسرے میں ان کی بیوی اور تیسرے میں ان کا غلام اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتا تھا۔ (۳)۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوا تو ان کو جا کر نصیحت فرمائی۔ (۴)۔ حضرت ابو درداءؓ صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ رات رات بھر نماز میں گزار دیتے تھے' حضرت سلیمانؓ فارسی ان کے

اسلامی بھائی تھے' ایک شب وہ ان کے ہاں جا کر مہمان ہوئے جب رات کو حضرت ابو درداءؓ عبادت کے لئے اٹھنے لگے تو حضرت سلمانؓ نے منع کیا۔ پچھلے پہر جب سناٹا چھایا ہوا تھا' حضرت سلمانؓ نے ان کو جگایا کہ اب نماز کا وقت ہے۔(۵)۔کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت کی بھی نماز قصداً قضا کی ہو' یہاں تک کہ لڑائی اور خطرہ کی حالت میں بھی وہ اس فرض سے غافل نہیں رہتے تھے' ایک صحابی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک پرخطر کام کے لئے کہیں بھیجا تھا جب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا' ان کو خوف تھا کہ اگر کہیں ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائے گا تو وقت نکل جائے گا اور اگر عصر میں تاخیر کی جائے تو حکم الٰہی کی تعمیل میں دیر ہو جائے گی۔ اس مشکل کا حل انہوں نے اس طرح کیا وہ اشاروں میں نماز پڑھتے جاتے اور چلتے جاتے تھے۔(۶)۔سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں بھی نماز ان سے ترک نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ بیماری کی حالت میں وہ دوسروں کا سہارا لے کر مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔(۷)۔پھر وہ جس خضوع وخشوع' محویت اور استغراق کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے اس کا نظارہ بڑا پر اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو ان پر اس شدت سے رقت طاری ہوتی کہ کافر عورتوں اور بچوں تک بھی اس کا اثر ہوتا تھا۔(۸)۔حضرت عمرؓ نماز میں اس زور سے روتے تھے کہ ان کے رونے کی آواز پچھلی صف تک جاتی تھی۔(۹)۔حضرت تمیم داری ایک رات تہجد کے لئے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت میں صبح کر دی' بار بار اس کو دہراتے تھے اور مزے لیتے تھے۔(۱۰)۔

شب شد صبح و ہماں محو تماشا باشم

---

(۱)۔ ابوداؤد باب القصد فی الصلوٰۃ۔ (۲)۔ ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ فی وقت قیام النبی ﷺ من الیل۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الاطعمہ باب الخشف۔ (٤)۔ صحیح بخاری کتاب الصوم۔ (۵)۔ ایضاً۔ (٦)۔

ابوداؤد باب الصلوٰۃ الطالب۔ (۷)۔ نسائی کتاب الامامہ المحافظتہ علی الصلوٰۃ (۸)۔ باب اذابکی الامام فی الصلوٰۃ۔ (۹)۔ صحیح بخاری کتاہ الھجرہ و کتاب الصلوٰۃ باب المسجد یکون فی الطریق۔ (۱۰)۔ اسد الغابتہ تذکرہ حضرت تمیم داری۔

حضرت انسؓ قیام اور سجدہ میں اتنی دیر لگاتے تھے کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہیں۔ (۱)۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کئی کئی سورتیں پڑھ ڈالتے تھے اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ستون کھڑا ہے اور جب سجدہ میں جاتے تو اتنی دیر تک سجدہ کرتے تھے کہ حرم محترم کے کبوتر ایک سطح جامد سمجھ کر ان کی پیٹھ پر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ (۲)۔

ایک رات میدان جنگ میں ایک پہاڑی پر دو صحابی پہرہ دینے کے لئے متعین ہوتے ہیں' ایک صاحب سو جاتے ہیں اور دوسرے نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں' دشمن ان کو تاک کر تیر مارتا ہے جو بدن میں ترازو ہو جاتا ہے' کپڑے خون سے تر بتر ہو جاتے ہیں مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے' نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو پیدا کرتے اور واقعہ سناتے ہیں' ساتھی کہتے ہیں کہ تم نے اس وقت مجھے کیوں نہ جگایا۔ جواب ملتا ہے میں نے ایک پیاری سورہ شروع کی تھی' پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کئے بغیر نماز توڑ دوں۔ (۳)۔

اس سے بھی زیادہ پر اثر منظر یہ ہے کہ دشمنوں کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں' تیروں کا مینہ برس رہا ہے' نیزوں اور تلواروں کی بجلیاں ہر طرف کوند رہی ہیں' سر دگردن' دست و بازو کٹ کٹ کر گر رہے ہیں کہ دفعتاً نماز کا وقت آ جاتا ہے' فوراً جنگ کی صفیں نماز کی صفیں بن جاتی ہیں اور ایک اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ موت و حیات سے بے پروا ہو کر گردنیں جھکنے اور اٹھنے لگتی ہیں۔

نور کا تڑکا ہے اسلام کے دائرہ کا مرکز' فاروق اعظمؓ امام نماز میں پیچھے صحابہ کی صفیں قائم ہیں۔ دفعتہ ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے اور خلیفہ پر حملہ آور ہو کر شکم

مبارک کو چاک چاک کر دیتا ہے' آپ غش کھا کر گر پڑتے ہیں خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے' سب کچھ ہو رہا ہے مگر نماز کی صفیں اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہیں' پہلے صبح کا دوگانہ ادا ہو لیتا ہے تب خلیفہ وقت کو اٹھایا جاتا ہے۔ (۴)۔

حضرت عمرؓ کو جس صبح کی نماز میں زخم لگا' اس کے بعد کی صبح کو لوگوں نے ان نماز کے لئے جگایا تو بولے "ہاں! جو شخص نماز چھوڑ دے' اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔" چنانچہ اسی حالت میں زخم سے خون جاری تھا' آپؓ نے نماز پڑھی۔ (۵)۔

حضرت علی مرتضیٰؓ صبح کی نماز کے لئے مسجد میں داخل ہوتے ہیں یا صبح کی نماز میں ہوتے (۶)۔ ہیں کہ ابن ملجم کی تلوار ان کو گھائل کر دیتی ہے اور کچھ دیر کے بعد وہ داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ امام مظلوم حسینؓ بن علیؓ کربلا کے میدان میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کی لاشیں میدان جنگ میں نظر کے سامنے پڑی ہوتی ہیں' ہزاروں اشقیاء آپ کو نرغہ میں لئے ہوتے ہیں' اتنے میں ظہر کا وقت آ جاتا ہے' آپ دشمنوں سے اجازت چاہتے ہیں کہ وہ اتنا موقع دیں کہ آپ ظہر کی نماز ادا کر سکیں۔ (۷)۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری باب المکث بین السجدتین۔ (۲)۔ حالات عبداللہ بن زبیرؓ اصابہ واسد الغابہ وغیرہ۔ (۳)۔ ابوداؤد کتاب الطھارت باب الوضوء من الدم۔ (۴)۔ صحیح بخاری واقعہ شہادت عمرؓ۔ (۵)۔ مئوطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب العمل فیمن غلب علیہ الدم۔ (۶)۔ الریاض النضرہ للحبت الطبری۔ (۷)۔ تاریخ طبری کبیر ص ۳۴۷ ج ۷ واقعات ۶۱ھ

نماز میں جس خشوع و خضوع کا حکم ہے' صحابہ کرام نے اس کے لئے یہ نمونے پیش کئے کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اگر ان کے اس روحانی ذوق و شوق میں خلل انداز ہوئی تو انہوں نے اس کو اس ذوق پر نثار کر دیا۔ حضرت ابوطلحہ انصاریؓ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک خوشنما چڑیا نے سامنے آ کر چہچہانہ شروع کیا۔ حضرت ابوطلحہؓ دیر

تک ادھر ادھر دیکھتے رہے پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی۔ دل میں کہا اس باغ نے فتنہ برپا کیا' یہ کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا اور کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ باغ راہ خدا میں نذر ہے۔

اسی طرح ایک اور صحابی اپنے باغ میں نماز میں مشغول تھے۔ باغ اس وقت نہایت سرسبز و شاداب اور پھلوں سے لدا ہوا تھا' پھلوں کی طرف نظر اٹھ گئی تو نماز یاد نہ رہی جب اس کا خیال آیا تو دل میں نادم ہوئے کہ دنیا کے مال و دولت نے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ یہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کا زمانہ تھا ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ میں مبتلا کر دیا' راہ خدا میں دیتا ہوں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے اس کو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار میں فروخت ہوا۔ (۱)۔

---

(۱)۔ یہ دونوں واقعے مموطا امام مالک کتاب الصلوٰۃ باب ما یشغلك عنها میں مذکور ہیں۔

زکوٰۃ

واتوا الزکوہت

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم ::

نماز کے بعد جس کا اصل تعلق خالق ومخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے اور جس کا ایک بڑا فائدہ نظام جماعت کا قیام ہے' اسلامی عبادت کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے جو آپس میں انسانوں کے درمیان ہمدردی اور باہم ایک دوسرے کی امداد اور معاونت کا نام ہے اور جس کا اہم فائدہ نظام جماعت کے قیام کے لئے مالی سرمایہ باہم پہنچانا ہے' زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے' جس کا اطلاق تعمیم کے ساتھ ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر بھی ہوتا ہے لیکن فقہی اصطلاح میں ''زکوٰۃ'' صرف اس مالی امداد کو کہتے ہیں جو ہر اس مسلمان پر واجب ہے' جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو۔

زکوٰۃ گذشتہ مذاہب میں ::

زکوٰۃ بھی ان عبادات میں سے ہے جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے لیکن ان کے پیروؤں نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا کہ بظاہر ان کے مذہبی احکام کی فہرست میں اس کا نام بھی نظر نہیں آتا۔ حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا جزو لاینفک تھی اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہے بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا اس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں۔

اقیموا الصلوہت واتوا الزکوہت۔ (بقرہ:۱۰)

(ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا تھا) کہ کھڑی رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ۔

لئن اقمتم الصلوہت واتیتم الزکوہت۔ (مائدہ:۳)

(اے بنی اسرائیل) اگر تم کھڑی رکھتے نماز اور دیتے رہتے زکوٰۃ۔

حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کے ذکر میں ہے:

واذکر فی الکتب اسمعیل انہ کان صادق الوعد وکان رسولا نبیا۔ وکان یامر اھلہ بالصلوٰۃ والزکوٰۃ وکان عند ربہ مرضیا۔ (مریم: ۴)

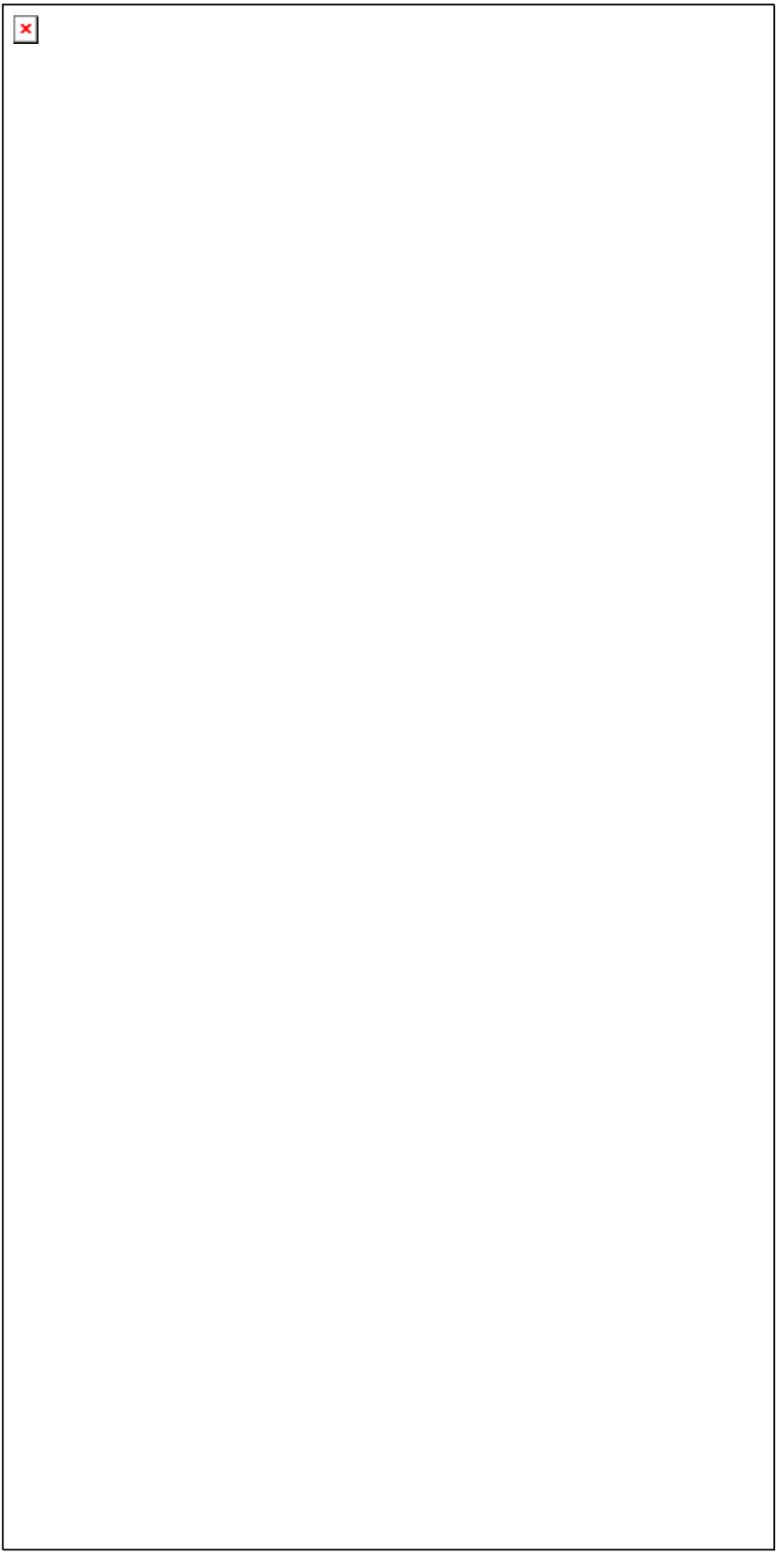
اور قرآن میں اسماعیل کا ذکر کر، بیشک وہ وعدہ کا سچا تھا اور وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر تھا اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کہتے ہیں:

واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ مادمت حیا۔ (مریم: ۲)

اور خدا نے مجھ کو زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی تاکید کی ہے۔

توراہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں ایک عشر یعنی دسواں حصہ (احبار۔ ۲۷، ۳۰، ۳۲) نیز ہر بیس برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر خواہ امیر ہو یا غریب آدھا مثقال دینا واجب تھا (خروج، ۳۰، ۱۳، ۱۵) ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا اناج، کھلیان کی منتشر بالیں اور پھل والے درختوں میں کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے، جو مال کی زکوٰۃ تھی اور یہ عملاً ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی، یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کی جاتی تھی، اس کا ساٹھواں حصہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے، دسواں حصہ حضرت ہارونؑ کی اولاد (لاویین) قومی خاندانی کاہن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی اور ہر تیسرے سال میں دسواں حصہ بیت المقدس کے



ہے اسی بنا پر یہودیوں نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہیں کی' علاوہ بریں زکوٰۃ کی مدت کی تعین کہ وہ ہر سال یا دوسرے یا تیسرے سال واجب الادا ہے' تصریحًا معلوم نہیں ہوتی' نیز یہ کہ اس زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے یعنی وہ کہاں خرچ کی جائے اس کی تفصیل بھی خود تو راہ کی زبان سے کم سنائی دیتی ہے۔

غرض وجوہ جو کچھ ہوں' مگر حالت یہ تھی کہ یہود نے اس فرض کو بھلا دیا' اور خصوصًا عرب میں جہاں کی دولت کے وہ تنہا مالک بن بیٹھے تھے' چند کے سوا اکثر کو اس فرض کا دھیان بھی نہ تھا' قرآن نے ان کو یاد دلایا کہ :

و اقیموا الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ ثم تولیتم الا قلیلا منکم و انتم معرضون (بقرہ: ۱۰)

(اور تم بنی اسرائیل سے معاہدہ تھا کہ) کہ نماز کھڑی رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا' پھر تم پھر گئے' مگر تم میں سے تھوڑے اور تم دھیان نہیں دیتے۔

---

(۱)۔ انسائیکلوپیڈیا برطانیکا طبع یازدھم مضمون "خیرات" (Charity) (۲)۔ توراہ خروج ۳۰۔۱۶' (۳۸۔۲۶)

عیسوی مذہب میں گو سب کچھ دینے کا حکم تھا مگر یہ حکم ہر ایک کیلئے موزوں نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ہر شخص اس پر عمل کرسکتا تھا' دوسرے مذہبوں میں بھی اگرچہ خیرات اور دان کرنے کے احکام موجود تھے تاہم ان کیلئے کوئی نظام اور اصول مقرر نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہر شخص پر قانونًا رقم واجب الادا تھی جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہوسکتا تھا۔

اسلام کی اس راہ میں تکمیل ::

محمد ﷺ کی شریعت نے اس بارے میں بھی اپنا تکمیلی کارنامہ انجام دیا' اس نے نہایت خوبی اور دقت نظر کے ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا' انسان کے مالی کاروبار کا معیار عمومًا سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال

بھر کے بعد مقرر کی اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا' ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیئے' سونا (۱)۔ چاندی اور جانور (۲)۔ پیداوار (۳)۔ اور ان میں سے ہر ایک کی علیٰحدہ علیٰحدہ شرحیں مقرر کیں' سونے چاندی میں چالیسواں حصہ اور پیداوار میں دسواں حصہ معین کیا' جانوروں کی مختلف قسموں میں ان کی مختلف تعداد پر ان کی قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحیں قرار دیں پھر اس زکوٰۃ سے ہر قسم کے مصارف کی تعیین وتحدید کی' اور اس کی تحصیل وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا۔

یہ تو اجمال تھا' اب تفصیلی حیثیت سے ان میں سے ہر ایک پہلو پر شریعت محمدی کی تکمیلی حیثیت کو نمایاں کرنا ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت::

اسلام کی تعلیم اور محمدؐ کے صحیفہ وحی میں نماز کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے وہ زکوٰۃ ہے' نماز حقوق الٰہی میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوق عباد میں سے' ان دونوں فریضوں کا باہم لازم وملزوم اور مربوط ہونا' اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق عباد کا بھی یکساں لحاظ رکھا گیا ہے' قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے اس کے متصل ہی ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے چنانچہ قرآن پاک میں بیس مقامات پر ''اقام الصلوٰۃ'' کے بعد ہی ''ایتاء الزکوٰۃ'' آیا ہے مثلاً اقیموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ یا اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ اور زکوٰۃ ادا کرنے کی مدح یا اس کے دینے اور نہ دینے والوں کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے' بارگاہ نبویؐ میں آ کر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کئے ہیں تو ہمیشہ آپؐ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے' صحیحین کی کتاب الایمان میں اس قسم کی متعدد حدیثیں ہیں جن میں ترتیب ملحوظ رہی ہے بلکہ کبھی کبھی وہ اسلام کی شرائط بیعت میں داخل کی گئی ہے' چنانچہ

حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ کہتے ہیں کہ ''میں نے رسولؐ سے بیعت تین باتوں پر کی تھی' نماز پڑھنا' زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا' وفد عبدالقیس نے ۵ھ میں نبوت کے آستانہ پر حاضر ہو کر جب اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو آپؐ نے اعمال میں پہلے نماز پھر زکوٰۃ کی جگہ دی (۱)۔۔

۹ھ کو جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذؓ کو اسلام کا داعی بنا کر یمن بھیجا ہے تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ ''پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا' جب وہ جان لیں تو ان کو بتانا کہ دن میں پانچ وقت کی نماز ان پر فرض ہے' جب وہ نماز پڑھ لیں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے دولتمندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دی جائے گی (۲)۔۔

---

(۱)۔ یہ دونوں حدیثیں صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول ص ۱۸۸ میں ہیں۔ (۲)۔ صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۹۶ کتاب الرد علی الجہمیہ۔

صحابہؓ میں جو لوگ شریعت کے رازدان تھے وہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے' چنانچہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے خلاف تلوار کھینچ لی' حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول ﷺ نے فرمایا تھا کہ جو توحید کا قائل ہو اس کا خون روا نہیں' اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے' حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا ''خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس سے لڑوں گا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے' خدا کی قسم! جو رسول ﷺ کے زمانہ میں بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو دینا (۱)۔ پڑے گا''۔

حقیقت میں یہ ایک لطیف نکتہ تھا جس کو صرف شریعت کا محرم اسرار سمجھ سکتا تھا (۲)۔۔ اس نے سمجھا اور امت کو سمجھایا اور سب نے اس کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دی۔

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے' اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دو

بنیادوں پر قائم ہے' جن میں سے ایک روحانی نماز باجماعت سے جو کسی مسجد میں ادا ہو قائم ہوتا ہے اور نظام مادی زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہو' مرتب ہوتا ہے اسی لئے یہ دونوں چیزیں اسلام میں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں اور ان کی انفرادی حیثیت کے ساتھ ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعت محمدی ﷺ نے خاص زور دیا ہے' نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر انجام پا جاتی ہے لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد سے دور ہو جاتی ہے' اسی طرح زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے' مگر اس کی فرضیت کے بعض مقاصد فوت ہو جاتے ہیں یہی سبب ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافت میں جب بعض قبیلوں نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال میں داخل نہ کریں گے بلکہ بطور خود اس کو صرف کر دیں گے تو شریعت محمدی ﷺ کے شناسائے راز نے ان کی اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور بزور ان کو بیت المال میں زکوٰۃ داخل کرنے پر مجبور کیا' اگر ان کی یہ بات تسلیم کر لی جاتی تو اسلام کی وحدت کا سررشتہ اسی وقت پارہ پارہ اور مسلمانوں کی امات و جماعت کا نظام اسی وقت درہم برہم ہو جاتا۔

الغرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری' مسکینوں کی دستگری' مسافروں کی امداد' یتیموں کی خبر گیری' بیواؤں کی نصرت' غلاموں اور قیدیوں کی اعانت' نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے اور اس فریضہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے جو مذاہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔

زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل ::

جس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدینہ آ کر وہ رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی' اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتدائے اسلام ہی سے شروع ہوئی لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا' بعض مؤرخوں اور محدثوں کی بنا پر کہ ۸ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے' اس سے پہلے کے

واقعات میں جو

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اول ص ۱۸۸ (۲)۔ درحقیقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے طرز عمل کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت تھی فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم.... فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ فخلوا سبیلھم (توبہ:۱۰) ان مشرکوں کو مارو جہاں پاؤ .... تو اگر وہ توبہ کریں اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کی آزادی دے دو' و نیز دیکھو صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۹۶ باب کراھتہ الاختلاف۔

زکوٰۃ کا لفظ آیا اس سے پریشانی ہوئی ہے' حالانکہ شروع اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ صرف خیرات کا مترادف تھا اس کی مقدار' نصاب' سال اور دوسری خصوصیتیں جو زکوٰۃ کی حقیقت میں داخل ہیں وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالات کے پیدا ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہنچیں' محمد رسول ﷺ کا پیغام صرف دو لفظوں سے مرکب ہے خدا (۱)۔ کا حق اور بھائیوں (۲)۔ کا حق' پہلے لفظ کا مظہر اعظم ''نماز'' اور دوسرے کا ''زکوٰۃ'' ہے۔ اس لئے محمد ﷺ کی دعوت حق جب بلند ہوئی تو اس پکار کی ہر آواز ان ہی دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی' آنحضرت ﷺ جس طرح بعثت سے پہلے غار حرا میں چھپ کر خدا کی یاد (نماز) میں مصروف رہتے تھے اس طرح بیکس اور لاچار انسانوں کی دستگیری (زکوٰۃ) بھی فرمایا کرتے تھے' حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے بعثت کے وقت آپؐ کی نسبت فرمایا ''آپؐ قرابت داروں کا حق پورا کرتے ہیں' ہیں' قرضداروں کا قرض ادا کرتے ہیں' غریب کو کماتے ہیں' مہمان کو کھلاتے ہیں' لوگوں کو مصیبتوں میں مدد دیتے ہیں (۱)۔ غور کرو کیا زکوٰۃ ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام نہیں ہے؟ اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکوٰۃ توام ہیں اور ان ہی دو اجمالی حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے۔

سورہ مدثر اگرچہ وحی کی ابتدائی سورت ہے لیکن اس سرزمین میں وہ تمام بیج موجود ہیں جن سے آگے چل کر رفتہ رفتہ احکام اسلامی کا عظیم الشان تناور درخت تیار ہوا'

اس میں نماز کی تمام تفصیلات کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے:

و ربك فكبر (مدثر: ۱)

اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر۔

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے جو اس سورہ میں موجود ہے' اس کے بعد ہے:

ولا تمنن تستكثر (مدثر: ۱)

اور بدلہ بہت چاہنے کے لئے کسی احسان نہ کر۔

یہی وہ بیج ہے جس سے مسائل زکوٰۃ کے تمام برگ و بار پیدا ہوئے ہیں' مدثر کے بعد سورہ مزمل اتری' اس میں بہ تصریح دونوں حکم موجود ہیں اور زکوٰۃ کی کسی قدر تفصیل بھی کی گئی ہے:

و اقيموا الصلوٰة و اتوا الزكوٰة و اقرضوا الله قرضا حسنا و ما تقدموا لانفسكم من خير تجدوه عند الله هو خيرا و اعظم اجرا (مزمل: ۲)

اور نماز کھڑی کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دو' اور جو تم آگے بھیجو گے اپنے واسطے اس کو خدا کے پاس بہتر اور ثواب میں زیادہ پاؤ گے۔

بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفرؓ وغیرہ ہجرت کر کے حبشہ گئے ہیں اور نجاشی نے اپنے دربار میں بلا کر ان سے اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات دریافت کی ہیں اور حضرت جعفرؓ نے اس کے جواب میں جو تقریر کی ہے اس میں ہے ''اور پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں' روزے رکھیں اور زکوٰۃ دیں (۲)۔''

اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتداء ہی میں ہو چکا تھا اور وفد عبدالقیس کے (جو تقریباً ۵ھ میں آیا تھا) سوال کے جواب میں آپ ﷺ نے جن احکام کی تعلیم دی' ان میں ایک زکوٰۃ بھی تھی (۳)۔ ۶ھ میں

جب نجاشی نے نامہ مبارک پہنچنے کے بعد ابوسفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو انہوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ وصدقہ (۱)۔کا بھی تذکرہ کیا' ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ ۸ھ سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی تعلیم بھی موجود تھی۔

(۱)۔ صحیح بخاری جلد اول باب اول۔ (۲)۔ مسند احمد جلد اول ص ۲۰۲ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الزکوہ۔

لیکن چونکہ محمد ﷺ کا طریقہ تعلیم صرف نظریوں کا پیش کرنا نہ تھا بلکہ امت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کاربند بنانا تھا' اس لئے حالات کے اقتضاء اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزاء اور ان کے متعلق احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی مکہ معظمہ میں مسلمانوں کو پریشانی' پراگندگی' شکستہ حالی اور غرب و مسکینی کی جو کیفیت تھی اس کی بنا پر اتنا ہی ان کے لئے بہت تھا کہ وہ کسی یتیم و مسکین اور بھوکے کو کھانا کھلا دیں' چنانچہ اس زمانہ میں اسی قسم کے خیرات کی تعلیم دی گئی:

وما ادرك ما العقبه فك رقبه او اطعام فی یوم ذی مسغبه یتیما ذا مقربه او مسکینا ذا متربه (بلد: ۱)

اور تو کیا سمجھا کہ وہ گھاٹی کیا ہے' کسی (قرضدار یا قیدی یا غلام) کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن میں ناتے کے کسی بن باپ کے بچہ کو یا خاک میں پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا۔

عام قریش پر جنہوں نے محمد ﷺ کی اس انسانی ہمدردی کی پکار کو نہیں سنا عتاب آیا:

فذلك الذی یدع الیتیم ولا یحض علی طعام المسکین (الماعون: ۱)

وہی ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور غریب کے کھلانے پر اپنے کو آمادہ نہیں کرتا۔

کلا بل لا تکرمون الیتیم ولا تحاضون علی طعام المسکین (الفجر: ۱)

یہ بات نہیں بلکہ بن باپ کے بچہ کی تم عزت نہیں کرتے اور آپس میں محتاج کو کھلانے کی تاکید نہیں کرتے۔

اور مسلمانوں کے اخلاص، باہمی ہمدردی اور ان کے جذبہ ترحم کی تعریف فرمائی کہ:

ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا و یتیما و اسیرا انما نطعمکم لوجہ اللہ لا یرید منکم جزاء ولا شکورا (دہر: ۱)

اور وہ (حاجتمند ہونے کے باوجود) محتاج، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ ہم تم کو صرف خدا کیلئے کھلاتے ہیں، تم سے نہ بدلا چاہتے ہیں نہ شکریہ۔

مدینہ منورہ آ کر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انہوں نے کچھ اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب (۲)۔ ہوا یعنی یہ کہ سال میں ایک دفعہ عید کے دن نماز سے پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غلہ خدا کی راہ میں خیرات کرتے، تاکہ غریب محتاج بھی اپنی عید کا دن پیٹ بھر کر خوشی اور مسرت سے گزاریں، اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی انہوں نے دریافت کیا، یا رسول اللہ ﷺ ہم کیا خیرات کریں؟

یسئلونک ماذا ینفقون (بقرہ: ۲۷)

وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں۔

ارشاد ہوا:۔

قل العفو (بقرہ: ۲۷)

کہہ دو (اے پیغمبر) کہ تمہاری ضرورت سے جو کچھ بچ رہے

(اس کو خیرات کرو)

(۱)۔ صحیح بخاری جلد اول آغاز کتاب الزکوہ و کتاب التفسیر۔
(۲)۔ تاریخ طبری یورپ ص ۱۲۸۱

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم ہے' صحیح بخاری میں حضرت ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ خیرات کر دیں' آئندہ کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھیں (۱)۔ کہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی' کچھ دنوں کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں' زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا:

یاایھا الذین امنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم و مما اخرجنا لکم من الارض (بقرہ: ۳۷)

اے مسلمانو! اپنی کمائی سے کچھ اچھی چیزیں اور جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کریں اس میں سے کچھ خیرات میں دو۔

مسلمانوں نے اس کی تعمیل کی تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ:

و مما رزقنھم ینفقون (بقرہ: ۱)

اور ہم نے ان کو جو روزی دی ہے اس میں سے وہ کچھ خرچ (خیرات) کرتے ہیں۔

صحابہؓ کا یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا' خدا کی راہ میں کچھ نہ کچھ دینے کے لئے بےقرار رہتے تھے' چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے تو غریب و نادار صحابہؓ نے آ کر عرض کی کہ اے خدا کے رسول ﷺ جس کے پاس نہ ہو وہ کیا کرے' فرمایا وہ محنت مزدوری کر کے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے' خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی صدقہ دے' انہوں نے پھر گزارش کی کہ جس میں اس کی بھی طاقت نہ ہو وہ کیا کرے' فرمایا کہ وہ فریادخواہ حاجت مندوں کی مدد کرے'

انہوں نے پھر دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو ؟ ارشاد ہوا ''تو وہ نیکی کا کام کرے اور برائی سے بچے' یہی اس کا صدقہ (۲)۔ ہے''۔ آنحضرت ﷺ کی ان پر اثر تعلیمات اور نصیحتوں کا صحابہ پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس غرض کے لئے بازار جا کر بوجھ اٹھاتے تھے اور اس سے جو کچھ ملتا تھا اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے تھے (۳)۔۔

لیکن بایں ہمہ اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوا تھا اور اس لئے اس کا کوئی مرتب قومی نظام بھی قائم نہ تھا' رمضان ۸ھ میں مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک سررشتہ میں منسلک کر دیا اور اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے' اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

خذ من اموالهم صدقه تطهرهم و تزكيهم بها

(توبہ: ۱۳)

(اے محمدؐ) ان کے مال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اس کے ذریعہ سے تم ان کو پاک وصاف کرسکو۔

چنانچہ اس کے بعد نئے سال یعنی محرم ۹ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکام وقوانین مرتب ہوئے' اس کی وصولی کے لئے تمام عرب میں محصولوں اور عاملوں کا تقرر (۴)۔ ہوا اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی' یہ تمام احکام وقوانین سورہ برات میں مذکور ہیں جو ۸ھ کے آخر میں نازل ہوئی۔

(۱)۔ کتاب الزکوٰۃ مع فتح الباری ج ۳ ص ۲۱۶ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ۔ (۳)۔ ایضاً۔ (٤)۔ ابن سعد جلد مغازی ص ۱۱۵ تاریخ طبری جلد ٤ ص ۱۷۲۲ مطبوعہ یورپ۔

زکوٰۃ کی مدت کی تعیین::

اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت کی تعیین میں بڑی افراط وتفریط تھی' توراۃ میں جو عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا گیا تھا وہ تین سال میں ایک دفعہ واجب ہوتا تھا (استثناء ۱۴'

۲۸) اور انجیل میں کسی مدت اور زمانہ کی تعیین نہ تھی' اس بنا پر زکوٰۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اس کی مدت کی تعیین تھا کہ وہ نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ میں واجب الاداء ہو کہ انسان بار بار کے دینے سے اکتا جائے اور بجائے خوشی اور دلی رغبت کے اس کو ناگوار اور جبر معلوم ہو اور نہ اس قدر لمبی مدت ہو کہ غریبوں' مسکینوں اور قابل امداد لوگوں کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے طویل انتظار کی سخت تکلیف اٹھانی پڑی' اسلام نے اس معاملہ میں دنیا کے دوسرے مالی کاروبار کو دیکھ کر ایک سال کی مدت مقرر کی کیونکہ تمام متمدن دنیا نے خوب سوچ سمجھ کر کاروبار کے لے ۱۲ مہینوں کا سال مقرر کیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کا اصلی سرچشمہ زمین کی پیداوار ہے اور اس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلی ہوئی شکلوں کی صنعتی صورت کا بنانا اور ان کو بیوپار کرنا ہے آمدنی کے ان تمام ذریعوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ سال کے مختلف موسم اور فصلیں' جاڑا' گرمی' برسات' ربیع اور خریف گزر جائیں تا کہ پورے سال کے آمد وخرچ اور نفع نقصان کا میزان لگ سکے اور زمیندار' کاشتکار' تاجر' نوکر' صناع ہر ایک اپنی آمدنی وسرمایہ کا حساب وکتاب کر کے اپنی مالی حالت کا اندازہ لگا سکے' بڑے جانوروں کی پیدائش اور نسل کی افزائش میں بھی اوسطاً ایک (۱)۔ سال لگتا ہے' ان تمام وجہوں سے ہر منظم جماعت' ہر حکومت اور ہر قومی نظام نے محصول اور ٹیکس وصول کرنے کی مدت ایک سال مقرر کی ہے' شریعت محمدی ﷺ نے بھی اس بارے میں اسی طبعی اصول کا اتباع کیا ہے اور ایک سال کی مدت کی آمدنی پر ایک دفعہ اس نے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے چنانچہ اس کا کھلا ہوا ارشاد سورہ توبہ میں موجود ہے جس میں زکوٰۃ کے تمام احکام بیان ہوئے ہیں زکوٰۃ کے بیان کے بعد ہے:

ان عدہ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھرا فی کتب اللہ یوم خلق اللہ السموات والارض (توبہ:۳۷)

مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں جس دن اللہ نے
آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔

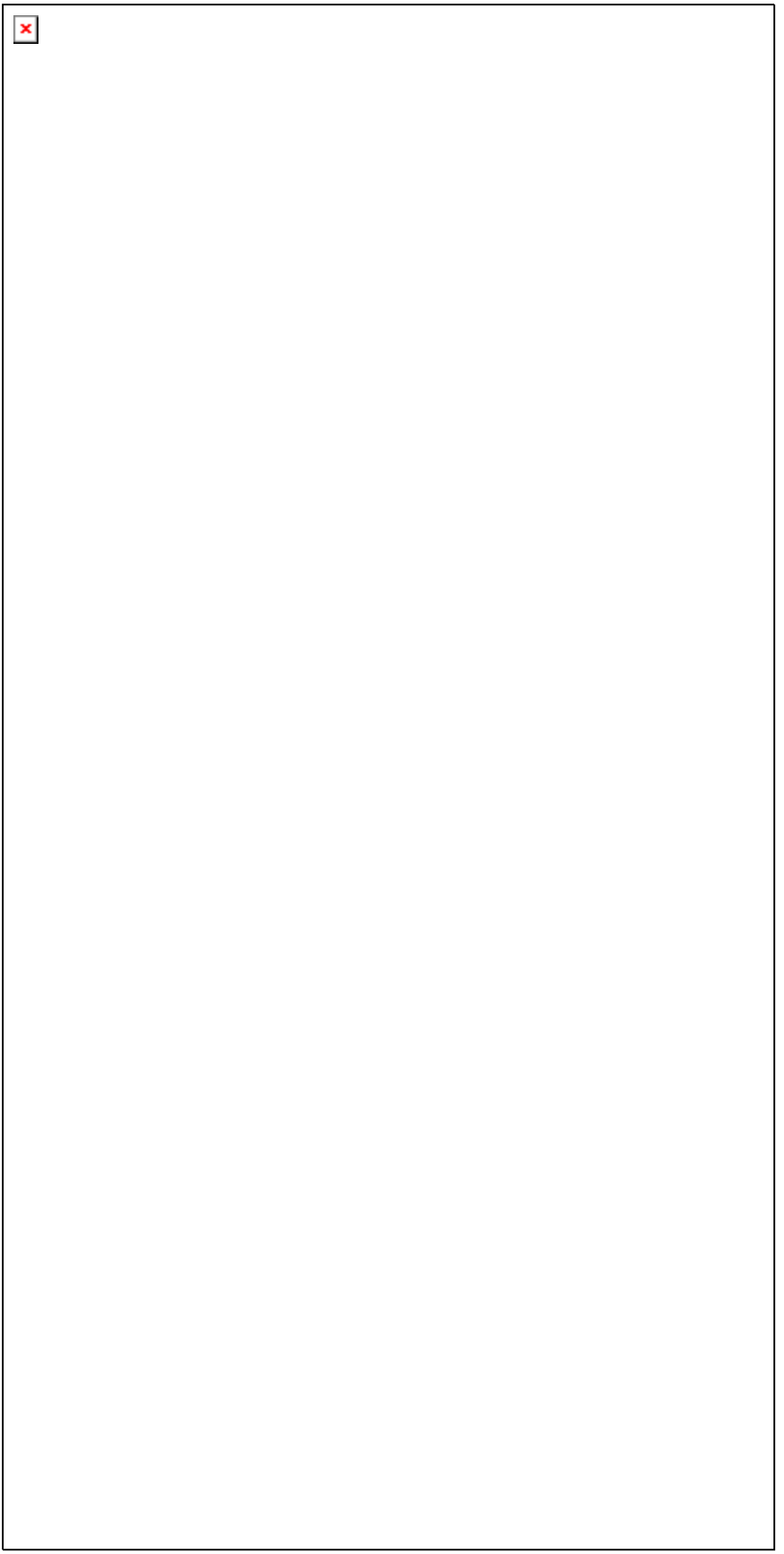
زکوٰۃ کی مقدار::

توراہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں زکوٰۃ کی مقدار پیداوار کا دسواں حصہ تھا اور نقد میں آدھا مثقال جو امیر وغریب سب پر یکساں فرض تھا لیکن زمین کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں کہیں زمین صرف بارش سے سیراب ہوتی ہے اور کہیں نہر کے پانی سے جہاں مزدوری اور محنت کا اضافہ ہو جاتا ہے' نقد دولت کے بھی مختلف اصناف ہیں' بعض مرتبہ دولت بے محنت مفت ہاتھ آجاتی ہے اور بعض اوقات سخت محنت کرنی پڑتی ہے' اس لئے سب کا یکساں حال نہیں ہوسکتا' انجیل نے حسب دستور اس مشکل کا کوئی حل نہیں کیا لیکن محمد ﷺ کی شریعت کاملہ نے علم اقتصاد سیاسی (پولیٹیکل اکانمی) کے نہایت صحیح اصول کے مطابق دولت کے فطری اور طبعی ذرائع کی تعیین کی اور ہر ایک کے لئے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کر دی' اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعت محمدیہ نے توراہ کی قانونی تعیین اور انجیل کی اخلاقی عدم تعیین دونوں حقیقتوں کو اپنے نظام میں جمع کرلیا' اس نے اخلاقی طور پر ہر شخص کو اجازت دے دی کہ وہ اپنا کل مال یا نصف مال کم وبیش جو چاہے اور جب چاہے خدا کی راہ میں دے دے' اس کا نام انفاق یا عام خیرات وصدقہ ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کر دیا

(۱)۔ بکری کی مدت حمل چھ مہینے گائے کی نو اور اونٹ کی گیارہ اور بھینس کی بارہ مہینے ہیں۔

کہ ہر شخص کی دولت میں غریبوں اور محتاجوں اور دوسرے نیک کاموں کے لئے بھی ایک مقررہ سالانہ حصہ ہے اور اس کا نام زکوٰۃ ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

الذین ھم علی صلوتھم دائمون والذین فی اموالھم



اسلام کو محکوموں اور سپاہیوں کے ساتھ زیادہ رعایت مدنظر تھی' اس لئے اس نے چار کو پانچ کر دیا' اس طرح چوتھ (۱/۴) کے بجائے دولت کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار پایا' جس کو رسول اور ان کے بعد ان کے بعد کے نائب اپنے ذاتی ضروریات اہل وعیال کے نان ونفقہ اور نادار مسلمانوں کی امداد یا حکومت اور جماعت کی کسی اور ضروری مد میں صرف کر سکیں۔

اس زکوٰۃ کا نام جو غنیمت کے مال پر عائد ہوتی ہے "خمس" ہے' قرآن پاک نے کہا:

واعلموا انما غنمتم من شیء فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتامی والمساکین وابن السبیلط (انفال:۵)

اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے اس کا پانچواں حصہ خدا کیلئے اور رسول کیلئے اور قرابت مند کیلئے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کیلئے ہے۔

نکتہ: اس موقع پر ایک خاص بات سمجھنے کے لائق ہے' جہاد یا دشمنوں سے لڑائی کا اصل مقصد دین کی حمایت اور اعلائے کلمتہ اللہ ہے' غنیمت کا مال حاصل کرنا نہیں' اور اگر کوئی صرف حصول غنیمت کی نیت سے دشمن سے لڑے تو اس کی یہ لڑائی اسلام کی نگاہ میں جہاد نہ ہوگی' اور نہ اس کا کوئی ثواب ملے گا' اس کی طرف خود قرآن پاک میں اشارہ موجود ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی متعدد حدیثوں میں اس کی تشریح فرمادی ہے' اس بناء پر درحقیقت وہ مال غنیمت جو لڑائی میں دشمنوں سے ہاتھ آتا ہے' ایک ایسا سرمایہ ہے جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانوں کو مل جاتا ہے' اس سے یہ نکتہ حل ہو جاتا ہے کہ جو سرمایہ محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے اس میں پانچواں حصہ نظام جماعت کا ہے' یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لئے ہے۔

یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی محنت کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آ جائے' اس میں

پانچواں حصہ خدا اور رسول کا ہے' تا کہ وہ جماعت کے مشترکہ مقاصد کے صرف میں آئے' وہی ہے جس کی بناء پر ''رکاز'' یعنی دفینہ میں جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً غیب سے ہاتھ آ جائے' خمس (یعنی پانچواں حصہ) جماعت کے بیت المال کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔

محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے' اس میں سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے' تو راہ نے ہر قسم کی پیداوار پر عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا تھا' شریعت محمد ﷺ نے نہایت نکتہ سنجی کے ساتھ پیداوار کی مختلف قسموں پر مختلف شرح زکوٰۃ کی تفصیل کی' سب سے پہلے پیداوار کے ان اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ زمانہ تک محفوظ رہ سکتے ہیں' تا کہ ان سے حسب منشاء خانگی اور تجارتی فائدہ اٹھایا جا سکے اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو' اسی بناء پر سبزیوں اور ترکاریوں پر جو ایک دو روز سے زیادہ نہیں رہ سکتیں' کوئی زکوٰۃ مقرر نہیں فرمائی گئی' اسی طرح اس مالیت پر جس میں نشوونما اور ترقی کی صلاحیت نہیں مثلاً آلات' مکان' لباس' سامان' اسباب' سواری' قیمتی (۱)۔ پتھر ان پر بھی زکوٰۃ نہیں رکھی گئی' کچھ دنوں تک باقی رہنے والی اور نشوونما پانے والی چیزیں چار ہیں' (۱) زمین' (۲) جانور' (۳) سونا' چاندی' یا ان کے سکے اور (۴) تجارتی مال' چنانچہ ان چاروں چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی۔

زمین کی دو قسمیں کی گئیں' ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچ گو کاشتکار کرتا ہے مگر موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیراب کرنے میں کاشتکار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو

---

(۱)۔ قیمتی پتھروں سے مراد جواہرات اور موتی وغیرہ ہیں' ان پر اس لئے زکوٰۃ نہیں ہے کہ اسلام نے ان کو صرف اسباب زینت قرار دیا ہے' فرمایا حلیھت تلبسونھا (نحل و فاطر) زینت جن کو تم پہنتے ہو یہ ایسے ہی ہیں جیسے بعض فقہاء کے نزدیک سونے چاندی کے استعمال زیوروں پر زکوٰۃ نہیں کہ یہ بھی ان کے نزدیک اسباب زینت میں ہیں' اب اگر کوئی شخص ہزاروں اور لاکھوں روپے کے جواہرات جمع

کرلے تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں' یا تو تجارت کیلئے ہیں' تو ان پر مال تجارت کی حیثیت سے ان کی قیمت کے لحاظ سے زکوۃ واجب ہو گی' دوسری یہ کہ کوئی بدنصیب زکوۃ سے بچنے کیلئے اپنی دولت کو جواہرات کی صورت میں منتقل کرتا ہے تو گو قانوناً اس سے زکوۃ وصول نہیں کی جائے گی لیکن دیانتاً وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت گنہگار ہو گا' اور تیسری صورت یہ ہے کہ وہ محض سامان تعیش اور فخر و مباہات کیلئے جمع کرتا ہے' تو اس کی حالت وہی ہو گی جو بیش قیمت لباسوں اور سامانوں کا ذخیرہ جمع کرلے' اس کا شمار اسراف میں ہو گا اور اس پر وعید ہے۔

اصل یہ ہے کہ جواہرات کی قیمت گرانی نقدین (یعنی سونے چاندی) کی طرح طبعی نہیں ہے بلکہ محض فرضی ہے' نہ وہ خود ضروریات زندگی میں ہیں' نہ ان سے ضروریات زندگی کا مبادلہ یا خریداری معمولاً کی جاتی ہے' چند دولت مندوں کی طلب اور مانگ نے ان کی فرض قیمت بنا رکھے ہے' اگر ان جواہرات کی آب جاتی رہی' یا وہ ٹوٹ جائیں' یا ان میں بال پڑ جائے تو ان کی قیمت فوراً گر جائے گی' بخلاف سونے چاندی کے کہ ان کی قیمت کی گرانی طبعی اسباب سے ہے' اور وہ ضروریات زندگی کیلئے زر مبادلہ ہے وہ بھی ٹوٹ جائے یا میلا بھی ہو جائے تو بھی اس کی قیمت ہر حال میں باقی ہے' اسی لئے وہ معیار زر ہیں۔

دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے آپ سے آپ سیراب ہوتی ہے' اس پر بلامحنت والی اتفاقی دولت سے آدھی زکوۃ یعنی عشر (۱/۱۰) مقرر کیا گیا' زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی خاصی محنت اور مزدوری سے ہو مثلاً کنوئیں سے پانی نکال کر لانا' یا نہر بنا کر پانی لانا' تو اس میں قسم اول سے بھی نصف یعنی بیسواں حصہ (۱/۲۰) مقرر ہوا' نقدی سرمایہ جس کی ترقی' حفاظت' نشوونما اور افزائش میں انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور جس کی افزائش کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اور جس میں ہر قدم پر چوری' گمشدگی' لوٹ اور نقصان کا

اندیشہ رہتا ہے' زمین کا بھی آدھا' یعنی چالیسواں (۱/۴۰) حصہ مقرر (۱)۔ ہوا (جانوروں کا ذکر آگے آتا ہے۔)

زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ میں شرح زکوٰۃ کی کمی وبیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے' انسان کی اصلی ضرورت جس پر اس کا جینا منحصر ہے' صرف غذا ہے' زمین کے مالکوں کو یہ چیز براہ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہو جاتی ہے' اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پروا ہو جاتے ہیں لیکن سونے چاندی کے مالکوں اور تاجروں کی جو دولت ہے وہ براہ راست ان کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام میں نہیں آتی' بلکہ مبادلہ اور خرید وفروخت کے ذریعہ سے وہ براہ راست ان کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام میں نہیں آتی' بلکہ مبادلہ اور خرید وفروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہیں' وہ کاشتکاروں کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپیہ دیتے ہیں جس سے ان کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں' پھر وہ اس پیداوار کو لے کر گاؤں گاؤں' شہر شہر اور ملک بملک پھرتے ہیں اور اس کی بھی اجرت ادا کرتے ہیں' نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے' اس سے بدرجہا زیادہ نقد کے حصول میں صرف کرنی پڑتی ہے' سونا چاندی صدیوں کے فطری انقلابات کے بعد کہیں پیدا ہوتے ہیں اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل میں انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے' اس لئے سونا چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گراں تر ہے ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار اور زمینوں کے مالک عموماً دیہاتوں میں رہتے اور شہروں سے دور ہوتے ہیں' نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکوں سے بھی محروم رہتے ہیں اس لئے بسبب وہ قومی ضروریات' دین کی مالی خدمات' اور مستحقین کی امداد میں اس ''انفاق'' یعنی اخلاقی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہیں جن کو عموماً نقد صورت میں دولت کے مالک اور تاجر پورا کرتے ہیں' اس بناء پر بھی سخت ضرورت تھی کہ ان کیلئے قانونی خیرات کی شرح اہل زمین سے مختلف رکھی جائے۔

زکوٰۃ کی شرح مقدار کی تعیین میں اس خمس والی آیت سے ایک اور نکتہ معلوم ہوتا ہے

کہ خمس میں چونکہ امامت حکومت کی تمام ذاتی وقومی مصارف شامل ہیں' اس لئے وہ کل خمس (۱/۵) مقرر ہوا اور زکوٰۃ کے مصارف جیسا کہ سورۂ توبہ رکوع ۸ میں مذکور ہیں صرف آٹھ مصارف کی شرح مقدار ۱/۵ کا ۱/۸ حصہ یعنی (۱/۴۰) مقرر ہوا یعنی سونا چاندی کی زکوٰۃ میں ان آٹھ مصرفوں کے لئے مجموعی رقم چالیسواں حصہ رکھی گئی' پھر غور کیجئے کہ سونا چاندی کی شرح ۲۰۰ درم یا اس کے مماثل سونا ہے' ان دوسو درموں کو پانچ پر تقسیم کر دیجئے تو چالیس ہو جائے گا' یہ کل زکوٰۃ کی شرحیں ۱/۵' ۱/۱۰' ۱/۲۰' ۱/۴۰ ایک دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہیں' اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ تقسیم وتحدید حساب اور اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے۔

(۱)۔ یہ نکتہ حافظ ابن قیم نے زادالمعاد میں بیان کیا ہے۔

جانوروں پر زکوٰۃ::

توراہ میں ہر قسم کے جانوروں میں دسواں حصہ زکوٰۃ (۱)۔ کا تھا' لیکن چونکہ ہر قسم کے جانوروں میں نسل کی افزائش کی صلاحیت اور مدت افزائش (زمانۂ حمل) یکساں نہیں ہوتی' نیز جانوروں میں دسویں بیسویں کا حصہ مشاع ہر تعداد پر چسپاں نہیں ہو سکتا' اس لئے ان میں دسویں بیسویں کے بجائے تعداد کے تعین کی ضرورت تھی' شریعت محمدیہ نے اس نقص کو پورا کیا' چنانچہ اسی پہلے اصول (پیدائش اور افزائش کی مدت' کیفیت' اور کمیت) کی بناء پر اولاً بے نسل یا کم نسل کے جانوروں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا' مثلاً خچر گھوڑے (۲)۔ (یا ہندوستان میں ہاتھی) پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ دوسرے جانوروں کی مالیت اور قوت وکیفیت افزائش کے لحاظ سے حسب ذیل شرح معین ہوئی۔ یہ وہ شرح نامہ ہے جو خود آنحضرت ﷺ نے اپنی حکمت ربانی سے فیصلہ فرما کر طے کیا اور زبانی نہیں' بلکہ فرامین کی صورت میں لکھوا کر عمال کو عنایت فرمایا تھا' اور خلفائے راشدین نے اس کی نقلیں حدود حکومت میں بھجوائیں اور جس کی تعمیل آج تک برابر بلا اختلاف ہوتی آئی ہے۔

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	۱ سے ۴ تک	کچھ نہیں
اونٹ	۲۰ سے ۲۴ تک	چار بکریاں
اونٹ	۵ سے ۹ تک	ایک بکری
اونٹ	۲۵ سے ۳۵ تک	اونٹ کا ایک سال کا بچہ
اونٹ	۱۰ سے ۱۴ تک	دو بکری
اونٹ	۳۶ سے ۴۵ تک	اونٹ کا دو سالہ بچہ
اونٹ	۱۵ تا ۱۹ تک	تین بکریاں
اونٹ	۴۶ سے ۶۰ تک	اونٹ کا تین سالہ بچہ
اونٹ	۶۱ سے ۷۵ تک	چار سال کا اونٹ کا بچہ
بکری	۲۰۰ سے ۳۰۰ تک	تین بکریاں
اونٹ	۷۶ سے ۹۰ تک	دو سال کے دو بچے
اونٹ	۹۱ تا ۱۲۰ تک	تین سال کے دو بچے
بکری	پھر ہر سو پر	ایک ایک بکری
اونٹ	۱۲۰ کے بعد ہر	دو سال کا ایک بچہ
گائے، بیل، بھینس ایک سے ۲۹ تک		کچھ نہیں
	چالیس پر اور ہر پچاس پر	تین سال کا ایک بچہ
بکری	۱ سے ۳۹ تک	کچھ نہیں
بھینس	۳۰	ایک دو سالہ بچھڑا
بکری	۴۰ سے ۱۲۰	ایک بکری
بھینس	۴۰	تین سال کا بچھڑا
بکری	۱۲۱ سے ۲۰۰	دو بکریاں

بھینس	۶۰	۲ سال کے دو بچھڑے
گائے، بیل	۷۰	ایک تین سال
بھینس		دو سال کا بچھڑا
بھینس	۸۰	تین سال کے دو
بھینس	۹۰	تین سال کے تین
بھینس	۱۰۰	دو سال کے دو اور
بھینس	پھر ہر دس پر	تین سال کا ایک
بھینس	پھر ہر دس	ایک دو سالہ

(۱)۔ احبار ۲۷۔۳۲۔ (۲)۔ حنفیہ کے نزدیک خیل متناسلہ اور تجارت کے گھوڑوں میں زکوۃ ہے، سواری اور جہاد کے گھوڑوں میں نہیں۔

نصاب مال کی تعین::

شرح زکوٰۃ کے تعین کے سلسلہ میں شرائع سابقہ میں ایک اور کمی تھی جس کی تکمیل محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت نے کر دی، جن دوسری شریعتوں میں قانونی خیرات کی تعین ہے ان میں غریب اور کم اور زیادہ دولت والوں کی تفریق نہیں کی گئی تھی۔ مثلاً اگر دس بیس روپے والوں، یا دس پانچ گائے اور بکری والوں سے یہ زکوٰۃ وصول کی جاتی، تو ان پر ظلم ہوتا، تو راہ میں غلہ اور مویشی پر جو عشر اور نقد پر آدھا جو مثقال قمر رکیا گیا ہے، اس میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے بلکہ آدھے مثقال کی زکوٰۃ میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ :

''خداوند کیلئے نذر کرتے وقت آدھے مثقال سے امیر زیادہ نہ دے اور غریب کم نہ دے۔'' (خروج ۳۰۔۱۵)

لیکن شریعت محمدیؐ نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا اور غریبوں، ناداروں، مقروضوں اور ان غلاموں کو جو سرمایہ نہیں رکھتے یا اپنی آزادی کیلئے سرمایہ جمع کر رہے ہیں اس سے

بالکل مستثنیٰ کر دیا، نیز دولت کی کم مقدار رکھنے والوں پر بھی ان کی اپنی حسب خواہش اخلاقی خیرات کے علاوہ کوئی باقاعدہ زکوٰۃ عائد نہیں کی، اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا، سونے کی زکوٰۃ کو وہی آدھا مثقال رکھا، لیکن بتا دیا کہ یہ آدھا مثقال اسی لئے لیا جائے گا جو کم از کم پانچ اوقیہ یعنی بیس مثقال سونے (۱) کا مالک ہو، اور ۵ اوقیہ یعنی ۲۰ مثقال سونے کی متوسط قیمت دوسو درہم چاندی کے سکے ہیں، یعنی ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر (۲) ہے وہ کم سے کم معیار دولت جس پر زکوٰۃ نہیں حسب ذیل ہے۔

نام	اس تعداد سے کم پر زکوٰۃ نہیں
غلہ اور پھل	پانچ وسق (۳) سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔
اونٹ	پانچ عدد وسق سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔
گائے، بیل، بھینس،	۳۰ عدد وسق سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔
بھیڑ بکری	۴۰ عدد وسق سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔
سونا	پانچ اوقیہ (بیس مثقال) سے کم پر زکوٰۃ نہیں،
چاندی	۲۰۰ درہم سے کم پر زکوٰۃ نہیں

اس معیار سے امیر و غریب کی سطحوں میں جو یکساں زکوٰۃ کی ناہمواری تھی وہ دور ہو گئی اور جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے، وہ اس قومی محصول سے بری ہو گئے۔

---

(۱)۔ موجودہ انگریزی حساب سے بیس مثقال سونا سات تولہ کے، اور دو سو درم چاندی ۵۲ روپے کے برابر ہے۔ (۲)۔ سنن ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب بین یعطی الزکوٰۃ و عدالغنی جلد اول ص ۱۶۴، ۱ صبح المطابع لکھنؤ۔ (۳)۔ ایک وسق وہ بوجھ ہے جس کو عادتاً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو۔

ان مذکورہ بالا اشیاء کی تعداد، جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے گو مختلف ہے، مگر مالی اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہیں، پانچ وسق غلہ، دوسو درہم چاندی اور پانچ اوقیہ سونا درحقیقت ایک اوقیہ جیسا کہ معلوم ہو چکا چالیس درہم کے برابر ہے، اس بناء پر

پانچ اوقیہ اور دوسو درم برابر ہیں' اسی طرح ایک وسق غلہ کی قیمت اس زمانہ میں چالیس درہم (۲)۔ یا ۴ مثقال تھی یعنی پانچ اوقیہ اور پانچ وسق کی قیمت وہی دوسو درم یا بیس مثقال ہوگی۔

زکوٰۃ کے مصارف اور ان میں اصلاحات::

حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں تین قسم کی زکوٰۃ تھی' ایک آدھے مثقال سونے چاندی کی' یہ رقم جماعت کے خیمہ یا پھر بیت المقدس کی تعمیر ومرمت اور قربانی کے طلائی و نقرئی ظروف وسامان کے بنانے میں خرچ کی جاتی تھی (خروج ۳۰۔۱۳) دوسری خیرات یہ تھی کہ کھیت کاٹتے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جابجا کونوں اور گوشوں میں کچھ دانے اور پھل چھوڑ دیئے جائیں' وہ غریبوں اور مسافروں کا حصہ تھا (احبار ۱۹۔۱۰) اور سوم یہ تھی کہ ہر تیسرے سال کے بعد پیداوار اور جانوروں کا دسواں حصہ خدا کے نام پر نکالا جائے اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا مع اہل وعیال کے بیت المقدس جا کر جشن منائے اور کھائے اور کھلائے' اور لاویوں میں جو موروثی کاہن اور خدا کے گھر کے خدمت گزار ہیں' نام بنام تقسیم کیا جائے اس کے بدلے میں وہ خاندانی وراثت سے محروم رکھے گئے تھے' اس کے بعد یہ چیزیں بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کر دی جاتی تھیں' کہ ان سے مسافروں اور یتیموں اور بیواؤں کو کھانا کھلایا جائے (استثناء ۱۴۔۲۶ سے ۲۹ تک)

شریعت محمد ﷺ نے مذہب کی حقیقت میں سب سے بڑی جو اصلاح کی۔

۱۔ وہ عبادت میں خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطوں کا خذف کرنا تھا' یہاں ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے' اس بنا پر مفت خور کاہنوں اور عبادت گاہوں کے خادموں کی ضرورت ساقط ہوگئی اور اس لئے زکوٰۃ کا یہ مصرف جو قطعاً بیکار تھا' کالعدم اڑ گیا۔

۲۔ عبادت میں سادگی پیدا کر کے ظاہری رسموں اور نمائشوں سے اس کو پاک کر دیا

گیا' اس لئے سونے چاندی کے سامانوں' قربانی کے برتنوں اور محرابوں کے طلائی شمعدانوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

۳۔ حج ان ہی پر واجب کیا گیا جن کے پاس زادراہ ہو' اس لئے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی اور اس لئے یہ رقم بھی خارج ہوگئی۔

۴۔ زکوٰۃ کی چیز کو مالک کے ذاتی ضروریات اور کھانے میں صرف ہونے کی ممانعت کر دی گئی' کہ اگر وہ مالک ہی کی ضروریات میں خرچ ہوگئی تو اس میں ایثار کیا ہوا۔

۵۔ اس طرح وہ تمام سامان اور رقمیں جو ان مدوں سے بچیں' غریبوں' مسکینوں اور مسافروں وغیرہ کو دے دی گئیں' گذشتہ اصطلاحات کے علاوہ شریعت محمدیہ ﷺ نے زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض اور اصلاحیں بھی کی ہیں مثلاً۔

(۱)۔ ھدایہ جلد اول' باب الزکوٰۃ فی التجارۃ۔

۶۔ شریعت سابقہ میں ایک بڑی تنگی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہیں کی جاتی تھی' بلکہ ذخیرہ میں جمع ہو کر اس کا کھانا پک کر غرباء میں تقسیم ہوتا تھا' لیکن عام انسانی ضرورتیں صرف کھانے تک محدود نہیں ہیں' اس لئے شریعت محمدیہ نے اس رسم میں یہ اصلاح کی کہ غلہ یا رقم خود مستحقین کو دے دی جائے تا کہ وہ جس طرح چاہیں اپنی ضروریات میں صرف کریں۔

۷۔ ایک بڑی کمی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آدھے مثقال والی تھی' وہ بیت المقدس کے خرچ کے لئے مخصوص تھی' اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی' شریعت محمدیہ نے بیس مثقال پر آدھا مثقال نقد زکوٰۃ فرض کر کے اس کو بھی تمام تر مستحقین کے ہاتھوں میں دے دیا۔

۸۔ غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارا بیت المقدس چلا جاتا تھا اور وہیں سے پکوا کر تقسیم کیا جاتا تھا' یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لئے تو شاید موزوں ہوسکتا'

مگر ایک عالمگیر مذہب کے تمام عالم میں منتشر پیروؤں کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا اس لئے مناسب سمجھا گیا' کہ ہر جگہ زکوٰۃ اسی مقام کے مستحقین میں صرف کی جائے۔

۹۔بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤں کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی لالچ کرتے تھے' جب تک ان کو امداد ملتی رہتی خوش اور مطمئن رہتے اور جب نہ ملتی تو طعن وطنز کرنے لگتے' اسلام نے ایسے لوگوں کا منہ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادت بد کی اصلاح کے لئے زکوٰۃ کے جملہ مصارف کی تعین کر دی اور بتایا کہ اس کے مستحق کون لوگ ہیں' اور اس رقم سے کس کس کو مدد دی جاسکتی ہے چنانچہ سورۂ توبہ کے ساتویں رکوع میں اس کا مفصل ذکر ہے۔

۱۰۔اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین نہ کی جاتی اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتا دیئے جاتے' تو یہ تمام سرمایہ خلفاء اور سلاطین کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا اور سلطنت کی دوسری آمدنیوں کی طرح یہ بھی ان کے عیش وعشرت کے پرتکلف سامانوں کی نذر ہو جاتا۔اس لئے تاکید کر دی گئی جو غیر مستحق اس کو لے گا' اس کے لئے یہ حرام ہے اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ جان بوجھ کر دے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی' اس بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں زکوٰۃ تا بامکان اب تک صحیح مصارف میں خرچ ہوتی ہے۔

۱۱۔اس قسم کی مالی رقوم جب کوئی اپنے پیروؤں پر عائد کرتا ہے تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ایک دائمی آمدنی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے' حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارونؑ اور ان کی اولاد (بنولادی) کو ٹھہرایا گیا تھا' کہ وہ خاندانی کاہن مقرر ہوئے تھے' مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس قسم کی بدگمانیوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا' اور اپنے خاندان کے لئے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر مد قطعی طور پر حرام قرار

دی۔

۱۲۔قرآن مجید میں زکوۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے ہیں۔

انما الصدقات للفقرآء والمسا کین والعاملین علیها والمئولفہت قلوبهم و فی

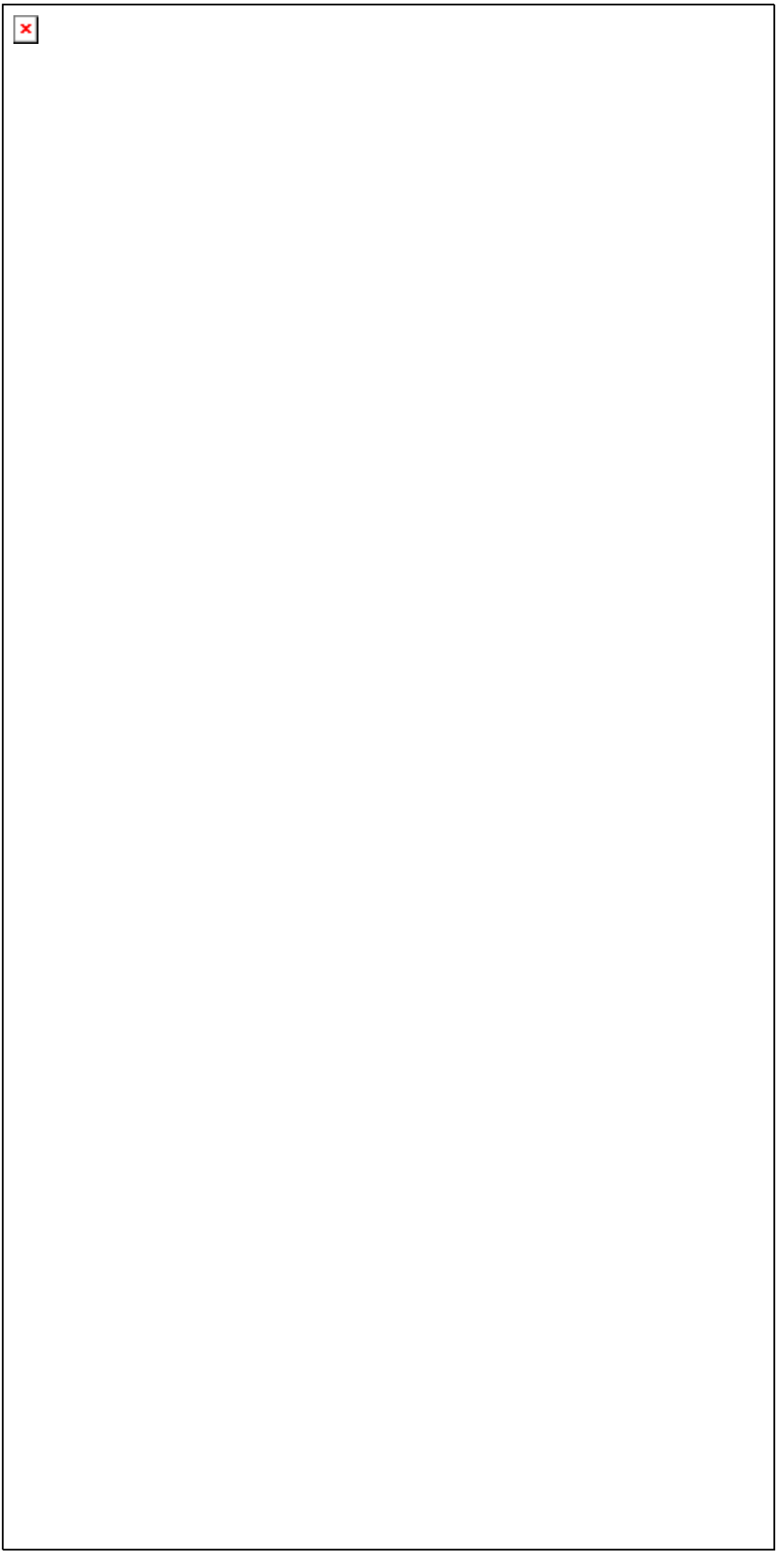
زکوٰۃ کا مال تو (۱)غریبوں، (۲) مسکینوں، اور زکوۃ کے صیغہ میں کام کرنے والوں (۳) اور ان لوگوں کیلئے ہے جن کے (۴)

الرقاب والغارمین وفی سبیل الله وابن السبیلط فریضہت من اللہط والله علیم حکیم۔ (توبہ:۸)

دلوں کو اسلام کی طرف ملانا ہے اور (۵) گردن چھڑانے میں جو (۶) تاوان بھریں ان میں اور (۷) خدا کی راہ میں اور (۸) مسافر کے بارہ میں یہ خدا کی طرف سے ٹھہرایا ہوا ہے، اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے (اس لئے اس کی یہ تقسیم علم وحکمت پر مبنی ہے۔)

فقراء میں ان خوددار اور مستور الحال شرفاء کو ترجیح دی ہے جو دین اور مسلمانوں کے کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا بیوپار نہیں کر سکتے اور حاجت مند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور اپنی آبرو اور خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

للفقرآء الذین احصروا فی سبیل الله لا یستطیعون ضربا فی الارض یحسبهم الجاهل اغنیاء من التعفف۔ تعرفهم بسیماهم لا یسئلون الناس الحافا۔ (بقرہ:۲۷۳)



سے خودغرضی کا شائبہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ہی رشتہ دار ہیں اور ان کا نفع ونقصان اپنا ہی نفع ونقصان ہے' لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی مغالطہ اور فریب تھا' ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہیں وہ تمام تر تعلقات کی کمی وبیشی پر مبنی ہیں' جو جتنا ہی قریب ہے اتنا ہی زیادہ' آپ کے حقوق اس پر اور اس کے حقوق آپ پر ہیں' اگر یہ نہ ہو تو رشتہ داری اور قرابت مندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور مہمل ہو جائیں' انسان پر سب سے پہلے اس کا اپنا حق ہے' پھر اہل وعیال کا' ان کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر سال میں کچھ بچ جائے تو اس میں حصہ پانے کے سب سے زیادہ مستحق قرابت دار ہیں' چنانچہ وراثت اور ترکہ کی تقسیم میں اسی اصول کی رعایت کی گئی ہے۔

یہ سمجھنا بھی کہ اگر قرابت داروں کو ترجیح دی جائے تو غریبوں کا حق کون ادا کرے گا' ایک قسم کا مغالطہ ہے' دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے اس بناء پر اگر ہر شخص اپنے رشتہ داروں کی خبر گیری کرے تو کل انسانوں کی خبر گیری ہو جائے گی اس کے علاوہ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے جس کو دور ہو جانا چاہئے' مستحقین میں باہم ایک کو دوسرے پر جو فوقیت ہے اس کا مدار دو چیزوں پر ہے ایک تو دینے والوں سے ان اشخاص کے قرب و بعد کی نسبت' دوسرے ان اشخاص کی حاجتوں اور ضرورتوں کی کمی وبیشی قرابت مندوں کو ترجیح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خواہ ان کی ضرورت کتنی ہی کم اور معمولی ہو' ان کو ان لوگوں پر ترجیح ہے' جن کی ضرورت اور حاجتمندی ان سے کہیں زیادہ ہے' بلکہ مسئلہ کی صورت یہ ہے' کہ اگر وہ ضرورت مند برابر کے حاجت مند ہوں اور ان میں سے ایک آپ کا عزیز یا دوست یا ہمسایہ ہو تو وہ آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہوگا' یعنی ضرورت اور حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی وبیشی ترجیح کا دوسرا سبب بنے گی' نہ کہ پہلا سبب؟ اور یہ انسان کی فطرت ہے' کہ ایسی حالت میں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو ترجیح دے۔

فقراء اور مساکین میں سے ان لوگوں پر جو بے حیائی کے ساتھ دربدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں ان کو ترجیح دے گئی ہے جو فقر و فاقہ کی ہر قسم کی تکلیف گوارا کرتے ہیں' لیکن اپنی عزت و آبرو اور خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے' یہ تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے' جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے' آپ نے فرمایا ''مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک دو لقمے دربدر پھرایا کرتے ہیں۔'' صحابہؓ نے دریافت کیا پھر کون مسکین ہے ارشاد ہوا ''وہ جس کو حاجت ہے لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ کسی سے مانگتا نہیں۔(۱)۔''

اس تعلیم کے دو مقصد ہیں' ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والوں کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دے گا' اور وہ کہیں نہ کہیں سے پا ہی جائیں گے۔ اس لئے ان کی طرف اس قدر اعتناء ضروری نہیں' اصلی توجہ ان مستور الحال مسکینوں کی طرف ہونی چاہئے جو صبر و قناعت کے ساتھ فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں کہ ان کی خبر بہتوں کو نہیں ہو سکتی اور اکثر وہ امداد سے محروم رہ جاتے ہیں' دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کر دے کہ بے حیاء گداگروں کی عزت اس کی نگاہ میں نہایت کم ہے اور وہ ہر حال میں اس بے حیائی کو ناپسند کرتی ہے۔

شریعت نے مصارف زکوٰۃ کی تعیین و تحدید اس غرض سے بھی کی ہے تاکہ ہر شخص کو مانگنے کی ہمت نہ ہو' اور ہر کس و ناکس اس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے' جیسا کہ بعض منافقین اور اہل بادیہ نے اس کو اپنے ایمان و اسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا۔ چنانچہ وحی الٰہی نے ان کی پردہ داری ان الفاظ میں کی:

ومنهم من يلمزك في الصدقات فان اعطوا منها رضوا وان لم يعطوا منها اذا هم يسخطون . ولو انهم رضوا ما اتهم الله ورسوله

اور بعضے ان میں سے ایسے ہیں جو تجھ کو (پیغمبر کو) زکوٰۃ بانٹنے میں طعن دیتے ہیں، اگر ان کو اس سے میں سے ملے تو راضی ہوں، اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش ہو جائیں اور کیا خوب تھا

(۱)۔ صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب المسکین الذی لا یجد غنی ولا یفطن لہ فیتصدق علیہ۔

وقالوا حسبنا اللہ سیؤتینا اللہ من فضلہ ورسولہ انا الی اللہ راغبون۔ انما الصدقت للفقرآء والمسٰکین والعٰملین علیھا و المئولفہت قلوبھم وفی الرقاب والغٰرمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل فریضہت من اللہ۔ (توبہ:۵۹،۸۰)

اگر وہ اس پر راضی رہتے، جو خدا اور اس کے رسول نے ان کو دیا اور کہتے ہیں کہ ہم کو اللہ بس ہے، اور اس کے رسول نے ان کو اور اپنی مہربانی سے اور اس کا رسول دے رہیں گی، ہم کو تو خدا ہی چاہئے زکوٰۃ تو حق ہے غریبوں کا، مسکینوں کا اور اس کا کام کرنے والوں کا اور ان کا جن دل (اسلام کی طرف) پرچانا ہے، اور گردن چھڑانے میں، اور خدا کی راہ میں، اور مسافروں میں یہ حصے خدا کی طرف سے ٹھہرائے ہوئے ہیں۔

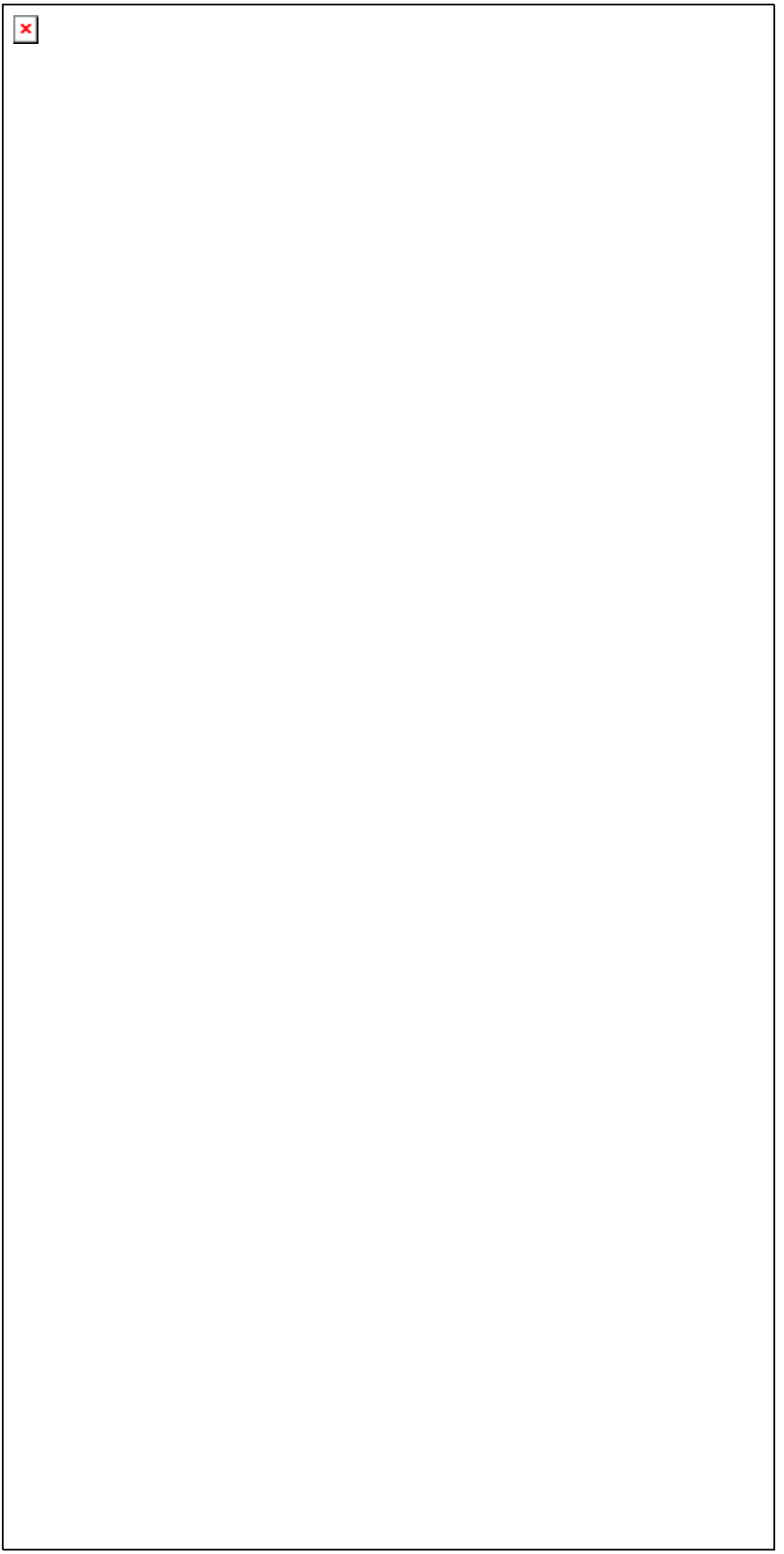
ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ پانے کی درخواست کی، آپ نے فرمایا اے شخص! اللہ تعالیٰ نے مال زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے، بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اس کے آٹھ مصرف بیان کر دیے ہیں اگر تم ان آٹھ میں ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں۔(۱)۔

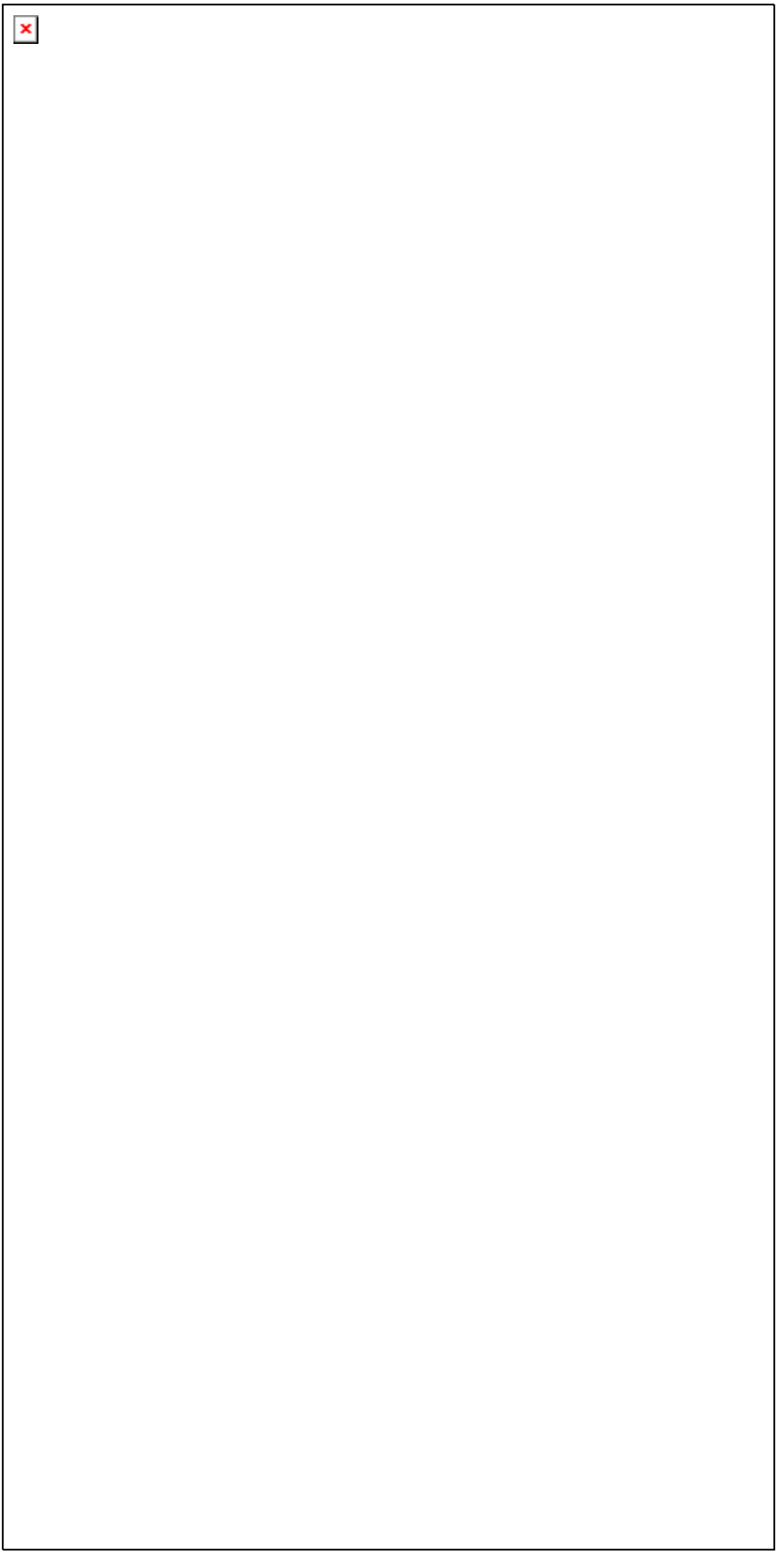
اسلام میں زکوٰۃ کے مصارف ہشتگانہ::

یہ آٹھوں مصارف نیکی، بھلائی اور خیر وفلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہیں، فقراء اور مساکین میں وہ تمام اہل حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت و کوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، جیسے بوڑھے، بیمار، اندھے، لولے لنگڑے، مفلوج، کوڑھی، یا وہ محنت کر سکتے ہیں لیکن موجودہ حالت میں دین وملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں، کہ وہ اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے، مبلغین، مذہبی معلمین، بالغ طالب علم جو للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربا فی الارض۔ میں اسی طرح داخل ہیں جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ مبارک میں اصحاب صفہ داخل تھے اور وہ کم نصیب بھی داخل ہیں جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے ہیں اور فاقہ کرتے ہیں۔

(۱)۔ ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب من یعطی الصدقۃ وحدالغنی۔

والعاملین علیھا یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی تحصیل وصول کا کام کرنے والے بھی اس میں اپنے کام کی اجرت پا سکتے ہیں۔ اور والمؤلفۃ قلوبھم۔ (جن کی تالیف قلوب کی جائے) میں وہ لوگ داخل ہیں جن کو ابھی اسلام کی طرف مائل کرنا ہے یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے وفی الرقاب (گردن کے چھڑانے میں) اس سے مقصود وہ غلام ہیں جن کی گردنیں دوسرے کے قبضہ میں ہیں اور ان کو خرید کر آزاد کرنا ہے، اور وہ مقروض ہیں جو اپنا قرض آپ کسی طرح ادا نہیں کر سکتے، والغارمین (تاوان اٹھانے والوں) سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دوسرے لوگوں اور قبیلوں میں مصالحت کرانے کیلئے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے، یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بیت المال سے ادا کی جا سکتی ہے وفی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں) ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل





تھے اور اب بھی بنوائے جاتے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب اسٹیم اور بجلی کے عہد میں یہ تمام مشکلیں افسانہ، کہن اور داستان پارینہ ہوگئی ہیں، اب ہر جگہ اچھے سے اچھے ہوٹل، تیز سے تیز سواریاں، بڑے سے بڑے بینک اور آمد و رفت کا سامان کرنے والی کمپنیاں قائم ہوگئی ہیں، اور سفر و حضر میں کوئی فرق نہیں رہا ہے مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہوا ہے یہ صرف دولتمندوں اور سرمایہ داروں کی راحت و آسائش کے لئے ہوا ہے، اور ان کے ان نئے طریقوں نے پرانے طریقوں کے پرانے آثار کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے، آج متمدن دنیا کے بڑے سے بڑے پر رونق شہروں سے لے کر معمولی دیہاتوں تک میں جہاں امیر اور دولتمند مسافر کے لئے قدم قدم پر ہوٹل، ریسٹران، قہوہ خانے اور آرام خانے موجود ہیں وہاں اس پورے مسیحی ملک میں حضرت مسیح کی طرح ایک غریب مسافر کے لئے کہیں سر رکھنے کی جگہ نہیں، کسی کی جیب میں جب تک کسی بنک کا نوٹ اور چیک نہیں، اس کے لئے ہوٹلوں اور اقامت خانوں کے تمام دروازے بند ہیں، کیا یہ انسانیت کے لئے رحم ہے؟ کیا یہ بنی نوع انسان کے لئے ہمدردی ہے؟ لیکن ان تمام ملکوں کے طول و عرض میں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلاموں کے قبضہ میں آئے، سراؤں، مسافر خانوں، کنوؤں اور مہمان خانوں کا وہ وسیع سلسلہ قائم ہوگیا کہ ایک غریب مسلمان اسپین کے کنارہ سے چل کر کاشغر کے ایک گاؤں میں بہ آرام و آسائش پہنچ جاتا ہے اور ہندوستان کے اس سرے سے روم کے اس سرے تک اھلا باھل و اوطانا "باوطان کہتا ہوا بے خطر چلا جاتا ہے، اور آج بھی اس نظام کی بدولت ان اسلامی ملکوں میں جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طور و طریق سے واقف نہیں ہیں، غریب مسافروں کو وہی آرام و آسائش حاصل ہے اور امراء اور دولت مندوں کے لئے کیا کہنا کہ ایک پرانے جہاں گرد سیاح بزرگ (سعدی) کے مقولہ کے مطابق:

منعم بکوہ ودشت و بیاباں غریب نیست
ہرجا کہ رفت خیمہ زود بارگاہ ساخت

جماعتی کاموں کے اخراجات کی صورت::

جب تک منتشر افراد ایک شیرازہ میں نہیں بندھ جاتے، حقیقت میں جماعت کا وجود نہیں ہوتا، لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ ہی افراد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات پیش آتی ہیں۔ جماعت کے کمزوروں، معذوروں اور مفلسوں کی مدد، جماعت اور اس کے اصول کی حفاظت کے لئے سرفروشانہ مجاہدہ کی صورت میں اس کے اخراجات کی کفالت، جماعت کی آمدورفت اور سفر کے وسائل کی ترقی وتعمیر، جماعت کی خاطر، جماعت کے مالی نقصان اٹھانے والوں اور مقروضوں کی امداد کرنا جماعت کے ان کارکنوں کو معاوضہ دینا، جو جماعت کی مذہبی، علمی، تعلیمی خدمات بجا لائیں، اور اس رقم کی فراہمی اور نظم ونسق کے فرائض انجام دیں، زکوٰۃ اسی نظام جماعت کا سرمایہ دولت ہے۔

زکوٰۃ کے مقاصد، فوائد اور اصلاحات::

زکوٰۃ کا اصلی اور مرکزی مقصد وہی ہے جو خود لفظ ''زکوٰۃ'' کے اندر ہے ''زکوٰۃ'' کے لفظی معنی ''پاکی'' اور ''صفائی'' کے ہیں، یعنی گناہ اور دوسری روحانی، قلبی اور اخلاقی برائیوں سے پاک وصاف ہونا، قرآن پاک میں یہ لفظ اس معنی میں بار بار آیا ہے، سورۂ والشمس میں ہے:

قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا۔ (شمس: ۱)
مراد پایا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک وصاف کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو میلا اور گندہ کیا۔

ایک اور سورہ میں ہے:

قد افلح من تزکی (اعلی: ۱)

مراد پایا وہ جو پاک وصاف ہوا۔

یہ تزکیہ اور پاکی وصفائی نبوت کے ان تین عظیم الشان خصوصیتوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر قرآن پاک کی تین چار آیتوں میں آیا ہے:

یتلوا علیہم ایتہ ویزکیہم ویعلمہم الکتب والحکمہت۔ (بقرہ' جمعہ:۲)

وہ نبی خدا کی آیتیں پڑھ کر ان کو سناتا ہے اور ان کو گناہوں سے پاک وصاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

تزکیہ نفس::

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ نفس یعنی پاکی وصفائی کی اہمیت اسلام اور شریعت محمدی میں کتنی ہے؟ یہ دل کی پاکی' روح کی صفائی اور نفس کی طہارت مذہب کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے' انسانوں کی روحانی نفسانی بیماریوں کے بڑے حصہ کا سبب تو خدا سے خوف ورجاء اور تعلق ومحبت کا نہ ہونا ہے اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے لیکن دوسرا بڑا سبب' ماسوی اللہ کی محبت اور مال و دولت اور دیگر اسباب دنیا سے دل کا تعلق ہے' زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب بعض صحابہؓ سے باغ وبستان کی محبت کے سبب سے جو ان کی دولت تھی' غزوہ میں عدم شرکت کا جرم ثابت ہوا ہے' اور پھر ان کی صداقت و سچائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا ہے' وہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے قرآن پاک میں ارشاد ہے:

خذ من اموالہم صدقہت تطہرہم و تزکیہم بہا۔ (توبہ:۱۳)

ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے کر ان کو پاک وصاف بنا۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے محبوب مال میں سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبت مال ہے دل سے دور ہو جاتا ہے' بخل کی بیماری کا اس سے علاج ہو جاتا ہے مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے' دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے' شخصی خودغرضی کی بجائے جماعتی اغراض کے لئے اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے اور یہی وہ دیواریں ہیں جن پر تہذیب نفس اور حسن خلق کی عمارت قائم اور جماعتی زندگی کا نظام مبنی ہے۔

قرآن مجید میں سود اور صدقہ میں جو حد فاصل قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے:

یمحق اللہ الربوا ویربی الصدقت۔ (بقرہ:۳۸)

خدا سود کو گھٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت سود میں نقصان اور صدقہ کے مال میں اضافہ ہوتا ہے' کیونکہ مشاہدہ بالکل برعکس ہے بلکہ اخروی ثواب و گناہ اور برکت و بے برکتی کے فرق کے علاوہ اصلی مقصد اس سے یہ ہے کہ سود گو شخصی دولت میں اضافہ کرتا ہے' لیکن جماعتی دولت کو برباد کر دیتا ہے' جس سے پوری قوم مفلس ہو جاتی ہے اور آخر وہ شخص بھی تباہ ہو جاتا ہے' اور قومی صدقہ و عطاء سے قوم کے نہ کمانے والے افراد کی امداد ہو کر قومی دولت کا معتدل نظام باقی رہتا ہے' اور ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی بسر کرتی ہے اگر سود لینے والا کبھی اتفاقی مالی خطرہ میں پڑ جاتا ہے تو اس کی مدد کیلئے جماعت ایک انگلی تک نہیں ہلاتی' لیکن صدقہ دینے والے کی مدد کیلئے پوری قوم کھڑی ہو جاتی ہے۔

ایک اور بات یہ ہے کہ سود خور اس قدر حریص اور طماع ہو جاتے ہیں کہ ان کو مال کی کثیر مقدار بھی کم نظر آتی ہے' اور جو لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے کے خوگر ہوتے ہیں وہ اس قدر مستغنی اور قانع ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے'

سود خور اپنے مال میں اضافہ اور ترقی کی حرص میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس تلوار سے دوسروں کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے' آخر اسی تلوار سے دوسرا اس کو قتل کر کے اس کے تمام اصیل و منافع پر بیک دفعہ قبضہ کر لیتا ہے لیکن صدقہ و خیرات دینے والا جو دوسروں کی دولت ناجائز طریق سے نہیں لوٹتا بلکہ خود دوسروں کو اپنے مال اور قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے' دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہروں کی منڈیاں اور کوٹھیاں اس عبرت انگیز واقعہ کی پوری تصویر ہیں' اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے' پھر ظاہر ہے کہ استغناء اور قناعت ایسی چیز ہے جو تمام اخلاقی محاسن کا سنگ بنیاد ہے بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت بلیغ و حکیمانہ طریق سے یہ ارشاد فرمایا کہ لیس الغنی من کثرۃ العرض ولکن الغنی غنی النفس (۱)۔ تونگری دولت کی کثرت کا نام نہیں ہے' بلکہ دل کی بے نیازی کا نام ہے' اسی حدیث کا ترجمہ سعدی نے ان لفظوں میں کیا ہے "تونگری بدل است نہ بمال" دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ دولت آمدنی کی زندگی کا نام نہیں بلکہ ضروریات کی کمی کا نام ہے' لیکن یہ غیر فانی دولت حرص و طمع سے نہیں' بلکہ صبر و قناعت کی بدولت حاصل ہوئی ہے' اس بناء پر کیا کسی کو زکوٰۃ و صدقہ کے مطہر' مزکی اور مصلح اخلاق ہونے میں شبہہ ہو سکتا ہے؟

سود خور کو دوسروں کے لوٹنے سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کا فرض ادا کرتے' وہ تو ہمیشہ اس تاک میں رہتا ہے کہ دوسرے مصیبتوں اور دقتوں میں پھنسیں اور وہ ان کی اس حالت سے فائدہ اٹھائے لیکن جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں وہ ہمیشہ قابل ہمدردی اشخاص کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تا کہ اپنے مال و دولت سے اس کی مدد کر کے اس کے زخم دل پر مرہم رکھ سکیں۔

باہمی اعانت کی عملی تدبیر::

زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصہ غریبوں اور حاجت مندوں کی امداد ہے' انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہے جس کے ساتھ تمام مذہبوں نے ہمدردی کی ہے' اور اس کی

تسلی وتسکین کے لئے دوسری دنیا کی توقع اور امید کے بڑے بڑے خوش آئند الفاظ استعمال کئے ہیں' لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی زندگی کی یہ تلخی محض اہل مذاہب کی شیریں کلامی سے دور نہیں ہو

(۱)۔ بخاری کتاب الرقاق باب الغنی غنی النفس۔

سکتی' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کے پہلے اور وہی پچھلے پیغمبر ہیں جنہوں نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا' اور اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کے لئے عملی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی' خود اپنی زندگی غریبوں اور مسکینوں کی صورت سے بسر کی اور دعا فرمائی کہ ''خداوندا! مجھے مسکین زندہ رکھ' مسکین اٹھا' اور مسکینوں ہی کے زمرہ میں میرا حشر کر۔'' آپ ﷺ کے گھر کا چبوترہ (صفہ) غریبوں اور مسکینوں کی پناہ کا سایہ تھا' وہی آپ کی بزم اقدس کے مقرب درباری اور اسلام کے معرکوں کے مخلص جانباز تھے' آپ ﷺ کی نظر میں کسی انسان کی غربت اور تنگدستی اس کی ذلت اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی' نہ دولت و امارت' عزت و وقار کے مترادف تھی' بلکہ صرف نیکی اور پرہیز گاری' فضیلت و بزرگی کا اصلی معیار تھی' حضرت مسیح نے فرمایا کہ ''مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں' کیونکہ آسمان کی بادشاہت انہیں کی ہے۔(۱)۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے زیادہ اختصار و ایجاز کے ساتھ اس مطلب کو ادا فرمایا:

ان المکثرین ھم المقلون (۲)۔

جو دولت مند ہیں وہی غریب ہیں۔

اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ جو غریب ہیں وہی دولت مند ہوں گے۔

پھر انہیں خوشخبری دی کہ غریب (جن کو خدا کے آگے اپنی کسی دولت کا حساب نہیں دینا ہے) دولت والوں سے ۴۰ سال پہلے جنت میں داخل ہوں (۳)۔گے۔

اسلام نے ان روحانی تسلیوں اور بشارتوں کے ساتھ جو مزید کام کیا' وہ ان کی دنیاوی

تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کی عملی تدبیریں ہیں' جن کا نام صدقہ اور زکوٰۃ ہے' اس کی تعلیم نے اس عملی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی ترغیب وتشویق تک محدود نہیں رکھا' بلکہ اس کیلئے دو قسم کی تدبیریں اختیار کیں' ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی جس سے جتنا جو اپنی دولت سے ان کی مدد کرے' یہ اخلاقی خیرات ہے' جس کا نام قرآن کی اصلاح میں ''انفاق'' ہے لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہیں کرتی' اس لئے ایک مقدار معین کے مالک پر ایک ایسا قانونی محصول عائد کیا جس کا سالانہ ادا کرنا اس کا مذہبی فرض ہے اور اس مجموعی رقم کا بڑا حصہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد واعانت کیلئے مخصوص کیا' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اس تعلیم کو ایک ناقابل تغیر دستور العمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کیلئے سپرد فرمایا' چنانچہ آپ ﷺ نے معاذ بن جبلؓ کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیجا تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوٰۃ ہے' پھر اس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ:

تئوخذ من اغنیاء هم وترد علی فقرائهم (۴)۔

وہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو لوٹا دیا جائے۔

(۱)۔ متی ۵' ۳۔ (۲)۔ صحیح بخاری کتاب الرقاق باب المکثرون هم القلون۔ (۳)۔ جامع ترمذی کتاب الزهد باب ماجاء فقراء المهاجرین یدخلون الجنته قبل اغنیائم۔ (٤)۔ صحیح بخاری' جلد دوم صفحه ۱۰۹٦ کتاب الرو علی الجهمیه۔

صحابہؓ نے آپ ﷺ کی ہدایت کے بموجب ان دونوں قسموں کی خیراتوں پر اس شدت سے عمل کیا کہ جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے' وہ بازار جا کر مزدوری کرتے تھے' تاکہ جو رقم ہاتھ آئے وہ غریب ومعذور بھائی کی اخلاقی اعانت میں خرچ کریں اور اس معاملہ میں خود آپ نے یہاں تک اس طبقہ کی دلجوئی کی فرمایا ''اگر کسی کے

پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف و مہربانی سے بات ہی کرنا اس کا صدقہ ہے۔'' اس سے زیادہ یہ کہ اس کی بھی ممانعت کی گئی کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو سختی سے واپس نہ کیا کرو' خدا نے تعلیم دی:

فاما الیتیم فلا تقھر و اما السائل فلا تنھر (ضحی: ۱)

تو یتیم کو دبایا نہ کرو اور نہ مانگنے والے کو جھڑک۔

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجت مند کی مدد کرو تو اس پر احسان مت دھرو' کہ وہ شرمندہ ہو' بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی اور اسکی توفیق عنایت کی' احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پیالہ حباب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائے گا' فرمایا:

لا تبطلوا صدقتکم بالمن و الاذی۔ (بقرہ: ۲۶۲)

تم اپنی خیرات کو احسان دھر کر یا طعنہ دے کر برباد نہ کرو۔

اس لطف' اس مدارات اور اس دلجوئی کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے انسانیت کے قابل رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی' اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے کی مدد کا سبق پڑھایا' اگر یہ حکم صرف اخلاقی حیثیت سے یا صرف مبہم طریقہ سے ہوتا' یا سب کو سب کچھ دے ڈالنے کا حکم دے دیا جاتا تو کبھی اس پر اس خوبی' اس نظام اور اس پابندی کے ساتھ عمل نہ ہو سکتا اور آج بھی مسلمانوں کے سامنے یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے یہی سبب ہے کہ مسلمانوں میں اگر امیر کم ہیں تو ویسے غریب و محتاج بھی کم ہیں' جیسے دوسری قوموں میں نظر آتے ہیں تاہم افسوس ہے کہ ایک مدت سے مسلمانوں کا یہ نظام سخت ابتری کی حالت میں ہے اور اس کی تنظیم کی طرف سے غفلت برتی جا رہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا جماعتی کام منتشر و پراگندہ ہے۔

دولتمندی کی بیماریوں کا علاج::

دولت مندی اور تمول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب میں ایک معرکتہ الآرا بحث کی حیثیت سے چلا آ رہا تھا' یہودیت کی طرح بعض ایسے مذاہب ہیں جن میں نہ تو دولت مندی کی کوئی تحقیر کی گئی اور نہ مفلسی اور غربت کو سراہا گیا ہے بلکہ گویا اس بحث کو نامفصل چھوڑ دیا گیا ہے' لیکن عیسائیت اور بودھ مت' دو ایسے مذہب ہیں جن میں دولت کی پوری تحقیر کی گئی ہے' عیسائیت کی نظر میں دولت مندی اور تمول' نجات کی راہ کا کانٹا ہے' بلکہ کوئی انسان اس وقت تک نجات نہیں پا سکتا جب تک وہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے خدا کی راہ میں لٹا نہ دے' انجیل میں ہے کہ ایک نیکوکار دولت مند نے حضرت عیسٰیؑ سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب میں فرمایا:

''اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا' تب آ کے میرے ہو لے۔''

وہ دولتمند یہ تعلیم سن کر غمگین ہو کر چلا گیا' تب انجیل میں ہے کہ حضرت عیسٰیؑ نے فرمایا:

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گزر جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔'' (متی ۱۹۔۲۱۔۲۴)

بودھ مت نے نیک لوگوں کو ترک دنیا کی تلقین کی ہے اور ہر قسم کی دولت سے پاک رہنے کی ہدایت کی ہے اور ایسے لوگوں کیلئے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہوں تو بھیک کا پیالہ لے کر لوگوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیں لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں طریقوں کو ناپسند فرمایا' اصل یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بری چیز ہے تو اس برائی کو دوسروں کی طرف منتقل کر دینا' ان کی خیر خواہی نہ ہوئی' دشمنی ہوئی اگر غربت کوئی بڑائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسروں کو دے کر خود اسی حال میں

بن جانا کہاں کی دانشمندی اور اصلاح ہے اس لئے یہ طریقہ ہر شخص کے لئے یکساں مفید نہیں ہے، نہ نفس دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفس غربت شیطان کو فرشتہ بناتی ہے جس طرح دولت مندی دنیا میں ہزاروں سیہ کاریوں کی محرک ہے اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزاروں جرائم کا باعث ہے اور ان دونوں خرابیوں سے انسانوں کا بچانا ایک نبوت عظمیٰ کا فرض تھا، دولت بہ حیثیت دولت اور غربت بہ حیثیت غربت نیک و بد اور خیر و شر دونوں صفتوں سے پاک ہے، بلکہ نیکی کرنے کی عام صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکوکار دولت مند ایک نیکوکار غریب سے بدرجہا نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے، اسی لئے دولت اسلام کی نگاہ میں خدا کی ایک نعمت ہے، لعنت نہیں، ہنر ہے عیب نہیں، خیر ہے شر نہیں، چنانچہ قرآن پاک میں متعدد قوموں پر دولت کو ''خیر اور فضل'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی نے مرتے وقت چاہا کہ اپنا سارا مال و اسباب خدا کی راہ میں دے دیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم اہل و عیال کو غنی چھوڑ جاؤ'' یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں (۱)۔ آپ ؐ کے حلقہ بگوشوں میں دولتمند بھی تھے اور غریب بھی، اور دونوں آپ ؐ کے دربار میں برابر کی حیثیت رکھتے تھے، ایک دفعہ غریبوں نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہمارے دولتمند بھائی تو ہم سے سبقت لئے جاتے ہیں ہم جو نیکی کے کام کرتے ہیں وہ وہ بھی کرتے ہیں، اور اس کے علاوہ خیرات بھی کرتے ہیں، جو ہم نہیں کر پاتے، آپ ؐ نے ان کو ایک دعا سکھائی کہ یہ پڑھ لیا کرو، دولتمند صحابیوں نے یہ سنا تو وہ بھی دعا پڑھنے لگے، غریبوں نے پھر جا کر عرض کی، تو آپ ؐ نے فرمایا کہ یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے۔ (۲)۔

---

(۱)۔ بخاری کتاب الوصایا باب ان یترك ورثته اغنیاء خیر من ان یتکففوا الناس۔ (۲)۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم باب استحباب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا میں ہمیشہ سے غیر منفصل اور ناطے شدہ چلا آ رہا تھا' اپنی روشن تعلیم اور تلقین کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے حل کر دیا' ایک دفعہ آپ ﷺ نے تقریر میں فرمایا کہ ''لوگو! مجھے تمہاری نسبت جو ڈر ہے' وہ دنیا کے خیر و برکت کا ہے۔'' صحابہؓ نے پوچھا ''یا رسول اللہ! دنیا کے خیر و برکت سے آپ کا کیا مقصود ہے۔'' فرمایا ''دنیا کا باغ و بہار'' (عیش و نشاط اور مال و دولت) ایک شخص نے کہا ''یا رسول اللہ! کیا بھلائی سے برائی پیدا ہوتی ہے؟'' سائل کا منشا یہ تھا کہ دولت جو خیر و برکت ہے وہ فتنہ کیونکر ہو سکتی ہے' آپ ﷺ نے سوال سن کر ذرا تامل کیا' پھر پیشانی سے پسینہ کے قطرے پونچھے' پھر فرمایا ''بھلائی سے بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے' لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے جس کو موسم بہار نے سرسبز و شاداب بنایا ہو' جب بعض جانور حرص و طمع میں آ کر حد اعتدال سے زیادہ کھا لیتے ہیں تو دیکھو وہی خیر و برکت کی چیز ان کی ہلاکت اور موت کا باعث ہو جاتی ہے' لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ دھوپ کے سامنے ہو جاتا ہے اور کچھ دیر جگالی کرتا ہے' فضلہ باہر پھینک دیتا ہے اور پھر چرنے لگتا ہے دولت ایک خوشگوار چیز ہے' تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو یہ دولت اس کے لئے بہترین مددگار ہے' لیکن جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے حاصل نہیں کرتا' اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھاتا چلا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔(۱)۔''

اس تقریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرما دیا اور بتا دیا کہ نفس دولت خیر و شر نہیں ہے بلکہ اس کا درست و نادرست طریقہ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر و شر ہے' اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کی جائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کی جائے تو وہ نیکیوں اور بھلائیوں کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے' اگر

اس کے حصول وصرف کا طریقہ صحیح نہیں' تو وہ بری اور شر انگیز ہے' اخلاقی محاسن و معائب' امیر وغریب دونوں کے لئے یکساں' ایک سخی وفیاض ومتواضع امیر اور ایک قناعت پسند اور صابر وشاکر غریب اسلام کی نظر میں فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہیں' اسی طرح ایک متکبر بخیل امیر اور خوشامدی اور لالچی فقیر پستی کی ایک ہی سطح پر ہیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ دولت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک طرف امراء اور دولت مندوں کے اخلاق کی اصلاح کی جائے اور دوسری طرف غریبوں اور فقیروں کی امداد اور دستگیری کے ساتھ ان کے اخلاق اور عادات کو بھی درست کیا جائے' اسلام میں زکوٰۃ اسی عظیم الشان دوطرفہ اصلاح کا نام ہے۔

اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے سب سے پہلی حصول دولت کے ناجائز طریقوں' دھوکا' فریب' خیانت' لوٹ مار' جواء' سود وغیرہ کی سخت سے سخت ممانعت کی' سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہیں کی اور اس کے سب سے آسان ترین ذریعہ اور غریبوں کے لوٹنے کے سب سے عام طریقہ ''سود'' کو حرام مطلق' اور خدا اور رسول سے لڑائی کے ہم معنی فرمایا' ''جو زمین یونہی پڑی ہوئی ہے اس کو جو بھی اپنی کوشش سے آباد وسیراب کرے' اسی کی ملک قرار دی۔'' (طیالسی صفحہ ۲۰۴) متروکہ جائیداد کا مالک کسی ایک کو نہیں بلکہ بقدر استحقاق تمام عزیزوں کو اس کا حصہ دار بنا دیا' ممالک مفتوحہ کو امیر اسلام کی شخصی ملکیت نہیں' بلکہ پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا' فطرت کی ان بخششوں کو جو انسانی محنت کی ممنون نہیں جیسے پانی تالاب' گھاس' چراگاہ' نمک کی کان' معدنیات وغیرہ جماعتی تصرف میں دیا' اور بن لڑائی کے دشمنوں سے حاصل کی ہوئی زمینوں کو امراء اور دولت مندوں کے بجائے خالص غریبوں اور بے کسوں کا حق قرار دیا اور اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی۔

ما افاء الله على رسوله من اهل القرى فلله ولرسوله ولذى القربى واليتامى والمساكين وابن السبيل

کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم۔ (حشر: ۱)

بستیوں والوں کی ملکیت سے اللہ جو اپنے رسول کو ہاتھ لگا دے وہ خدا اور رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافروں کا حق ہے' تا کہ وہ الٹ پھر کر تم میں سے دولتمندوں ہی کے لینے دینے میں نہ رہ جائے۔

اس کے بعد اس سلسلہ میں دولتمندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو دنیا میں انسانیت کا بدترین مظہر اور آخرت میں بڑی سے بڑی سزاء کا مستوجب قرار دیا' اور جو اس گناہ سے پاک ہو اسی کو کامیابی کی بشارت دی' فرمایا:

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الزکوۃ و کتاب الزھد والرقاق باب ما یحذر من زھرۃ الدنیا۔

ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون۔ (حشر: ۱)

اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچایا گیا وہی لوگ ہیں مراد پانے والے۔

بخل کا مبتلاء دوسروں کے ساتھ بخل نہیں کرتا بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے وہ اس کی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہر دلعزیزی اور نیک نامی بلکہ جائز آرام وراحت تک سے اور آخرت میں ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے فرمایا:

ومن یبخل فانما یبخل علی نفسہ ط واللہ الغنی وانتم الفقرآء (محمد: ۴)

اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

اس آیت پاک میں درپردہ یہ بھی واضح کر دیا کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو' وہ درحقیقت تمہاری نہیں اصل مالک خدا ہے' اور تم خود اس کے محتاج ہو' پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو بلکہ محض امین ہو' وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق' اس کو صرف نہ

کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے اور اس کو اپنی ملکیت میں سے کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے خائن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؟ درحقیقت یہی تصور کہ یہ مال میرا ہے اور میری شخصیت اور انانیت کی طرف اس کی نسبت ہے' دنیا کی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے اس آیت پاک کی یہ تعلیم اس جڑ کو کھودتی اور بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔

پھر دولت کے ان مجازی مالکوں اور امینوں کو یہ بتادیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت میں اپنی دولت کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا۔

ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم (تکاثر: ۱)

پھر اس دن تم سے تمہاری نعمت کا حساب پوچھا جائے گا۔

اس لئے ان کو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اپنی دولت کہاں اور کس طرح صرف کرتے ہیں' ان لوگوں کو جو اپنے روپے کی تھیلیوں کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں تنبیہہ کی:

ویل لکل ھمزۃ لمزۃ جمع مالا وعددہ۔
یحسب ان مالہ اخلدہ۔ کلا۔ (ہمزہ: ۱)

برائی ہو اس کی جو طعنہ دیتا' اور عیب چنتا ہے' جو مال کو سینت کر رکھتا ہے' اور اس کو گن گن کر وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ رہے گا ہرگز نہیں۔

فرمایا' رشک کرنا صرف دو آدمیوں پر جائز ہے ایک تو اس پر جس کو خدا نے علم دیا ہے' اور وہ اس کے مطابق شب و روز عمل کرتا ہے اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ (۱)۔ جو لوگ سونے چاندی کو زمین میں گاڑ کر رکھتے ہیں اور کار خیر میں خوب خرچ نہ کرتے ہوں ان کو خطاب کیا:

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔ (توبہ: ۵)

وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں' اور اس کو خدا کی
راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی بشارت
دے دو۔

(۱)۔ بخاری کتاب العلم باب الاعتباط فی العلم و الحکمتہ۔

اس آیت پاک نے صحابہ میں دو فریق پیدا کر دیئے' ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب خدا کی راہ میں خرچ کر دینا چاہئے۔ کل کیلئے کچھ نہ رکھنا چاہئے ورنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت میں عذاب کا مستحق ہوگا' دوسرا کہتا تھا' خدا نے ہماری دولت میں جو حق واجب ٹھہرایا ہے (یعنی زکوۃ) اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع کرنا عذاب کا مستوجب نہیں' لیکن اہل راز صحابہ اور علمائے امت نے اپنے قول و فعل سے اس مشکل کی پوری گرہ کھول دی' حضرت موسیٰؑ کی تو راہ میں مقررہ زکوۃ ادا کرنے کے سوا مال کی خیرات کی کوئی تعلیم نہیں' اور حضرت عیسیٰؑ کی انجیل میں آسمانی بادشاہی کی کنجیاں اسی کے حوالے کی گئی ہیں' جو سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے' یہ دونوں تعلیمیں اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہیں' لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندوں کے حوصلہ سے کم ہے' اسی طرح دوسری تعلیم جو یقیناً ایک بلند روحانی تخیل ہے مگر وہ عملاً عام انسانوں کے حوصلہ سے بہت زیادہ ہے اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے اور اسی لئے بہت کم لوگ اس پر عمل کر سکے' محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونوں شریعتوں کی جامع ہے' اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کر دیئے' ایک قانونی اور دوسرا اخلاقی' قانونی خیرات کی وہی مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت میں ملحوظ تھی یعنی نصف مثقال نقد میں اور عشر پیداوار میں' یہ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع اور صاحب نصاب پر واجب ہے' اور اس کا وصول اور خرچ کرنا جماعت کا فرض ہے اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا

ہے' اسی کو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا' اور بلند ہمت انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی' صحابہؓ میں دونوں قسم کے لوگ تھے جو کل کیلئے آج اٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے' جیسے ابوذرؓ (۱)۔ اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدموں پر لا کر ڈال دیتے تھے۔ جیسے حضرت ابوبکرؓ (۲)۔ اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں بیک وقت لٹا دیتے تھے' جیسے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف' اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے' جیسے حضرت علی مرتضیٰؓ اور بعض انصار کرام' خدا نے ان کی مدح فرمائی:

ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا و یتیما و اسیرا۔

(دہر: ۱)

اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود اپنا کھانا مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔

ویئوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصہت۔

(حشر: ۱)

اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں' اگرچہ وہ خود حاجت مند ہوں۔

غرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق اور فطرت سلیمہ کے مطابق ہے اور ایک کیلئے اس کی استعداد اہلیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے' اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے جس سے اہل حاجت اور نیک کاموں کیلئے عملاً ہر وقت امداد مل سکے' اور ساتھ ہی اہل دل اور اہل استعداد کے مرتبہ کمال کیلئے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے اور اس کی خوبیاں اور بڑائیاں بھی بیان کر دی ہیں' تاکہ امت کے باحوصلہ افراد ہمت کے

شہپروں سے اڑ کر اس سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

(۱)۔ بخاری کتاب الزکوٰۃ باب ماادی زکوتہ فلیس بکنز۔ (۲)۔ ترمذی کتاب المناقب فضائل ابی بکر۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمتہ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں اسلام کے آخری مرتبہ کمال کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

"وایں طائفہ' جان و مال درباختہ اندو بہیچ کس ماسوا اللہ نہ پرواختہ اند' گفتئہ ایشاں است الفقیر مالہ مباح ودمہ ھدر یعنی درویش صادق آں بود کہ نجون و مال اورا دعوی نبود۔۔۔۔ اگر مالش برند خوش گردو' گوید الحمدللہ کی حجابے از پیش من برداشتند تاگفتہ اند' زکوٰۃ نعمت دنیا نزدیک اس طائفہ محمود نباشد' از آنکہ بخل نستودہ است و بخلی تمام باید تادویست ورم را دربند کند' ویکسال محوس دارد' آنگاہ پنج درم ازاں بدہد۔

اس فرقہ نے اپنی جان اور مال کو ہار دیا ہے' اور خدا کے سوا کسی سے دل نہیں لگایا' اس کا مقولہ ہے کہ درویش وہ ہے جس کا مال وقف اور جس کا خون معاف ہو' اس کو اپنی جان و مال پر کوئی دعویٰ نہ ہو۔۔۔۔ اگر لوگ اس کا مال اٹھالے جائیں تو خوش ہو کہ الحمدللہ اس کے اور خدا کے درمیان جو ایک پردہ پڑا تھا وہ اٹھ گیا یہاں تک کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ دنیا کی دولت کو جمع کر کے زکوٰۃ دینا کچھ اچھا نہیں ہے کیونکہ نجالت تعریف کے قابل نہیں' اور اس کے لئے سال میں دوسو درہم جمع ہوں اور پھر وہ ایک سال تک بند پڑے رہیں' تب جا کر ایک سال کے بعد پانچ درہم ان میں سے خدا کی راہ میں دے' بڑی نجالت کی ضرورت ہے۔

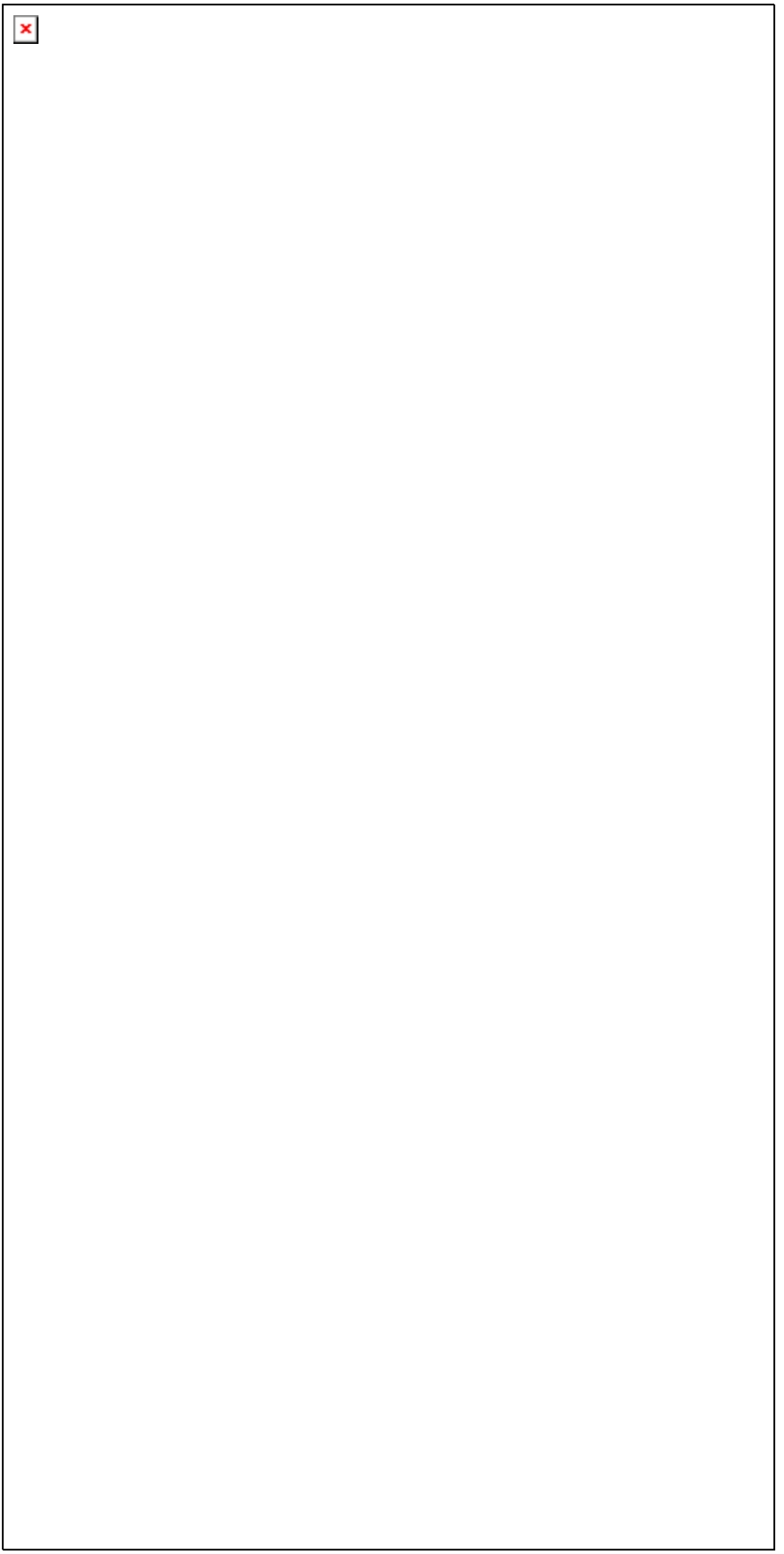
اس کے بعد حضرت شبلیؒ کا فتویٰ نقل کیا ہے :

یکے از فقہاء برسبیل آزمایش شبلی رحمتہ اللہ علیہ راپرسید کہ زکوٰۃ درچند لازم آید' گفت جواب بر مذہب فقیہان خواہی' یا برمذہب فقیران؟ گفت بوہر دو جواب فرما' شبلیؒ گفت' برمذہب فقیہان از دویست درم بعد از حولان حول پنجدرم باید داد' برمذہب فقیران درحال ہر دویست درم باید داد و جان بشکرانہ برسر باید نہاد' فقیہ گفت ماایں مذہب ازآئمہ دین گرفتیم' شبلی گفت ماایں مذہب از صادق رب العالمین گرفتیم یعنی ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ' او ہرچہ داشت پیش سید عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نہاد و جگر گوشہ خویشتن بشکرانہ داد'

(مکتوب ۳۴۔ سہ صدی)

کسی نے حضرت شبلیؒ سے امتحاناً پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے پر ہوتی ہے فرمایا فقہاء کے مسلک پر جواب چاہتے ہو یا فقراء کے' کہا دونوں کے' فرمایا فقہاء کے مذہب کے مطابق ایک سال گزرنے پر دوسو درم میں پانچ درم اور فقراء کے مسلک پر فوراً پورے کے پورے دوسو' اور اس نذرانہ کی خوشی میں اپنی جان بھی سر پر رکھ کر پیش کرنی چاہئے۔ فقیہ نے کہا ہم نے یہ مذہب آئمہ دین سے حاصل کیا ہے' فرمایا ہم نے یہ مسلک صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے حاصل کیا ہے کہ جو کچھ تھا وہ سب سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے رکھ دیا' اور اپنی جگر گوشہ (حضرت عائشہؓ صدیقہ) کو شکرانہ میں دیا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی'



چنانچہ ہر زمانہ کے قارونوں کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے۔
یونان کے آخری دور میں یہی صورت پیدا ہوئی۔ ایران کے انتہائی زمانہ میں مشکل نمودار ہوئی' یورپ کی موجودہ فضا میں یہی آب وہوا' اقتصادی مشکلات کے ابر و باد کا طوفان اور سیلاب پیدا کر رہی ہے' مزدور و سرمایہ دار کی جنگ پورے زور پر قائم ہے اور سوشلزم' کمیونزم' انارکزم' اور بالشوزم کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہیں لیکن دنیا میں مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لئے یہ دنیا کے نئے خاکے تیار کرنے والے جو نقشے بنا رہے ہیں وہ انسانی فطرت و تربیت کے اس درجہ مخالف ہیں کہ ان کی دائمی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے۔
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کرلیا تھا' اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لئے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ذاتی و شخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متقاضی ہے دولت و سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں جانے سے روکا جائے' سود کو حرام قرار دیا' متروکہ جائیداد کو صرف ایک ہی شخصی کی ملکیت قرار نہیں دیا' نفع عام کی چیزیں اشخاص کے بجائے جماعت کی **ملک** قرار دیں' قیصریت اور شہنشائیت کے بجائے جماعت کی حکومت قائم کی' زمینداری کا پرانا اصول جس میں کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا' بدل دی اور اس کی حیثیت اجیر اور مزدور کی دکھی انسانی فطرت کے خلاف یہ نہیں کیا کہ سرمایہ کو لے کر تمام انسانوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے تا کہ دنیا میں کوئی ننگا اور بھوکا باقی نہ رہے' بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ دار پر جس کے پاس سال کے مصارف کے بعد مقررہ رقم باقی بچ جائے اس کے غریب بھائیوں کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کر دی تا کہ وہ اس کے ادا کرنے پر مجبور ہو' اور جماعت کا فرض قرار دیا کہ وہ اس رقم سے قابل اعانت لوگوں کی دستگیری کرے یہی وہ راز ہے جس کی بنا پر اسلام کے تمدن کا دور اس قسم کی اقتصادی مصیبتوں سے محفوظ رہا' اور آج بھی اگر اسلامی

ممالک میں اس پر عمل درآمد ہوتو یہ فتنے زمین کے اتنے رقبہ جتنے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانی حکومت ہے پیدا نہیں ہو سکتے' خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت عثمانؓ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب میں دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی' حضرت ابوذر غفاریؓ نے شام میں قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق کہ ''جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔'' یہ فتوی دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام (۱)۔ ہے اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ دے دے اور شام کے دولتمند صحابہؓ نے ان کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ میں دے کر بچاتے ہیں تو حضرت ابوذرؓ کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی اور نہ عوام میں کوئی فتنہ پیدا کر سکی کیونکہ زکوۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا' اور عرب کے آرام و آسائش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ میں کوئی خیرات کا قبول کرنے والا باقی نہیں رہا۔ (۲)۔

اقتصادی اور تجارتی فائدے::

زکوۃ میں ان روحانی اور اخلاقی فائدوں کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے دنیاوی فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہیں' اوپر گزر چکا ہے کہ زکوۃ انہیں چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن میں دو صفتیں پائی جائیں یعنی بقاء اور نمو' بقاء سے مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں' کیونکہ جو چیز ایسی نہ ہوگی اس کی تجارت میں نہ چنداں فائدہ ہے' اور نہ وہ دوسروں کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے' اس لئے سبزیوں اور ترکاریوں پر زکوۃ نہیں ہے اور نمو سے یہ مقصد ہے کہ ان میں یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ کی بناء پر افزائش کی صلاحیت ہو' اسی لئے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھروں میں یا غیر مزدور زمین اور مکان میں بھی زکوۃ نہیں ہے ان دونوں نکتوں سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھیں' بلکہ محنت کوشش اور

جدوجہد سے اس کو ترقی دیں ورنہ اصل سرمایہ میں سال بسال کمی ہوتی جائے گی جس کو فطرتاً کوئی برداشت نہیں کرسکتا اس طرح زکوٰۃ بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت وزراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہیں ترقی دی جائے کیونکہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال میں ایک خاص رقم ادا کرنا پڑے گی تو وہ کوشش کرے گا کہ جہاں تک ہو' یہ رقم منافع سے ادا کرے اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے اسی بناء پر اسلام نے زکوٰۃ کو انہیں چیزوں کے ساتھ مخصوص کیا جن میں نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو' اور اسی بناء پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی تا کہ ہر شخص اپنے مال یا جائیداد سے کامل طور پر فائدہ اٹھا سکے' صحابہ کرامؓ اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار میں مصروف رہتے تھے' حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان لوگوں کو جو یتیموں کے سرمایوں کے متولی تھے ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت میں لگائیں تا کہ ان کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ میں سب صرف نہ ہو جائے۔

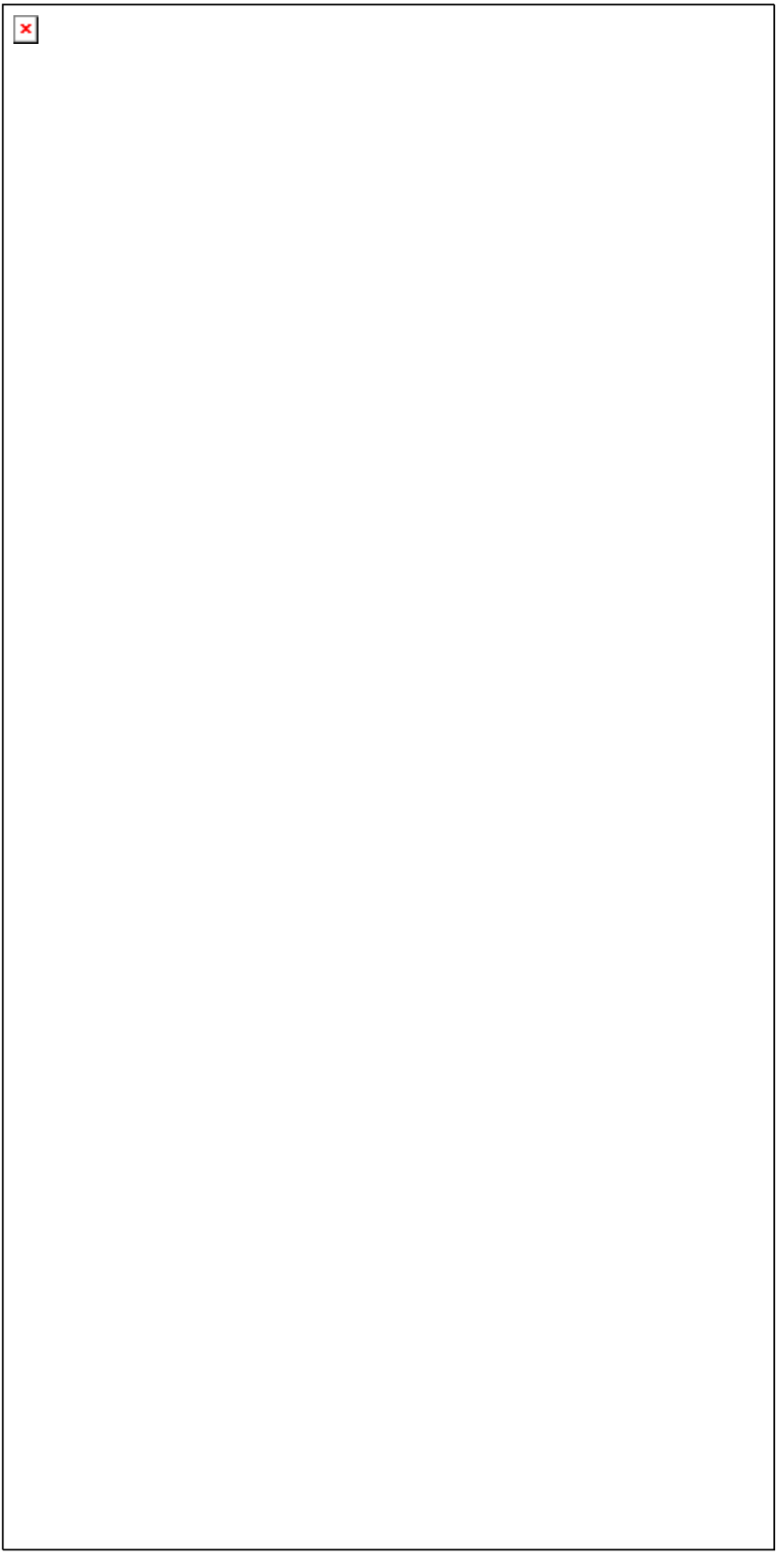
(۱)۔ مسند ابن حنبل ج ۵ ص ۱۷۶ (۲)۔ فتح الباری شرح بخاری ج ۲ ص ۴۵۱ و طبقات ابن سعد ترجمہ عمر بن عبدالعزیز ص ۲۵۶

یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیاء کے تجارتی اور تمدنی تنزل کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہاں مال کا اکثر حصہ بیکار زمین میں مدفون رکھا جاتا ہے' لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان وحی ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کر کے یہ نکتہ بتا دیا تھا:

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔ (توبہ:۵)

اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں نہیں صرف کرتے' ان کو سخت دردناک عذاب کی بشارت دو۔

یہ ''دردناک عذاب'' قیامت میں تو جو کچھ ہو گا وہ ہو گا' اس دنیا میں بھی ان کیلئے



تدبیریں ہیں' جو اس کے دل کی دھڑکنیں' اور اس کی امیدوں کا سہارا ہیں' اور نشتر اس کی وہ اصلاحات ہیں جو اس نے اس طبقہ کو ونائت' پستی کم ہمتی' لالچ' دوسروں کی دست نگری اور ان کے سہارے جینے کی ذلت سے بچانے کے لئے جاری کیں' اس لئے اہل حاجت کے لئے دوسروں سے سوال اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہیں کی' لیکن ہر اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے۔

عام طور سے اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب میں ہے کہ جو کچھ ہے لٹا دو' اور غریبوں اور مسکینوں کو دے ڈالو' نہایت اعلیٰ اخلاقی تعلیم' اور رحم و محبت کا نہایت بلند مظہر نظر آتا ہے لیکن غور سے تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے آپ دولتمند کو سب کچھ غریبوں اور مسکینوں کے دے دینے کی ترغیب دے رہے ہیں' اور اس سے دینے والوں کے جذبہ ایثار اور ان کے جود و سخا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہیں' اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقے کو' گداگری کی لعنت' بھیک مانگنے کی پستی اور دوسرے کے سہارے جینے کی ذلت کا خوگر بنا رہے ہیں اور بے محنت کھانے' اور بے تلاش پانے کا سبق پڑھا رہے ہیں اس طرح ان کے لئے گداگری' نجاستیں آ کر جمع ہوں گی' کیا یہ انسانیت کے ساتھ رحم ہے؟ کیا یہ نوع بشر کے ساتھ محبت ہے؟ کیا یہ جنس بنی آدم کے ساتھ ہمدردی ہے؟

پیغمبر اسلام علیہ السلام کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لئے نہیں ہوئی' وہ انسانوں کے ہر طبقہ کے مصلح اور معلم بنا کر بھیجے گئے ہیں' غریب و امیر اور مسکین و دولتمند دونوں آپ کی نگاہ میں یکساں ہیں اس لئے آپ نے کسی ایک ہی طبقہ کی اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا' بلکہ دونوں طبقوں کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر برابر برابر سے ناپا ہے' اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات میں سے دونوں کو مساوی حصہ دیا ہے۔

یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک پل صراط ہے' جس پر نبیوں نے خاتم اور دینوں کے مکمل علیہ السلام کے سوا دنیا کے کسی اخلاقی معلم' اور روحانی مصلح کے قدم نہ جم سکے' اور نہ وہ اپنے ہاتھ میں ترازو کے دونوں پلوں کو برابر رکھ سکا' اگر غریبوں کی اصلاح کی خاطر صدقہ و خیرات اور دوسری کی اعانت و ہمدردی کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں تو انسانی جوہر شرافت کی بربادی کے ساتھ امراء کا طبقہ اپنے اخلاقی معائب کی فراوانی اور کثرت سے ہلاک اور اخلاقی محاسن سے تمام تر تہی مایہ ہو جائے گا' اور اگر غرباء اور فقراء کی ہر قسم کی گداگری اور دریوزہ گری کی اجازت دے دی جائے تو انسانوں کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی' اسی لئے داعی اسلام علیہ السلام نے' انسانوں کے دونوں طبقوں کے سامنے خدا کی بتائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی جس سے دونوں طبقوں کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا اور دونوں کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر کو پیش اور اپنے اپنے نقائص اور کمزوریوں کو دور کرنے کی صورت ہاتھ آئی' ایک طرف تو اسلام نے امراء اور دولتمندوں کے طبقہ کو خطاب کر کے کہا:

اما السائل فلا تنهر۔ (ضحی: ۱)

مانگنے والے کو جھڑکی نہ دے۔

دوسری طرف خوددار و بے نیاز فقراء اور غریبوں کے طبقہ کی مدح فرمائی:

یحسبهم الجاهل اغنیاء من التعفف تعرفهم بسیماهم لا یسئلون الناس الحافا۔ (بقرہ:۳۷)

ناواقف ان کی خودداری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولتمند سمجھتے ہیں' تو ان کو ان کی نشانی سے پہچانتا ہے' وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔

اور بھیک مانگنے کو خلاف تقوی قرار دیا' جو لوگ بھیک مانگ مانگ کر حج کرتے تھے

ان کو خطاب کر کے کہا:

وتزودوا فان خیر الزاد التقوی۔ (بقرہ:۲۵)

اور زاد راہ لے کر چلو کہ بہترین زاد راہ تقوی (بھیک نہ مانگنا) ہے۔

ایک طرف دولتمندوں کو فرمایا کہ تمہارا حسن اخلاق یہ ہے کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو خالی مت لوٹاؤ۔ شق تمرہ۔ ''اگرچہ چھوہارے کی ایک پھانک ہی کیوں نہ ہو۔'' دوسری طرف فقیروں کو فرمایا کہ تمہاری خودداری یہی ہونی چاہئے کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ الید العلیا خیر من الید السفلی۔(۱)۔ ''اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔'' (یعنی لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے) یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانوں کے دونوں طبقوں کو اپنے فیض سے معمور کیا اور دونوں کے لئے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع بہم پہنچایا۔

صدقہ وخیرات درحقیقت وہ پانی ہے جو دینے والوں کے قلوب ونفوس کے تمام میل اور گندہ پن کو چھانٹ کر ان کو پاک وصاف بنا دیتا ہے لیکن وہ خود جب اس میل اور گندہ پن کو لے کر باہر نکلتا ہے تو حرص وطمع کے پیاسے اس کو چلو میں لے کر پینے لگتے ہیں اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ان ھذہ الصدقات انما ھی اوساخ الناس (۲)۔):(

یہ صدقہ تو لوگوں کا میل ہے۔

اگر آج ان فقیروں اور گداگروں کی صورتوں اور سیرتوں پر نظر ڈالو جو استحقاق شرعی کے بغیر اس مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو نظر آجائے گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو لوگوں کے دلوں کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکار کیا ہے۔

حرص، طمع، لالچ، فریب، بے حیائی، بے غیرتی اور وہ تمام باتیں جو ان کے لازمی اخلاقی نتائج ہیں ان میں سے کونسی چیز ہے جو غیر مستحق ابناء السبیل فقراء اور مہذب

گداگروں کا تمغائے امتیاز نہیں' اور درحقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوٰۃ دینے والوں کے دامن سے چھٹ کر فقراء اور گداگروں کے دامن دل کو نجس بنا دیتا ہے تاہم اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بعض دفعہ قدرہ ایسی مجبوریاں پیش آجاتی ہیں جب نفیس الطبع انسان کو اپنی جان بچانے کے لئے گندہ سے گندہ اور میلے سے میلا پانی کے پی لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے' اور اس وقت اس اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو شخصی طور سے صدقہ وخیرات کے قبول کرنے کی اجازت دی جائے' شریعت محمدیہ نے اسی اصول پر اسی حیثیت سے لوگوں کو اس کے قبول کرنے کی اجازت دی ہے اور اس مجبورانہ قبول سے اس گروہ کے اخلاق و عادات پر جو برے اثرات طاری ہوسکتے ہیں ان کے انسداد اور دفعیہ یا ان کو کم سے کم مضر بنانے کے لئے مفید تدابیر اختیار کی ہیں' اور چند نہایت مناسب احکام جاری کئے ہیں' جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کو خالصتاً لوجہ اللہ ادا کیا جائے' یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان کا بار رکھا جائے نہ اس کو ممنون کرم بنایا جائے' نہ عام مجمع میں اس کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے دیا جائے' کیونکہ اس سے ایک طرف اگر دینے والے کی اخلاقی پستی اور دناءت ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف خود اس طرح کے لینے والے کی خودداری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے اور بجائے اس کے لینے والا اس طرح دینے والے کا ممنون ہو' اس کو اس فعل سے پہلے سے تو نفرت ہوگی پھر رفتہ رفتہ شاید اس کی یہ اخلاقی حس غیرت اور شرمندگی کا شریفانہ جوہر ہمیشہ کے لئے فنا ہوجائے یا ان میں بڑے ظرف کے شریف النفس لوگ ہوں' وہ اپنی نظر میں اپنی ذلت آپ محسوس کرکے اپنی جان پر کھیل نہ جائیں۔

(۱)۔ بخاری کتاب الزکوہ باب اتقوالنار ولوبشق تمرہ۔ (۲)۔ ایضاً باب الاستعفاف عن المسئلہ۔ (۳)۔ مسلم کتاب الزکوہ باب ترک استعمال آل النبی علی الصدقتہ۔

اسلام نے انہیں باتوں کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی' کہ دینے والوں کے سامنے یہ نظریہ ہو کہ :

انما نطعمکم لوجه الله۔ لا نرید منکم جزآء ولا شکورا۔ (دہر: ۱)

ہم تم کو خدا کے لئے کھلاتے ہیں' ہم تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔

اس شریفانہ تعلیم کو دیکھو کہ بدلہ تو کجا ہم کو تمہاری احسان مندی اور شکرگزاری بھی نہیں چاہئے پھر صدقہ دینے والوں کو بھی بہ تصریح بتا دیا کہ تمہارے احسان دھرنے' طعنہ دینے یا لینے والے کو ذلیل و رسوا کرنے سے تمہارے اس عظیم الشان کارنامہ کی حقیقت باطل ہو جائے گی' اور تمام ثواب حرف غلط کی طرح تمہارے نامۂ اعمال سے مٹ جائے گا فرمایا:

الذین ینفقون اموالهم فی سبیل الله ثم لا یتبعون ما انفقوا منا ولا اذی لهم اجرهم عند ربهم ولا خوف علیهم ولا هم یحزنون۔ قول معروف و مغفرة خیر من صدقة یتبعها اذیة والله غنی حلیم. (بقرہ: ۲۶۲)

جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں' اور اس کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں' نہ طعنہ دیتے ہیں' ان کا اجر ان کے خدا کے پاس امانت ہے اور نہ ان قیامت میں کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے' کچھ نرمی کی بات کہہ کر اور چشم پوشی کر کے سائل کو ٹال دینا اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے بعد طعنہ دیا جائے یا احسان جتایا جائے' خدا تمہاری ایسی خیرات

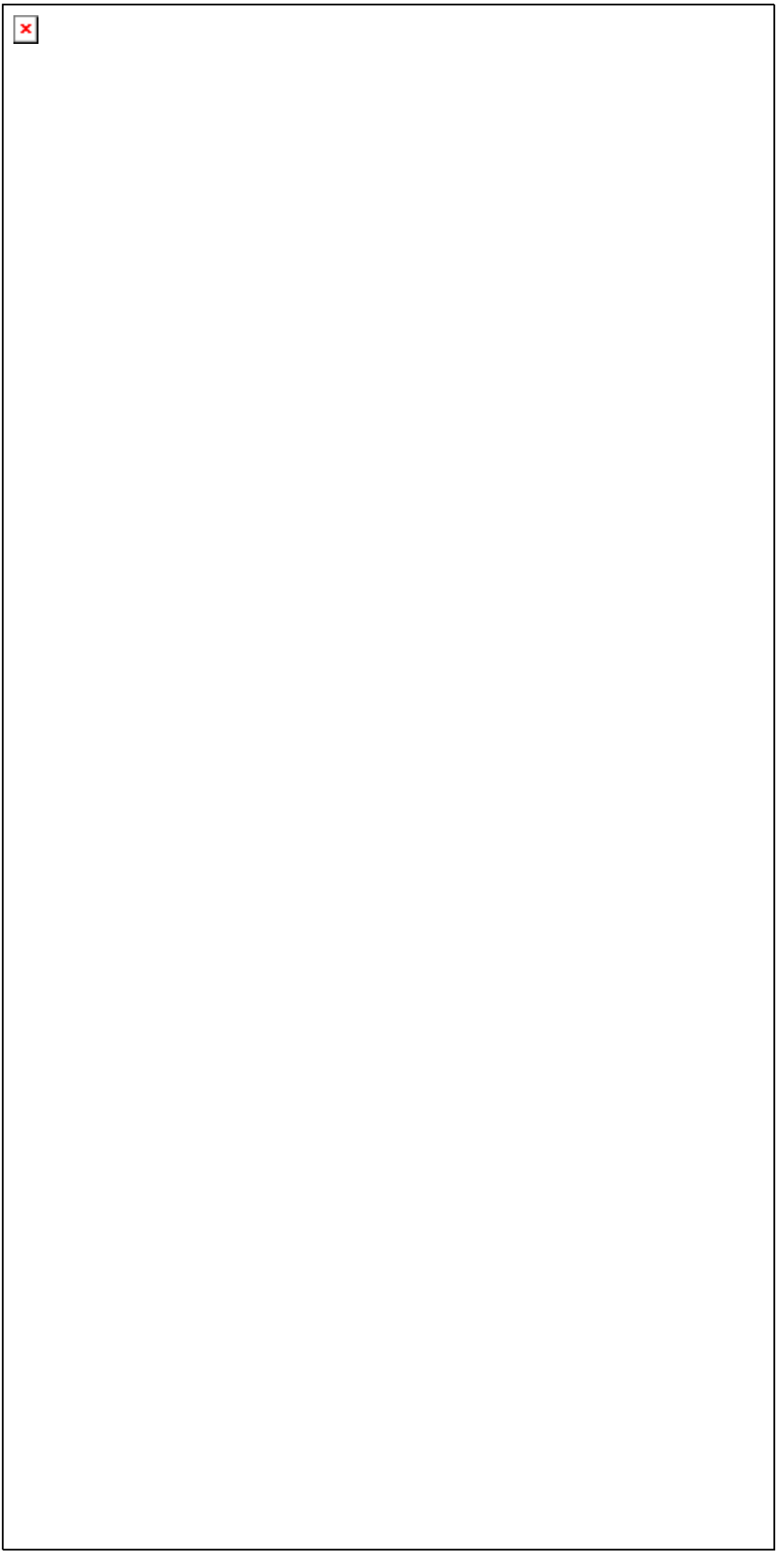
سے بے نیاز ہے اور تمہارے ایسے کاموں پر بردباری سے
درگزر کرنے والا ہے۔

اس حقیقت کو قرآن پاک نے ایک دل نشین تشبیہ سے واضح کیا ہے:

یایھا الذین امنوا لا تبطلوا صدقتکم بالمن و الاذی
کالذی ینفق مالہ رئاء الناس ولا یومن باللہ و الیوم
الاخر فمثلہ کمثل صفوان علیہ تراب فاصابہ وابل
ترکہ صلدا لا یقدرون علی شیء مما کسبوا
واللہ لا یھدی القوم الکافرین۔ (بقرہ:۲۶۴)

مسلمانوں اپنے صدقوں کو احسان جتا کر اور طعنہ دے کر برباد
نہ کرو، جیسے کہ وہ اپنے صدقوں کو برباد کرتا ہے جو محض لوگوں
کے دکھلانے کو دیتا ہے اور خدا پر اور قیامت پر ایمان نہیں لاتا،
اس قسم کی خیرات کی مثال اس چٹان کی ہے جس پر کچھ گرد
پڑی ہوئی ہو، اور اس پر ایک پانی پڑ گیا ہو، جس نے اس کو
صاف اور چٹیل کر دیا کہ اب اس پر کوئی چیز جم نہیں سکتی ہے،
ان لوگوں نے جو کام کیا اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکے خدا
کافروں کو ہدایت یاب نہیں کرتا۔

منجملہ اور اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے خود کسی کو نہ دیں، بلکہ وہ اس کو امیر جماعت کے بیت المال میں جمع کریں اور وہ امیر حسب ضرورت مستحقین کو بانٹ دے تا کہ اس طرح غریب لینے والے مگر شریف مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے شخص کا ممنون احسان بن کر اپنی ذلت نہ محسوس کرے اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منت رکھنے کا موقع نہ ملے، اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے،



ترغیب وتشویق ہوتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادائے زکوٰۃ کی تہمت سے بری خیال کئے جاتے ہیں' لیکن ہمارے نزدیک آیت کریمہ کا مفہوم صاف ہے' زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو وہی ہے جو عہد نبوی ﷺ میں تھا یعنی یہ کہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاملوں کے سپرد کی جائے۔ اس لئے اخفاء کا جو فائدہ فقراء کے حق میں ہے وہ اس طرح خود بخود حاصل ہو جاتا ہے' لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہ راست فقیروں کو دو تو چھپا کر دینا بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت سلامت رہے' اسی لئے جس آیت میں اعلان کی اجازت ہے اس میں فقراء کو براہ راست دینے کا حکم نہیں اور جہاں اخفاء کے ساتھ دینے کا ذکر ہے' وہاں فقراء کو دینے کی تصریح ہے' اس لئے اعلان اور اخفاء کا اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہیں ہے' بلکہ ادا کرنے کے طریقہ میں ہے' کہ اگر بیت المال و نائبین بیت المال کے ذریعہ ادا کرو تو ظاہر کر کے دو کہ دینے والے اور وصول کرنے والے دونوں کا حساب پاک رہے' اور تہمت اور بدگمانی کا موقع نہ ملے' لیکن اگر کسی سبب سے تم کو براہ راست مستحقین کو دینا پڑے جس میں حساب کتاب کی ضرورت نہیں' اور براہ راست تم ہی کو ان کو دینا ہے' بیت المال کا پردہ بیچ میں نہیں ہے اس لئے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چھپا کر دو' تا کہ دینے والا نمائش سے اور لینے والا ذلت و خواری سے محفوظ رہے' پھر ترغیب' اعلان اور اظہار کی ضرورت اس وقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس

(۱)۔ صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فضل اخفاء الصدقہ۔

اس قدر کمزور ہو جائے کہ حقوق اسلام ادا کرنے میں اس قسم کی فقیہانہ ٹھوکروں کی ضرورت ہو' ورنہ صحابہ کرامؓ کی ترغیب کیلئے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا' مگر آج تو یہ حالت ہے کہ معمولی سے معمولی رقم کیلئے جب تک اخباروں کے پورے

کالم سیاہ نہ کر دیئے جائیں' دینے والوں کے نزدیک خدا کو ان کے عطیہ کی خبر ہی نہیں ہوتی۔

۳۔تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دارومدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیال پر ہے' بلند ہمتی کا اقتضاء یہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچ کر نہ ٹھہرے اور اس کو اس دنیا کی تمام چیزیں ہیچ نظر آئیں' اس بناء پر اسلام نے یہ اصول قرار دیا کہ زکوٰۃ وصدقہ میں مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے تا کہ متبذل اور ادنیٰ درجہ کی چیزوں کے دینے اور لینے سے دینے والے کے اندر پستی اور دنائت نہ پیدا ہو' کیونکہ اس سے لینے والے کے اندر حد درجہ کا لالچ اور چھچھورپن پیدا ہو گا کہ معمولی اور سڑی گلی چیز تک اس کے لالچ سے نہیں بچ سکتی اور دوسری طرف دینے والے کی روح میں بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علو کے بجائے نجالت' حرص' اور کمینہ پن اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہو گی کیونکہ بری چیز کسی کو دے دینے کا منشاء دوسرے کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہیں ہوتا' بلکہ اس بیکار اور سڑی گلی چیز سے اپنے دامن اور صحن خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے اس لئے اس سے دینے والے کے دل میں صفائی کے بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے' روایتوں میں ہے کہ اصحاب صفہ کو جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا' کسب معاش کا موقع نہیں ملتا تھا' اس لئے لوگ کھجوروں کے بدمزہ خوشے مسجدوں میں لٹکا دیتے تھے' اور جب وہ گروہ بھوک کی شدت سے بیتاب ہو جاتا تھا' تو مجبوراً ان میں سے دو چار کھجوریں توڑ کر کھا لیتا تھا' چونکہ یہ نہایت ذلیل حرکت تھی' اس بناء پر یہ آیت نازل ہوئی:

یایھا الذین امنوآ انفقوا من طیبت ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض ولا تیمموا الخبیث منه تنفقون وکستم بلخذیه الا ان تغمضوا فیه

واعلموآ ان الله غنی حمید. (بقرہ:۲۶۷)

مسلمانو! اپنی کمائی سے اور اس چیز سے جو تمہارے لئے ہم نے زمین سے نکالی ہے، بہتر حصہ خیرات کرو، اور ان میں سے ردی مال کی خیرات کا قصد نہ کرو، حالانکہ اگر وہی تم کو دیا جائے تو خود تم نہ لوگے لیکن یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور یقین کرو کہ خدا تمہاری اس قسم کی خیرات سے بے نیاز ہے اور وہ خوبیوں والا ہے (خوبیوں والی ہی چیز پسند کرتا ہے۔)

۴۔فقراء اور مساکین کی دنائت اور حرص وطمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں لوگوں کو زکوۃ اور صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا جائے جو باوجود تنگدستی اور بے بضاعتی کے خودداری اور قناعت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے کیونکہ جب قوم کی توجہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگئی، تو ہر شخص خود بخود ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا، صحابہ کرام میں سب سے زیادہ مفلس اور نادار اصحاب صفہ تھے، لیکن ان کی خودداری اور قناعت کا یہ حال تھا کہ پریشانی صورت کے علاوہ کوئی چیز ان کے فقر وفاقہ کا راز فاش نہیں کرسکتی تھی اس بناء پر اسلام نے ان کو زکوۃ کا بہترین مستحق قرار دیا۔

للفقراء الذین احصروا فی سبیل الله لا یستطیعون ضربا فی الارض یحسبهم الجاهل اغنیاء من التعفف تعرفهم بسیماهم لا یسئلون الناس الحافا۔ (بقرہ:۲۷۳)

صدقہ ان فقراء کیلئے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں (بغرض معاش وتجارت) سفر کی قدرت نہیں رکھتے، جو لوگ ان سے ناواقف ہیں خودداری اور عدم سوال کی وجہ سے

ان کو مالدار سمجھتے ہیں' تم صرف ان کے بشرہ سے ان کو پہچانتے ہو' وہ لوگوں سے گڑگڑا کر کچھ نہیں مانگتے۔

آج مسلمانوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا ہے' جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑوں شریف آدمی در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں اور قوم اور خاندان کا نام بیچتے ہیں۔

۵۔لیکن با ایں ہمہ جزم و احتیاط گداگری درحقیقت ایک نہایت متبذل شیوہ ہے اس بناء پر اسلام نے سخت مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دی' اور جہاں تک ممکن ہوا لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے' چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعضوں سے اس کی بیعت بھی لی کہ وہ کسی سے کچھ نہ مانگیں گے انہوں نے اس بیعت کی اس شدت سے پابندی کی کہ راستہ میں اگر ان میں سے کسی کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی وہ کسی سے نہیں کہتے تھے کہ اٹھا دو۔(۱)۔ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگے گا نہیں تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں' آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام ثوبان بولے میں یہ ضمانت کرتا ہوں' چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔(۲)۔

حکیمؓ بن حزام ایک صحابی تھے' انہوں نے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سے سوال کیا' آپؐ نے عنایت کیا' پھر مانگا' پھر دیا' پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی تو فرمایا اے حکیم! یہ مال بظاہر نہایت شیریں اور خوش رنگ چیز ہے جو اس کو شرافت کے ساتھ لے گا' اس کو اس میں برکت دی جائے گی' اور جو لالچ کے ساتھ لے گا' اس کو برکت نہ ملے گی اور اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی کھاتا چلا جائے اور اس کا پیٹ نہ بھرے اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔حکیم نے کہا یا رسول اللہ! آج سے میں پھر کسی سے کچھ نہ مانگوں گا' اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں خلفاء ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لئے بلاتے تھے' اور وہ انکار کرتے رہے' اور آخر تک اس انکار(۳)۔پر قائم رہے۔

اس کی متعدد اور مثالیں ہیں' اس عمومی ممانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگوں کے لئے جو صاحب دست و بازو ہوں' یعنی جن کے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں صحیح وسالم ہوں بھیک مانگنے سے سخت ممانعت کر دی گئی' فرمایا کہ:

لا تحل المسالہت لرجل قوی۔ ولا لذی مرہت سوی۔ (ترمذی)

طاقت اور سکت والے اور صحیح وسالم آدمی کے لئے بھیک مانگنا حلال نہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لان یاخذ احدکم حبلہ فیحتطب علی ظہرہ خیرلہ' من ان یاتی رجلا فیسالہ اعطاہ او منعہ۔ (کتاب الزکاہ باب الاستعفاف عن المسئلتہ)

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم میں سے کسی کا رسی لے کر اپنی پیٹھ پر لکڑی کا بوجھ اٹھانا اس سے بہتر ہے کہ وہ دوسرے سے بھیک مانگے' وہ اسے دے یا نہ دے۔

(۱)۔ ابوداؤد کتاب الزکوہ باب کراھیتہ المسئلہ۔ (۲)۔ ایضاً۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الزکوہ باب الاستعفاف عن المسئلہ۔

آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ میں اس پر عمل بھی فرمایا' ایک دست نگر صحابی نے خیرات مانگی' آپ ؐ نے فرمایا تمہارے پاس کچھ ہے' عرض کی ایک ٹاٹ ہے اور ایک پیالہ ہے آپ ؐ نے ان کو منگوا کر نیلام کیا اور ان کی قیمت سے ایک کلہاڑی خرید دی اور فرمایا کہ جنگل سے لکڑی کاٹ لاؤ اور بیچو' انہوں نے اس پر عمل کیا' تو خدا نے ان کو یہ برکت دی کہ وہ گداگری کی ذلت سے ہمیشہ کیلئے (۱)۔ بچ گیا۔

۶۔لیکن جولوگ بدقسمتی سے کسب معاش نہیں کر سکتے، ان کو بھی الحاح، کثرت سوال، لجاجت اور گڑگڑا کر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی، آپ ﷺ نے فرمایا:

لیس المسکین الذی ترده الاکلتہت والاکلتان ولکن المسکین الذی لیس له غنی ویستحی ولا یسال الناس الحافا۔ (بخاری کتاب الزکوٰہ باب قول الله عزو جل یسئالون الناس الحافا)

مسکین وہ نہیں ہے جس کو لقمہ دو لقمے دروازوں سے واپس لوٹا دیتے ہیں، مسکین وہ ہے جو گو بے نیاز نہیں ہے لیکن حیا کرتا ہے اور لوگوں سے گڑگڑا کر نہیں مانگتا۔

پھر یہ بھی بتا دیا کہ گداگری اور بھیک کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت کے علاوہ ہو، وہ ہر حال میں انسان کی شرم وحیاء اور غیرت وآبرو کو برباد کر دیتا ہے، فرمایا:

مازال الرجل یسال الناس حتی یاتی یوم القیامہت لیس فی وجہ مضغہت لحم۔ (بخاری کتاب الزکوٰہ من سال الناس تکثرا)

آدمی ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے، یہاں تک کہ وہ قیامت کے روز اس طرح آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا۔

یہ اس کی سزاء ہوگی کہ اس نے دنیا میں مانگ مانگ کر اپنے چہرہ سے عزت وآبرو کی رونق خود دھودی تھی۔

ان ضروری اصلاحات کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا اور ان تمام برائیوں اور بداخلاقیوں کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوری سے انسانوں میں پیدا ہو

سکتی تھیں اور ساتھ ہی انسانی برادری کے دونوں طبقوں کو ترازو کے پلڑے میں برابر رکھ کر ان کو باہمی معاونت' باہمی مشارکت' باہمی ہمدردی اور امداد کا سبق سکھایا اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک کر دیا' پست و بلند کے تفرقے ممکن حد تک کم کر دیئے اور اس اقتصادی بربادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا جو طریقہ بتا دیا جو اکثر اپنی بھیانک شکلوں سے اس کو ڈرایا کرتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولتمند صحابہ میں یہ فیاضی آ گئی کہ وہ دین و ملت کی خدمت کے لئے اپنی ساری دولت لٹا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے اور غریب صحابیوں میں یہ قناعت اور خودداری پیدا ہوگئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے' دولت مند اپنی زکوٰۃ آپ لے کر بیت المال کے دروازوں تک خود آتے تھے اور غریب اپنے افلاس و حاجت کو خدا کے سوا دوسروں کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے اور تیسری طرف آنحضرت ﷺ کے بعد جب فراغت آئی تو جماعت کے بیت المال میں اتنا سرمایہ رہتا تھا کہ زکوٰۃ کے کسی مصرحہ مصرف کے لئے کمی محسوس نہیں ہوتی تھی' ضرورت مندوں کو اس رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا۔(۲)۔ اس طرح یہ ایک ایسا مالی و اقتصادی نظام تھا کہ بلا نفع قرض دینے میں افراد کو جو تامل ہوتا ہے۔ وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا اور سود کی لعنت کے بغیر دادوستد کا راستہ کھلا ہوا تھا۔

---

(۱)۔ ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ۔ (۲)۔ تفسیر کبیر جلد ٤ صفحہ ٦٨١۔

فہرست

روزہ

روزہ کا مفہوم::

روزہ کی ابتدائی تاریخ::

روزہ کی مذہبی تاریخ::

روزہ کی حقیقت::

رمضان کی حقیقت::

فرضیت صیام کا مناسب موقع ۲ھ::

ایام روزہ کی تحدید::

ایک نکتہ::

معذورین::

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب::

روزہ میں اصلاحات::

روزہ کے مقاصد::

حامل قرآن کی پیروی::

شکریہ::

تقوی::

حج

بیت اللہ::

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی اور اس کی شرائط::

ملت ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے::

اسلام قربانی ہے::

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

یہ قربانی کہاں ہوئی::

مکہ اور کعبہ::

حج ابراہیمی یادگار ہے::

حج کی حقیقت::

حج کی اصلاحات::

حج کے ارکان::

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا::

وقوف عرفہ::

قیام مزدلفہ::

منٰی کا قیام::

قربانی::

حق راس::

رمی جمار::

ان رسومات کی غایت::

حج کے آداب::

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں::

مرکزیت::

رزق ثمرات::

قربانی کی اقتصادی حیثیت::

ابراہیمی دعا کی مقبولیت::

تجارت::

روحانیت::

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

تاریخیت::

خالص روحانیت:::

جہاد

جہاد کی قسمیں::

دائمی جہاد::

عبادات قلبی

تقوی

تقوی سارے اسلامی احکام کی غایت ہے::

اہل تقوی تمام اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں::

کامیابی اہل تقوی کیلئے ہے::

اہل تقوی اللہ کے محبوب ہیں::

معیت الٰہی سے سرفراز ہیں::

قبولیت اہل تقوی ہی کو حاصل ہے::

تقوی والے کون ہیں::

تقوی کی حقیقت کیا ہے::

اسلام میں برتری کا معیار::

اخلاص

توکل

صبر

صبر کے لغوی معنی::

وقت مناسب کا انتظار کرنا::

بے قرار نہ ہونا::

مشکلات کو خاطر میں نہ لانا::

درگزر کرنا::

ثابت قدمی::

ضبط نفس::

ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا::

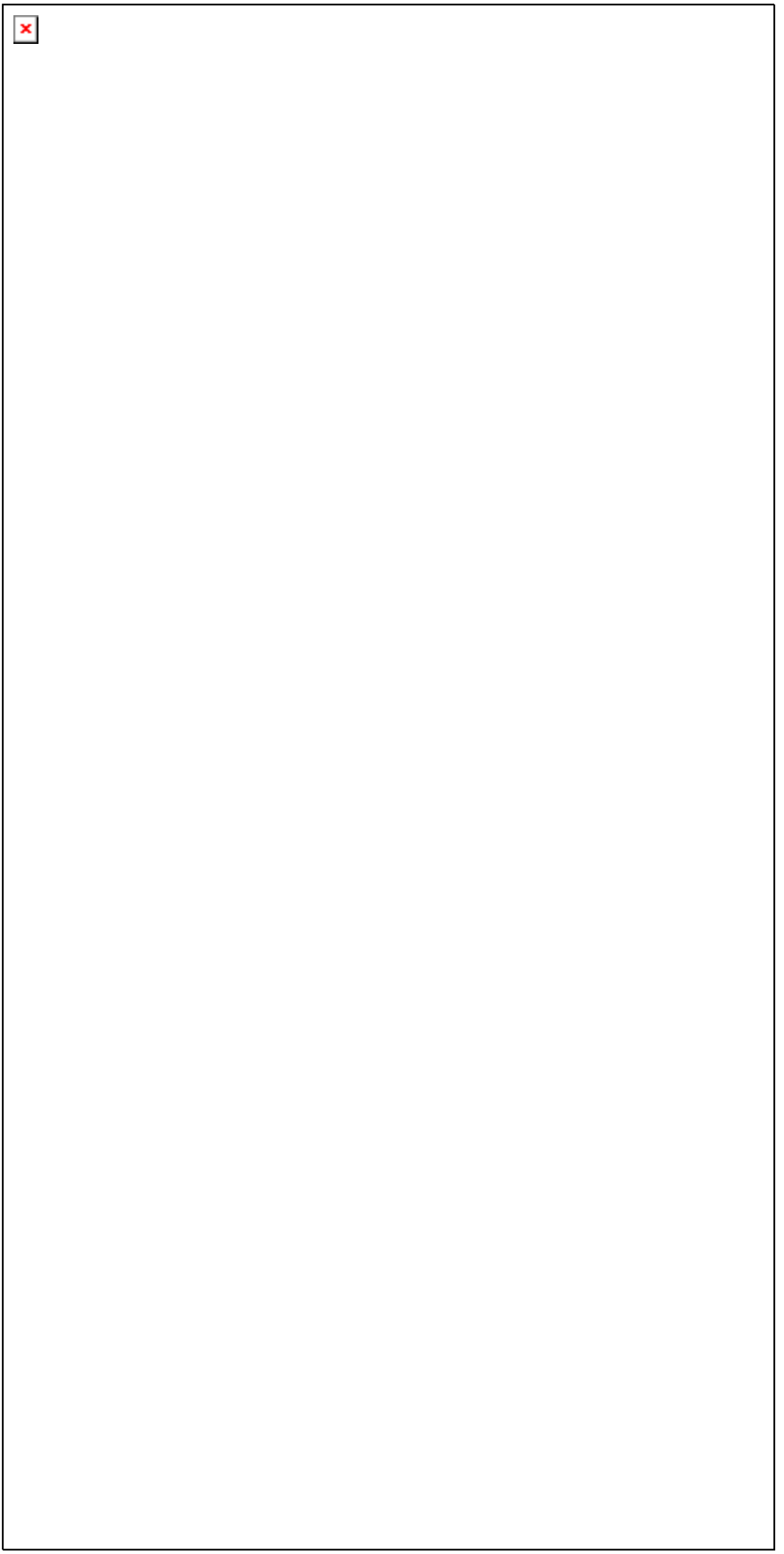
صبر کے فضائل اور انعامات::

فتح مشکلات کی کنجی صبر اور دعا::

شکر

خاتمہ

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006



بہر حال مشرکانہ مذہب میں روزہ کی ابتداء اور حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہوں لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتداء اور غایت کی تشریح میں اپنے پیروؤں کی وکالت کا محتاج نہیں اور پبا واز بلند مدعی ہے۔

یایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔۔۔ شھر رمضان الذی انزل فیہ القران۔ ھدی للناس و بینت من الھدی والفرقان فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ ومن کان مریضا او علی سفر فعدہت من ایام اخر۔ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ولتکملوا العدہت ولتکبروا اللہ علی ما ھدکم ولعلکم تشکرون۔ (بقرہ:۲۳)

مسلمانو! روزہ تم پر اس طرح فرض ہوا جس طرح تم سے پہلی قوموں پر فرض ہوا تا کہ تم پرہیز گار بنو۔۔۔ ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو انسانوں کیلئے سرتاپا ہدایت' ہدایت کی دلیلیں اور حق و باطل میں فارق بن کے آیا تو جو اس رمضان کو پائے وہ اس مہینہ بھر کے روزے رکھے اور جو بیمار ہو' یا سفر پر ہو' وہ دوسرے دنوں میں رکھ لے' خدا آسانی چاہتا ہے' سختی نہیں' تا کہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو' اور (یہ روزہ اس لئے فرض ہوا) تا کہ تم خدا کے اس ہدایت دینے پر اس کی بڑائی کرو' اور تا کہ تم شکر بجاؤ لاؤ۔

(۱)۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۴ طبع گیارہ۔

ان آیات پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام بلکہ روزہ کی تاریخ' روزہ کی

حقیقت، رمضان کی ماہیت، اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہیں، ذیل کے صفحات میں بہ ترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں۔

روزہ کی مذہبی تاریخ::

قرآن پاک نے ان آیتوں میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعہ احکام کا ایک جزو رہا ہے، جاہل عرب کا پیغمبر ﷺ امی جو بقول مخالفین عالم کی تاریخ سے ناواقف تھا۔ وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ فرض عبادت رہا ہے، اگر یہ دعویٰ تمام تر صحت پر مبنی ہے، تو اس کے علم کے مافوق ذرائع میں کیا رشک رہ جاتا ہے؟ اس دعویٰ کی تصدیق میں یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار روزہ (فاسٹنگ) لکھتا ہے:

''روزہ کے اصول اور طریقے گو آب وہوا، قومیت تہذیب اور گردوپیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہیں، لیکن بہ مشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں جس کے مذہبی نظام میں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو۔''

آگے چل کر لکھتا ہے:

''گو کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے۔''

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے لیکن برت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہیں، ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ کو برہمنوں پر اکادشی کا روزہ ہے، اس حساب سے سال میں چوبیس روزے ہوئے، بعض برہمن کاتک کے مہینہ میں ہر دوشنبہ کو روزہ رکھتے ہیں، ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہیں، یعنی چالیس دن تک اکل وشرب سے احتراز کرتے ہیں، ہندوستان کے تمام مذاہب میں جینی دھرم میں روزہ کے سخت شرائط ہیں، چالیس چالیس دن تک کا ان کے یہاں ایک روزہ ہوتا ہے۔ گجرات و

دکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا روزہ رکھتے ہیں۔ قدیم مصریوں کے ہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول نظر آتا ہے' یونان میں صرف عورتیں تھموفیریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی ہیں' پارسی مذہب میں گو عام پیرووں پر روزہ فرض نہیں لیکن ان کی الہامی کتاب کی آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم انکے ہاں موجود تھا' خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لئے پنجسالہ روزہ ضروری تھا۔ (۱)۔

(۱)۔ ان تمام حوالوں کے لئے دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۱۰ صفحہ ۱۹۳ طبع یازدھم۔

یہودیوں میں بھی روزہ فریضہ الٰہی ہے حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گزارے (خروج ۳۴' ۳۸) چنانچہ عام طور سے یہود حضرت موسیٰؑ کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے ہیں' لیکن چالیس دن کا روزہ ان پر فرض ہے' جو ان کے ساتویں مہینہ (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے اور اسی لئے اس کو عاشورہ (دسواں) کہتے ہیں' یہی عاشورہ کا دن' وہ دن تھا جس میں حضرت موسیٰؑ کو تورات کے دس احکام عنایت ہوئے تھے اسی لئے تورات میں اسی دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے۔ (۱)۔ اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور دوسرے روزوں کے احکام بھی بتصریح مذکور ہیں۔ (۲)۔

عیسائی مذہب میں آکر بھی ہم کو روزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے' چنانچہ عیسیٰؑ نے بھی چالیس دن تک روزہ جنگل (۳)۔ میں رکھا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام جو حضرت عیسیٰؑ کے گویا پیشرو تھے' وہ بھی روزے رکھتے تھے اور ان کی امت بھی روزہ (۴)۔ دار تھی' یہود نے مختلف زمانوں میں مختلف واقعات کی یادگار میں بہت سے روزے بڑھا لئے تھے اور زیادہ تر غم کے روزے تھے اور اس غم کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ اداس اور غمگین بنا لیتے تھے۔ (۵)۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانوں میں غم کے ان مصنوعی روزوں کو منع کر دیا' غالباً اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیوں نے آکر حضرت عیسیٰؑ پر اعتراض کیا کہ تیرے شاگرد

کیوں روزہ نہیں رکھتے' حضرت عیسٰیؑ نے اس کے جواب میں فرمایا:

''کیا براتی جب تک دولہا ان کے ساتھ ہے۔ روزہ رکھ سکتے ہیں جب تک دولہا ان کے پاس ہے روزہ نہیں رکھ سکتے' پر وہ دن آئیں گے جب دولہا ان سے جدا کیا جائے گا' تب انہیں دنوں میں روزہ رکھیں گے۔'' (مرقس ۲۔۱۸)

اس تلمیح میں دولہا سے مقصود خود حضرت عیسٰیؑ کی ذات مبارک اور براتی سے مقصود ان کے پیرو اور حواری ہیں' ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبر اپنی امت میں موجود ہے' امت کو غم منانے کی ضرورت نہیں' انہیں فقروں سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسٰیؑ نے موسوی شریعت کے فرض و مستحب روزوں کو نہیں' بلکہ غم کے مبتدعانہ روزوں کو منع فرمایا' انہوں نے خود اپنے پیروؤں کو بے ریا اور مخلصانہ روزے رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے' چنانچہ آپؑ اپنے حواریوں کو فرماتے ہیں:

''پھر جب تم روزہ رکھو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ' کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں' کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں' میں تمہیں سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے' پر جب تم روزہ رکھو' اپنے سر میں تیل لگاؤ' اور منہ دھوؤ' تا کہ تم آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے' روزہ دار ظاہر ہو' اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھ کو آشکارا بدلہ دے۔'' (متی ۶۔۶۔۷)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسٰیؑ سے ان کے شاگرد پوچھتے ہیں کہ ہم پلید روحوں کو کس طرح نکال سکتے ہیں' وہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

''یہ جنس سوائے دعا' اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہیں نکل سکتی۔'' (متی ۱۷۔۲۱)

اہل عرب بھی اسلام سے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے' مکہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشورہ (یعنی دسویں محرم کو) اس لئے روزہ رکھتے تھے کہ اس دن خانہ کعبہ (٦)۔ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا' مدینہ میں یہود اپنا عاشورہ الگ (٧)۔ مناتے تھے' یعنی وہی اپنے ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔

(١)۔ تورات' سفر الاحبار ١٦' ٢٩۔ ٣٤ (٢٣۔٢٧) (٢)۔ اول سموایل ٧۔٢ ویرمیا ٣٦۔٦ (٣)۔ متی ٤۔٢ (٤)۔ مرقس ٢۔١٨۔ (٥)۔ قضاہ ٢٠۔٢٦ سموال اول ٧۔٦ (٣١۔١٣ لوقا ٦ وغیرہ۔) (٦)۔ مسند ابن حنبل جلد ٦ صفحہ ٢٤٤ (٧)۔ بخاری کتاب الصوم جلد اول ص ٥٦٢

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت:

کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم۔ (بقرہ:٢٣)

مسلمانو! تم پر روزہ اس طرح لکھا گیا جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا۔

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے۔

روزہ کی حقیقت::

انسان کی ہر قسم کی روحانی بدبختیوں اور ناکامیوں کے علل و اسباب کی اگر تحلیل کی جائے تو آخری نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ دنیا میں مختلف ضرورتوں کا محتاج ہے' وہ مختلف اغراض کا پابند ہے اس کے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہیں' اخلاق جس کا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے اگر تحقیق کی جائے تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرض نفسانی پر مبنی نظر آئے گی' اس لئے ہماری ہر قسم کی بدبختیاں اور آلودگیاں صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہیں' ضرورت اور غرض اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے تو وہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔

قابل غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟ ہمارے دل میں آرزؤں کا ایک ڈھیر ہے' تمناؤں کی ایک بھیڑ ہے اور خود ساختہ ضرورتوں کا ایک انبار ہے' لیکن کیا خوشنما کپڑوں' عالیشان عمارتوں' لذیذ غذاؤں اور تیز رفتار سواریوں کے بغیر ہم جی نہیں سکتے ؟ فرزند و عیال' زر و مال' اور خدم و حشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہوں تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا؟ بادشاہوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی' اور زندہ رہے ہیں' بروایت عام ابراہیم ادھم بادشاہ سے فقیر ہو گئے اور نہایت پر مسرت روحانی زندگی بسر کی۔

خود ساختہ ضرورتوں کی نفی اور تحلیل کے بعد شاید انسان کی حقیقی ضرورتوں کا وسیع دائرہ ایک دو لفظوں میں محدود ہو کر رہ جائے اور وہ ما یہ قوت و غذا یعنی کھانا اور پینا ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا روح اور جان کا جسم میں باقی رہنا صرف سد رمق پر موقوف ہے اور سچ یہ ہے کہ سد رمق صرف کھانے کے چند لقموں اور پانی کے چند گھونٹوں پر موقوف ہے اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتوں کا مولد و منشاء انہیں چند لقموں اور چند گھونٹوں میں افراط و سعت تفنن اور تعیش کا نتیجہ ہے اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ یعنی عالم ناسوت اور عالم ملکوت کے دو باشندوں میں اگر فرق و امتیاز کی دیوار قائم کی جائے تو صرف یہی ایک چیز تمام فروق امتیازات کو محیط ہو گی انسان کے تمام جرائم اور گناہوں کی فہرست اگر تیار کی جائے اور اس کی حرص و ہوس اور قتل و خونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈے جائیں تو انہیں دو چیزوں کے افراط اور تعیش کی مزید طلب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہو گی۔

اس بنا پر دنیا کے تمام مذاہب میں مادیات کی کثافتوں سے بری اور پاک ہونے کے لئے اکل و شرب سے ایک حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی رکھی گئی ہے' جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتوں کا دائرہ کم کر دے اور آخر یہ

کہ قوت وغذا کی طلب سے بھی بے نیازی کے لئے متواتر کوشش جاری رکھے کہ انسانوں کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی ایک قوت کے نتائج مابعد ہیں' اگر یہ طلب وضرورت فنا ہو جائے تو ہم کو دفعتہً عالم ناسوت میں عالم ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے' لیکن جب تک انسان انسان ہے اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی ناممکن ہے اسی بناپر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کر دی ہے اس مدت کے اندر انسانوں کو ایسے تمام انسانی ضروریات سے جن سے استغناء کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے' مجتنب ہو کر تھوڑی دیر کے لئے ملاء اعلیٰ کی مقدس مخلوقات میں داخل ہو جانا چاہئے' اور چونکہ ان مخلوقات کا فرض زندگی محض خدائے پاک کی اطاعت و عبادت ہے اس لئے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے۔

قرآن مجید نے ان تمام حقائق ورموز کو صرف ایک لفظ ''تقوٰی'' سے بے نقاب کر دیا ہے اور چونکہ روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب میں مشترک تھی اس بناپر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارہ اس حقیقت میں شریک کرلیا ہے۔

کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون (بقرہ:۲۳)

مسلمانو! تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلی امتوں پر لکھا گیا' تا کہ تم تقوٰی حاصل کرو۔

روزہ کی غرض و غایت تقوٰی ہے یعنی اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنا اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچالینا اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لئے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا' لیکن آگے چل کر قرآن پاک اسلامی روزہ کی دو اور حقیقتوں کو بھی واضح کرتا ہے۔

لتکبروا اللہ علی ما ھدلکم ولعلکم تشکرون۔

(بقرہ:۲۳)

تا کہ خدا نے جو تم کو راہ دکھائی اس پر تم اس کی بڑائی کرو اور شکر ادا کرو۔

اس مفہوم کی توضیح کے لئے ہم کو رمضان مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

رمضان کی حقیقت::

یہ مادی عالم جس طرح مادی نظام اور قانون کا پابند ہے' خدائے پاک نے عالم روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظام قانون اور علل و اسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے جس طرح یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ زہر انسان کے لئے قاتل ہے اسی یقین کے ساتھ طب روحانی کا واقف کار کہتا ہے کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے۔ پیغمبر ﷺ فیضان نبوت کے قبول کے لئے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے دنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے انکار و مزاحمت پر وہ کیونکر مہاجرہ الی اللہ کرتا ہے اور پھر کیونکر دعوت کے منکر ناکام و خاسر اور اہل ایمان فلاح یاب و کامیاب ہوتے ہیں ان میں سے ہر ایک چیز مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور میں آتی ہے' قرآن مجید میں تیرہ مقام پر ''سنتہ اللہ'' کا لفظ آیا ہے لیکن اس میں زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے۔

فلسفہ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنا لیتا ہے' عینہ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے سوانح اور تاریخیں بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائص نبوت کے اصول قانون ہمارے لئے مرتب کرتی ہیں۔

پیغمبرانہ تاریخ کے انہیں اصول و قوانین میں سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمال انسانیت کو پہنچ کر فیضان نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ ایک مدت

تک کے لئے عالم انسانی سے الگ ہو کر ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے' اسی وقت سے اس کے دل و دماغ میں وحی الٰہی کا سرچشمہ موجیں مارنے لگتا ہے کوہ سینا کا پرجلال پیغمبر (حضرت موسٰیؑ) جب تورا ہ لینے جاتا ہے تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا (۱)۔ رہتا ہے کوہ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسٰیؑ) اس سے پہلے کہ اس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو' وہ چالیس روز و شب بھوکا اور پیاسا (۲)۔ رہا' اسی طرح فاران کا آتشین شریعت والا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نزول قرآن سے پہلے پورے ایک مہینہ حرا نام مکہ کے ایک غار میں' ہر قسم کی عبادتوں میں مصروف رہتا ہے اور بالآخر اسی اثناء میں ناموس اکبر کا مژدۂ جانفزا لے کر نمودار ہوتا ہے۔ (۳)۔

یہ واقعہ کس ماہ مبارک کا تھا؟

شھر رمضان الذی انزل فیه القران۔ (بقرہ:۱۸۳)

رمضان کا وہ مہینہ جس میں قرآن اترا۔

یہ کس شب اقدس کی داستان ہے؟

انا انزلنه فی لیلهت مبارکهت۔ (دخان: ۱)

ہم نے قرآن کو ایک برکت والی رات میں اتارا۔

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

انا انزلنه فی لیلهت القدر۔ (القدر: ۱)

ہم نے قرآن کو شب قدر میں اتارا۔

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا اور پیغمبر امی علیہ السلام کو عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دستگیری کے لئے دستور نامہ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا' قرآن کا حامل اور اسی وحی الٰہی کا مہبط ان دنوں ایک غار کے کونے میں یکہ و تنہاء بھوکا اور پیاسا (۴)۔ سر بہ زانو تھا اس بنا پر اس ماہ مقدس میں بھوکا اور پیاسا رہنا (روزہ)

کسی عبادت گاہ میں یکہ وتنہا رہنا (اعتکاف) نزول وحی کی رات میں (لیلۃ القدر) بیدار ومستعد رہنا تمام پیروان محمدی کے لئے ضروری تھا کہ :

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (آل عمران: ۴)

اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تمہیں پیار کرے گا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام میں کیا ہے؟ اور رمضان مبارک میں روزوں کی تخصیص اسلام میں کس بنا پر ہے؟ اس لئے اس ماہ اقدس میں بقدر امکان انہیں حالات وجذبات میں متکیف ہونا چاہئے، جس میں وہ حامل قرآن متکیف تھا، تا کہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور رہنمائی کی یادگار تاریخ ہو، یہ جذبات وحالات جن کو قرآن کے مبلغ کی پیروی میں ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہیں، یہی اس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکرگزاری اور خدا کی بڑائی ہے۔

(۱)۔ خروج ۳۴۔۳۸ (۲)۔ متی ۴۔۲۔ (۳)۔ صحیح بخاری بدء الوحی، ایک ماہ کا بیان صحیح مسلم کتاب الایمان باب نزول وحی میں اور سیرۃ ابن ہشام بدبعثت میں ہے۔ (۴)۔ روایات سے اگرچہ تبصریحی یہ نہیں ہے معلوم ہوتا کہ آپ ﷺ غار حرا میں روزے رکھتے تھے، تاہم قرائن و اشارات سے سمجھا جاتا ہے کہ آپ ﷺ اور عبادات کے ساتھ غار حرا میں روزے بھی رکھتے تھے جیسا کہ بخاری (بدء الوحی) اور سیرت ابن ہشام سے واضح ہے کہ آپ انہیں میں تحنث اور اعتکاف کرتے تھے جس کا ایک جزء روزہ ہے، آج کل کے بعض علماء مصنفین نے بھی اس قرائن نے بھی سمجھا ہے کہ آپ ﷺ ان دنوں روزہ رکھتے تھے۔ دیکھو خضری کی التشریح الاسلامی صفحہ ۳ و صفحہ ۴۔

فرضیت صیام کا مناسب موقع ۲ھ::

اگر اسلامی عبادات کا قالب روح سے خالی ہوتا اور ان سے صرف جسم کی ریاضت

مقصود ہوتی تو نماز سے پہلے روزہ فرض کیا جاتا' روزہ عرف عام میں فاقہ کشی کا نام ہے اور عرب کو ملک کی اقتصادی حالت کی وجہ سے اکثر یہ سعادت نصیب ہو جایا کرتی ہے' ظہور اسلام کے بعد کفار نے مسلمانوں کو جن پر یشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا' اس نے ان کو عرب کے معمولی طریقہ کسب معاش کی طرف سے بھی غیر مطمئن کر دیا تھا جن لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی حمایت کی تھی' تمام قبائل نے ان سے تمدنی تعلقات منقطع کر لئے تھے اس حالت میں صرف روزہ ایک ایسا فریضہ تھا' جو عرب کی عام حالت اور مسلمانوں کی موجودہ زندگی کے لئے موزوں ہو سکتا تھا' نماز و حج کی طرح اس میں کسی قسم کی مزاحمت کا بھی اندیشہ نہ تھا وہ ایک خاموش طریقہ عبادت تھا جو بلا روک ٹوک جاری رہ سکتا تھا لیکن اسلام نے عبادات کو امراض روحانی کی دوا قرار دیا ہے جن کا استعمال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب امراض روحانیہ پیدا ہو جاتے ہیں' یا ان کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے' قوائے شہوانیہ اور زخارف دنیا کی شیفتگی اور لذات حسیہ کے انہماک و توغل سے جو روحانی مرض پیدا ہو سکتے تھے' مکہ میں یہ تمام ساز و سامان مفقود تھے بلکہ خود کفار کے جور و ستم نے ان جذبات کا استیصال کر دیا تھا اس لئے وہاں اس روحانی علاج کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو کفار کے مظالم سے نجات ملی' انصار کی ایثار نفسی نے مسلمانوں کو بوجہ کفاف سے بے نیاز کر دیا۔ فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور اس سے میں روز بروز وسعت پیدا ہوتی گئی' اب وقت آ گیا یا عنقریب آنے والا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت میں مسلمانوں کے سامنے آ کر ان کو اپنا فریفتہ بنائے' اس لئے درحقیقت یہ تداخل کا موسم تھا جن میں مرض کے پیدا ہونے سے پیشتر پرہیز کی ضرورت تھی اور وہ پرہیز روزہ تھا جو ۲ھ میں فرض (۱)۔ ہوا اس سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے جو بعض ناواقفوں کو ہوا ہے کہ چونکہ آغاز اسلام میں مسلمانوں کو اکثر فاقوں سے دوچار ہونا پڑا تھا' اس لئے ان کو روزہ کا خوگر کیا گیا'

حالانکہ اصول اسلام کی رو سے فاقہ مستوں کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے، شکم سیروں کے لئے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے، علامہ ابن قیم نے زادالمعاد میں لکھا ہے کہ مرغوبات شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا اس لئے روزہ وسط اسلام میں فرض کیا گیا، جب لوگ توحید، نماز اور احکام قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے، اس لئے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانے کے لئے موزوں تھا۔

(۱)۔ تاریخ ابن جریر طبری واقعات ۲ھ و زرقانی برمواہب جلد اول ۴۷۰ مصر وزادالمیعاد ابن قیم جلد اول ۱۶۰ مصر۔

ایام روزہ کی تحدید::

روزہ ایک قسم کی دوا ہے اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہئے تھا اگر پورا سال اس دوا میں صرف کر دیا جاتا، تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا، اور مسلمانوں کی جسمانی جدوجہد کا خاتمہ ہو جاتا اور ان کی شگفتگی مزاج مٹ جاتی جو عبادات کا اثر قبول کرتی ہے لیکن اگر ایک دو روز کا تنگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس میں دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا اس لئے اسلام نے روزہ کے لئے سال کے ۱۲ مہینوں میں صرف ایک مہینہ کا زمانہ اس کے لئے مقرر کیا اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت تھی تاکہ تمام افراد امت بیک وقت اس فرض کو ادا کر کے اسلام کے نظام وحدت کا مظاہرہ کریں اور اس کے لئے وہی زمانہ موزوں تھا جس میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا، یعنی رمضان چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بعد جب تک زندہ رہے اور تمام صحابہ نے یہ مہینہ ہمیشہ روزہ میں گذارا اور آج تک کل امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوری دنیا میں اسی مہینہ کو ماہ صیام مانتی ہے اور پورے مہینہ بھر حسب توفیق روزہ رکھتی ہے چونکہ روزہ بہر حال مشقت کی چیز ہے، اسی لئے قرآن پاک میں ماہ رمضان کے روزوں کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور سے کی گئی ہے تاکہ نفس آسانی آہستہ آہستہ اس اہم زمہ داری

کو اٹھانے کے قابل ہو پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر یہ کہا گیا ہے:

یایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام (بقرہ:۲۳)

اے ایمان والوں روزہ تم پر فرض کیا گیا ہے۔

اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم پر اکیلے فرض نہیں کیا گیا' بلکہ:

کما کتب علی الذین من قبلکم۔ (بقرہ:۲۳)

جیسا کہ تم سے پہلی قوموں پر بھی فرض کیا گیا تھا۔

اب بھی مدت نہیں بتائی گئی اس کے بعد فرمایا گیا:

ایاما معدودت۔ (بقرہ:۲۳)

چند گنے ہوئے دن۔

مدت کی تعین اب بھی نہیں البتہ اس بلیغ انداز سے زمانہ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا جس سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ پڑ جائے اور فرمایا ''چند گنے ہوئے دن'' اس کے بعد اسلامی روزوں کی آسانیوں کا ذکر شروع کر دیا گیا' تا کہ طبیعت متوجہ رہے۔

فمن کان مریضا او علی سفر فعدہت من ایام اخر۔

(بقرہ:۲۳)

تو جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں کی گنتی۔

مگر اسی طرز ادا سے معلوم ہو گیا کہ یہ روزے کسی ایک خاص زمانہ میں فرض ہوں گے کہ اگر خاص زمانہ ہوتا تو یہ کہنا بیکار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں رکھو۔ نیز یہ بھی اشارہ پتہ چلتا ہے کہ جو دن ہوں گے وہ گنے ہوئے مقرر ہوں گے ورنہ معدودات (گنے ہوئے) اور عدہت من ایام اخر۔ (دوسرے دنوں کی گنتی) اور پھر آگے چل کر ولتکملوا العدہت (تا کہ تم شمار پورا کر لو) نہ کہا جاتا' پھر اس کے بعد دوسری آسانی بتائی:

وعلی الذین یطیقونہ فدیہت طعام مسکین۔

(بقرہ:۲۳)

اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتا ہو، وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے۔

اب کہا جاتا ہے کہ مگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے۔

فمن تطوع خیرا فھو خیر لہ ط وان تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون۔ (بقرہ:۲۳)

تو جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے تو یہ بہتر ہے اس کیلئے اور روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔

ان آیتوں میں دیکھئے کہ قضاء اور کفارہ کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا مستحسن فرمایا اور روزہ کی اہمیت ظاہر کی۔

اتنی تمہیدوں کے بعد روزہ کے گنے ہوئے دنوں کی تعین کی جاتی ہے، کہ وہ ایک مہینہ ہے اور جس کو ہلکا کر کے دکھانے کیلئے فرمایا گیا تھا کہ ایاما معدودت۔ (چند گنے ہوئے دن) ظاہر ہے کہ سال کے تین سو ساٹھ دنوں میں انتیس اور تیس دن کے روزے چند گنتی کے دن تو ہیں (۱)۔ ہی، بہر حال رمضان کو ماہ صیام قرار دینے سے پہلے اس مہینہ کی عظمت اور اہمیت بتائی گئی، فرمایا:

شھر رمضان الذی انزل فیہ القران ھدی للناس وبینت من الھدی و الفرقان۔ (بقرہ:۲۳)

وہ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا، اس قرآن میں لوگوں کیلئے ہدایت ہے اور ہدایت اور حق و باطل کی تمیز کی دلیلیں ہیں۔

اب وہ مناسب موقع آیا جس میں فرمایا جائے کہ ان چند دنوں کے روزے اسی رمضان میں جس کی یہ عظمت ہے تم پر فرض کئے گئے ارشاد ہوا:

فمن شهد منکم الشهر فلیصمہ۔ (بقرہ:۲۳)

تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر روزے رکھے۔

اب پورے ماہ رمضان کے روزوں کی تعین وتحدید اور ایاما معدودات کی تشریح ہو گئی' عربی کا محاورہ یہ ہے کہ جو ظرف زمان (۲)۔ ترکیب نحوی میں اپنے فعل کا مفہول فیہ ہوتا ہے' وہ فعل اس ظرف زمان کو محیط ہوتا ہے' مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے مہینہ بھر روزہ رکھا تو کہیں گے صام شھرا۔ اس کے یہ معنی نہ ہوں کہ مہینہ میں چند دن روزے رکھے' بلکہ ایک مہینہ پورا سمجھا جائے گا اور اگر یوں کہنا ہو کہ اس نے ایک سال روزہ رکھا تو عربی میں یوں کہیں گے صام سنہت۔ (سال بھر روزہ رکھا) اس سے ثابت ہوا کہ اس آیت پاک میں پورے رمضان بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے اور چونکہ لفظ ''شہر'' یعنی مہینہ کہا گیا ہے' اس لئے مہینہ کے شروع سے ان روزوں کا آغاز اور مہینہ کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا' قمری مہینہ جس کا عرب میں رواج تھا' اس کے مہینے کبھی تیس اور کبھی انتیس دن کے ہوئے ہیں' جیسی روایت ہو' وہی ماہ صیام پر بھی صادق آئے گا' جیسا کہ سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ تمام صحابہ کرام خلفائے راشدین اور جمیع فرق اسلام کے عمل اور تواتر سے ثابت اور واضح ہے اور احادیث صحیحہ میں اس کی پوری تصریحات مذکور ہیں۔

---

(۱)۔ عربی زبان سے کوئی ناواقف اگر یہ کہے کہ ایام جمع قلت ہے جس کا اطلاق دس دنوں سے زیادہ پر نہیں ہوتا تو اس کو چاہئے کہ ایام العرب کو جو تعداد میں سینکڑوں ہیں' زیادہ سے زیادہ تو لڑائیوں میں محدود کر دے اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاں دنیا کے ہزارہا انقلاب کو ایام اللہ کہا ہے (ابراہیم:۱) ان کو تو تلک انقلابات عالم میں محدود کر دے' یمن سے شام تک کے سرسبز راستہ کو جو مہینوں میں طے ہوتے تھے اللہ تعالیٰ نے احسان کے موقع پر چند دن اور چند راتیں فرمایا سیروا فیھا لیالی وایاما امنین (سبا ۲) اور فی الایام الخالیہ (گزرے ہوئے دن) جن کا اطلاق قرآن نے پوری انسانی عمر پر تلک الایام نداولھا بین الناس کو زمانہ کے برسوں اور صدیوں پر کیا

ھے' وہ نو دن سے زیادہ نہ بڑھ سکیں' جمع قلت و کثرت کا یہ قاعدہ بھی کلی نہیں' بلکہ عمومی ان الفاظ کیلئے ھے جن کی جمع قلت و کثرت دونوں مستعمل ھیں' ایام کا لفظ ان میں نہیں اس کی صرف ایک ھی جمع آتی ھے اور وہ "ایوام" جو تعلیل کے بعد "ایام" بولا جاتا ھے' سند کیلئے دیکھو رضی شرح کافیہ' جلد دوم بحث جمع مکسّر اور لسان العرب لفظ یوم۔ (۲)۔ تفصیل کیلئے دیکھو رضی جلد اول مفعول فیہ و ظرف زبان ص ۱۶۲ مطبع نولکشور ۱۸۶۸ جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت کریمہ ثابت ھے یسئلونک عن الاھلۃ قل ھی مواقیت للناس۔ (بقرہ:۴۲) لوگ آپ سے پوچھتے ھیں (پہلی رات کے چاندوں (ھلال) کے بارے میں' کہہ دیجئے کہ وہ لوگوں کو وقت اور حج کی تاریخ بتانے کیلئے ھے "س۔"

ایک نکتہ::

قرآن پاک نے اس رمضان کی روزہ کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے:

فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ۔ (بقرہ:۲۳)

تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر روزہ رکھے۔

لفظ شھد کے لغوی معنی کسی مقام یا زمانہ میں موجود اور حاضر رہنے کے لئے اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہیں' اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہیں جو ماہ صیام میں موجود اور حاضر ہو' اس ماہ صیام میں غیر موجود اور غیر حاضر رہنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ماہ صیام آئے اور شخص غیر حاضر ہو' یعنی اس دنیا میں موجود نہ ہو' جس میں وہ ماہ صیام آیا' یا دوسری صورت یہ ہے' شخص اپنی جگہ پر موجود ہو' مگر ماہ صیام کا وہاں گزر نہ ہو' یہ صورت ان قطعات اراضی میں پیش آئے گی' جہاں شب و روز کا وہ نظام موجود نہ ہو جو باقی متمدن دنیا میں ہے' مثلاً جن مقامات پر کئی مہینوں کے دن اور کئی مہینوں کی راتیں ہوتی ہیں کہ وہاں رمضان کی آمد کا سوال ہی نہیں' ہاں اگر وہاں کے مسلمان چاہیں' تو بقیہ متمدن ممالک کے کیلنڈر (تقویم) کو معیار مان کر روزے رکھیں اور رکھولیں (جیسا کہ حدیث دجال سے جو صحاح میں ہے

ثابت ہے۔)

لیکن جہاں اٹھارہ اٹھارہ اور بیس بیس گھنٹوں کے دن ہوتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ وہاں موسم ٹھنڈا اور بارد بنایا ہے، تاکہ روزہ کی تکلیف دن کی مدت بڑھنے سے جو ہوسکتی تھی وہ موسم کی برودت سے کم ہو جائے، چنانچہ انگلستان میں مجھے خود اور بہت سے مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا اتفاق ہوا اور بالکل تکلیف محسوس (۱) نہیں ہوئی۔

معذورین::

جو لوگ حقیقت میں اس فریضہ صیام کے ادا کرنے سے معذور ہوں، ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسانیاں رکھی ہیں، اسی لئے ارشاد ہے:

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ (بقرہ:۲۳)

اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور سختی تمہارے ساتھ نہیں چاہتا۔

اس اصولی تمہید کے بعد مسافر اور بیمار کو رخصت عطاء فرمائی کہ رمضان کے کسی روزہ کے یا پورے رمضان کے روزوں میں اگر کوئی سفر یا بیماری کے عذر کی بنا پر روزہ نہ رکھ سکے تو وہ اس عذر کے دفع ہونے کے بعد قضاء روزے کو پورا کر لے۔

بیمار کے دو معنی ہیں، یا تو وہ فعلاً بیمار ہو یا یہ کہ کسی مسلمان متقی طبیب کا مشورہ ہو کہ اگر یہ شخص روزے رکھے گا تو بیمار ہو جائے گا، یا بار بار کے تجربوں کے بعد شخص کو خود غالب گمان ہو جائے کہ وہ اس سے بیمار ہو جاتا ہے تو اس کیلئے مناسب ہے کہ رمضان کا روزہ عذر کی موجودگی تک قضاء کرے اور اس کے بجائے دوسرے مناسب موقع پر قضا رکھے، فرمایا:

فمن کان منکم مریضا او علی سفر فعدۃ من ایام اخر۔ (بقرہ:۲۳)

تو جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں روزہ کی گنتی پوری کرے۔

(۱)۔ پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں اس موقع پر ان لوگوں کیلئے جو اتنی مدت کے دن میں روزہ کے بجائے کفارہ کرنے کی اجازت لکھی گئی تھی وہ میری غلطی تھی جس سے میں رجوع کرتا ہوں۔

اسی سلسلہ میں ایک اور آیت ہے جس کی تفسیر اور تاویل میں صحابہ کے عہد سے اختلاف ہے، وہ آیت یہ ہے:

وعلی الذین یطیقونہ فدیہ طعام مسکین

(بقرہ:۲۳)

اور جن لوگوں کو روزہ کی طاقت ہو فدیہ ادا کریں، ایک مسکین کا کھانا۔

۱۔ بعض صحابہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اول رمضان سے پہلے چند روزے فرض ہوئے تھے ان روزوں کے متعلق یہ اجازت تھی کہ چاہے روزے رکھیں، چاہے روزے کے بجائے ایک مسکین کا کھانا ہر روز کی جگہ دیں رمضان کی فرضیت کے بعد یہ اجازت منسوخ ہوگئی۔

۲۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یطیقونہ کی ضمیر صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف ہے اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جو لوگ فدیہ کی طاقت رکھتے ہوں، وہ روزہ کے ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی فدیۃً ادا کریں، بعد کو یہ حکم منسوخ ہوگیا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس طعام مسکین کے فدیہ سے صدقۃ الفطر مراد لیا ہے جو رمضان کے بعد ہر مطیع روزہ دار اپنی اور نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرتا ہے۔ (فوز الکبیر باب ناسخ ومنسوخ)

۳۔ تیسری روایت یہ ہے کہ یہ حکم غیر منسوخ ہے، اور یہ اجازت ان لوگوں کے لئے ہے جو روزوں سے معذور ہوں جیسے اور بڈھے اور حاملہ۔

اصل یہ ہے کہ لفظ یطیقون کے لغوی معنی کی تحقیق نہیں کی گئی ہے' اطاقت کو وسع' کے معنی میں سمجھا گیا ہے اور یطیقون کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ جو روزہ رکھ سکتے ہیں' وہ ایک مسکین کا کھانا دیں' تو اس ترجمہ کے مطابق یا تو نسخ ماننا پڑے گا اور یا آج کل کے بعض آزاد خیالوں کی رائے کے مطابق یہ کہنا پڑے گا کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں' وہ بھی روزہ کے بجائے فدیہ دے کر روزہ سے بچ سکتے ہیں حالانکہ یہ صریح غلط ہے اس کے معنی تو ہوں گے کہ غرباء روزے رکھیں اور امراء فدیہ دے کر روزہ سے مستثنیٰ ہو جائیں' ایسی تفریق اسلام کے فرائض میں کبھی روا نہیں رکھی گئی ہے اور اسلام کا تواتر عمل اس کے بالکل خلاف ہے اور آیت مابعد فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ۔ (جو رمضان کے مہینہ میں ہو وہ مہینہ بھر روزے رکھے) کے سراسر منافی ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ اطاقت کے معنی کسی کام کو مشکل کے ساتھ کر سکنے کے ہیں' اس لئے یطیقون کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے دیں۔(۱)۔

---

(۱)۔ اطاقہ طاقتہ کا باب افعال سے مصدر اس کے ثلاثی مصدر سے فعل نہیں بنتا' فعل بنانے کیلئے باب افعال مستعمل ہے اور طاقتہ کے معنی لسان العرب اور تاج العروس وغیرہ میں یہ لکھتے ہیں' والطوق الطاقۃ ای اقصی غایتہ وھو اسم لمقدار مایمکن ان یفعلہ بمشقۃ منہ۔ طوق کے معنی طاقت کے ہیں یعنی قوت کے انتہائی غایت اور وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی مشقت و مشکل کے ساتھ کر سکے۔ اطاقتہ کے اس معنی کی تائید قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے' قرآن پاک میں ہے:

ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ۔ (بقرہ: ۲۸۶)

اے ہمارے پروردگار اور ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کی ہم کو طاقت نہیں ہے۔ ''جس کی ہم کو طاقت نہیں۔''

کے معنی ہیں جس کو ہم کو وسعت نہیں، یعنی جس کو ہم کر ہی نہیں سکتے، کیونکہ قرآن پاک کے نص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتے جس کو وہ کر ہی نہیں سکتا فرمایا:

اب روزہ کے سلسلہ میں معذوروں کی دو صورتیں ہوئیں، ایک یہ کہ یہ عذر ہنگامی اور عارضی ہو جیسے مرض یا خوف مرض یا سفر تو ان کیلئے یہ آیت ہے۔

فمن کان منکم مریضا او علی سفر فعدۃ من ایام اخر۔ (بقرہ:۱۸۴)

تو جو تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی ہے۔

یعنی عذر کے وقت وہ روزہ نہ رکھے، اور اس چھوڑے ہوئے روزے کی گنتی دوسرے مناسب وقت قضاء رکھ کر پوری کر لے اور اس میں حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) بھی داخل ہوگئی۔ اگر حاملہ یا مرضعہ کو اپنی بیماری یا بچہ کی بیماری۔۔۔۔ کا خوف ہو تو وہ عذر کی موجودگی تک روزہ نہ رکھے، اور اس عذر کے دور ہونے کے بعد قضا رکھ لے۔

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ)

لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔(بقرہ:۲۸۶)

اللہ کسی نفس کو حکم نہیں دیتا، لیکن اس کا جو اس کی وسعت میں ہو۔

اس لئے ظاہر ہے کہ اب یہ دعا کہ اے اللہ! ہم پر وہ بوجھ ڈالئے جس کو ہم اٹھا ہی نہیں سکتے ہوں، صحیح نہ ہوگا بلکہ اس دعا میں طاقت نہ ہونے کے معنی یہ ہوں گے جس کو ہم بمشکل اٹھا سکتے ہوں، اسی طرح طالوت کے لشکروں کا یہ کہنا کہ:

لا طاقۃ لنا الیوم بجالوت وجنودہ۔ (بقرہ:۲۴۹)

آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم کو مقابلہ نہیں کر سکتے' بلکہ یہ معنی ہیں کہ ہم بمشکل مقابلہ کر سکتے ہیں حدیثوں سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے ابو داؤد میں ہے:

عن ابن جبیر عن ابن عباس وعلی الذین یطیقونه فدیہت طعام مسکین قال کانت رخصہت للشیخ الکبیر والمراہت الکبیرہت وھما یطیقان الصیام ان یفطر اویطعما مکان کل یوم مسکینا۔

ابن جبیر ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو روزہ بمشکل رکھ سکتے ہیں' ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے' فرمایا کہ یہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لئے اجازت ہے کہ وہ دونوں بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں' اور وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر دن کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔

اس حدیث میں ظاہر ہے کہ یطیقان الصیام کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں کہ استطاعت کے ساتھ اجازت جمع نہیں ہو سکتی' اس کے معنی یہی ہوں گے کہ جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

پہلا ایڈیشن لکھتے وقت دوسرے علماء کی تائید مجھے نہیں مل سکی تھی' اب بحمداللہ یہ تائید بھی ہاتھ آ گئی ہے' سرآمد علمائے اہل حدیث شارح عون المبعود شرح ابی داؤد میں اسی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں۔

لکن مع شدہ وتعب وشقتہ غطیتہ اسی طرح محدثین حنفیہ کے سبب سے وسیع النظر شیخ الحدیث مولانا انور شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے متعدد تلامذہ نے اس کی تصدیق کی کہ شاہ صاحب کی یہی تحقیق تھی' فالحمدللہ۔

ان وجوہ سے ''وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ'' کا ترجمہ نہ ہوگا کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں'

بلکہ یہ ہوگا کہ جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ دائمی ہو اور نا قابل ازالہ ہو جیسے کوئی دائم المرض ہو، بہت ہی کمزور ہو اور بوڑھا (شیخ فانی) ہو جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتا ہو تو وہ روزہ قضا کرے اور ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کا کھانا دے دے اس کے لئے یہ آیت ہے:

و علی الذین یطیقونہ فدیہت طعام مسکین۔

(بقرہ:۲۳)

اور ان پر جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جب بہ مشکل روزہ پر قادر ہو اس کو فدیہ کی اجازت ہے تو جو بالکل قادر نہ ہو تو اس کو تو بالاولی فدیہ کی اجازت ہوگی، لایکلف اللہ نفسا الا وسعہا۔

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب::

علم اور فطرت شناسی کے بعض مدعی جو عام عبادات و پرستش کی غرض و غایت یہ قرار دیتے ہیں کہ وحشی انسانوں کا تخیل یہ ہے کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے، وہ روزہ کی حقیقت بھی اس قدر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لئے جسمانی زحمت کشی ہے اور ان غلط فہمیوں کے لئے دیگر مذاہب میں گوالغرشگاہیں موجود ہیں، چنانچہ جوگیوں اور جینیوں میں روزہ کی غیر معمولی قدرت اور اس کی سختیاں اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یہودیوں کی اصلاح میں روزہ کے لئے نفس کو دکھ دینے کی اصطلاح جاری ہے چنانچہ تو راہ میں روزہ کے اکثر اسی قسم کا فقرہ مستعمل ہے، سفر الاحبار (۱۶۔۱۹) میں ہے:

"یہ تمہارے لئے قانون دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ تم سے ہر ایک خواہ وہ تمہارے دیس کا ہو، خواہ پردیسی جس کی بود و باش تم میں ہے اپنی جان کو دکھ دے۔"

توراہ کے سفر العدوہ (۲۹۔۷) میں ہے:

''اور اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی اور تم اپنی جانوں کو رکھ دو اور کچھ کام نہ کرو۔''

یہ اصطلاح توراہ کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے لیکن قرآن مجید نے اس کیلئے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ ''صوم'' ہے' صوم کے لغوی معنی احتراز و اجتناب اور خاموشی کے ہیں' جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ خدا نے قرآن پاک میں جہاں مسلمانوں کو روزہ کا حکم دیا ہے' وہاں یہ الفاظ بھی اضافہ فرما دیئے ہیں:

یرید اللہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر۔ (بقرہ: ۴۳)

خدا تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا۔

اسلام کا عام قانون ہے:

لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔ (بقرہ: ۴)

خدا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے:

یامرھم بالمعروف وینھھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم و الاغلال التی کانت علیھم۔ (اعراف: ۱۹)

وہ ان کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے' برائیوں سے روکتا ہے اور گندہ چیزوں کو حرام کرتا ہے اور اس طوق اور زنجیروں کو جو ان کے اوپر پڑی ہیں' ان سے اتارتا ہے۔

ان امور کا منشا یہ ہے کہ اسلامی عبادات اور احکام میں کوئی چیز بھی اس غرض سی نہیں

رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے' روزہ بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے اور اسی لئے اسلام نے روزہ کی ان سختیوں کو جو لوگوں نے بڑھا رکھی تھیں' بتدریج کم دیا۔

روزہ میں اصلاحات::

اسلام نے روزہ کی سختیوں کو جس حد تک کم کیا اور اس میں جو سہولتیں پیدا کیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ سب سے اول یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے ان میں اکثر روزہ صرف پیرووں کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا' مثلاً ہندوؤں میں غیر برہمن کیلئے کوئی روزہ ضروری نہیں' پارسیوں کے یہاں صرف دستور اور پیشوا کیلئے روزہ ہے' یونانیوں میں صرف عورتوں کیلئے روزہ تھا' لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروان مذہب کیلئے برابر طور سے ضروری ہے۔

اسلام میں پیشوا اور غیر پیشوا عورت' مرد کی کوئی تخصیص نہیں' اس نے تمام پیرووں کو عام حکم دیا اور اس میں کسی چیز کی کوئی تخصیص نہیں کی۔

فمن شهد منكم الشهر فليصمه۔ (بقرہ:۲۳)

اس مہینہ میں جو موجود ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے۔

۲۔ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں عموماً شمسی سال معتبر ہے' شمسی سال میں روزہ کی جو تاریخیں جن موسموں میں متعین ہوں گی' ان میں تغیر و تبدل ناممکن ہے' اس بنا پر اگر وہ گرمی یا سردی کے موسم میں چھوٹے یا بڑے دنوں میں واقع ہوتے ہیں تو یا تو وہ مختلف ملکوں میں ہمیشہ کیلئے تکلیف دہ یا ہمیشہ کیلئے آرام دہ ہیں' اسلام کے روزوں کی تاریخیں قمری مہینوں سے ہیں جو موسم اور چھوٹے اور بڑوں دنوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں' اس سے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک میں موسم میں آتا ہے اور اس بنا پر اسکی سختی نرمی میں بدلتی رہتی ہے۔

۳۔ جہاں تک دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں کا پڑھنے کا موقع ملا ہے روزہ کی تاکید اور حکم کے متعلق کسی حالت انسانی کی تخصیص و استثنا نظر سے نہیں گزری تو راہ میں تو یقیناً مذکور نہیں بلکہ یہاں تک ہے کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو وہ کٹ جائے یا قتل ہو جائے گا' بلکہ یہ ہے کہ اس پر دیسی پر بھی روزہ فرض ہوگا جو گو یہودی نہیں مگر یہودیوں کے پاس آ کر رہا ہو' (۱)۔ لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے معذور و مجبور لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا' بچے مستثنیٰ ہیں' عورتیں ایام حمل میں و رضاعت میں اور دیگر مخصوص ایام میں روزہ سے مستثنیٰ ہیں' بڈھے' بیمار اور مسافر مستثنیٰ ہیں' کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرۃً قادر نہیں مستثنیٰ ہیں۔ بیمار و مسافر اور عارضی معذور' بیماری حالت سفر اور عذر کے دفع ہونے کے بعد اتنے دنوں کی قضا بعد کو رکھیں' اور جو دائمی طور سے معذور ہیں' وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

فمن کان منکم مریضا او علی سفر فعدۃ من ایام الاخر۔ وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین۔ (بقرہ:۲۳)

اگر تم میں کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو وہ رمضان کے بعد اور دونوں میں روزہ رکھ لے اور وہ لوگ جو بہ مشکل روزے رکھ سکتے ہوں ان پر ایک مسکین کا کھانا ہے۔

(۱)۔ احبار ۱۶: ۱۹

ترمذی میں ہے:

عن انس قال النبی ﷺ ان اللہ وضع عن الحامل و المرضع الصوم۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا نبی کریم ﷺ نے کہ خدا نے حاملہ اور دودھ

پلانے والی سے روزہ اتار لیا۔

یعنی رمضان میں روزہ رکھنے سے اگر ان کو اپنی یا بچہ کی جان کا خطرہ ہو تو روزہ قضاء کر کے رفع عذر کے بعد قضا رکھیں۔

۴۔اور مذہبوں میں روزہ کے ایام نہایت غیر معتدلانہ تھے' یا تو چالیس چالیس روزہ کا فاقہ تھا' یا روزہ کے دنوں میں غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی' اسلام میں اس میں بھی توسط اختیار کیا' یعنی روزہ کے اوقات میں گوہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا' مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹوں کی رکھی۔

۵۔جنیوں کے یہاں ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا' عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے تھے۔یہودیوں کے ہاں پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا' اسلام نے صبح سے شام تک کا روزہ قرار دیا۔

۶۔یہودیوں کے ہاں یہ روزہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے' پھر نہیں کھا سکتے تھے' یعنی اس وقت سے دوسرا شروع ہو جاتا' عرب میں یہ رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا لیتے سو کھا لیتے سو جانے کے بعد کھانا' پھرنا جائز تھا' ابتدا اسلام میں بھی یہی قاعدہ تھا' ایک دفعہ رمضان کا مہینہ تھا ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا تیار نہیں ہوا تھا ان کی بیوی کھانا پکا رہی تھی وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے کھانا پک چکا تو ان کی بیوی کھانا لے کر آئیں وہ سو چکے تھے اس لئے کھانا نہیں کھا سکتے تھے' دوسرے دن پھر روزہ کا دن تھا ان کو غش آ گیا' اس پر آیت اتری:

وکلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر۔ (بقرہ:۲۳)

اور اس وقت تک کھاؤ اور پیو جب تک رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے ممتاز نہ ہو جائے۔

۷۔جاہلیت میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں راتوں کو بھی میاں بیوی علیحدہ رہتے تھے' لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی' اکثر لوگ اس میں مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے مرتکب ہو جاتے تھے' اس لئے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لئے یہ ممانعت محدود کر دی اور رات کو اجازت دے دی۔

احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم ھن لباس لکم وانتم لباس لھن۔ علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم فتاب علیکم وعفاعنکم فالئن باشروھن وابتغوا ما کتب اللہ لکم۔ (بقرہ:۲۳)

روزہ کی شب میں بیویوں سے مقاربت تمہارے لئے حلال کی گئی' وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی خدا جانتا ہے کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے' تو اس نے معاف کیا' اب بیویوں سے جاملو' اور خدا نے تمہارے مقدر میں جو کچھ رکھا ہے (یعنی اولاد) اس کی تلاش کرو۔

۸۔بھول چوک اور خطا و نسیان اسلام میں معاف ہے اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھا پی لے' یا کوئی اور کام بھول کر ایسا کر بیٹھے جو روزہ کے خلاف ہے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

عن ابی ھریرۃ من اکل او شرب ناسیا فلا یفطر فانما ھو رزق اللہ۔ (ترمذی)

ابو ہریرہؓ سے مروی ہے جو بھول کر کھائے یا پیئے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا' کہ یہ تو خدا کی روزی ہی تھی۔

۹۔اسی طرح ان افعال سے جو گو روزہ کے منافی ہیں لیکن وہ قصداً سرزد نہیں ہوئے' بلا ارادہ از خود سرزد ہوئے ہیں روزہ نہیں ٹوٹتا۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا لایفطر من قاء ولا من احتلم۔ (ابو دائود)

پیغمبر خدا نے فرمایا جس کو قے (ا)۔ ہوگئی یا سوتے میں غسل کی ضرورت پیش آ گئی اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔

۱۰۔ یہودیوں میں اکثر روزے چونکہ مصائب کی یادگار اور غم کی علامت تھے اس لئے روزہ کی حالت میں وہ زیب و زینت نہیں کرتے تھے اور غم کی صورت بنائے رہتے حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:

پھر جب تم روزہ رکھو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہوں میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر چکنا لگا اور منہ دھو تا کہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے آشکار تجھے بدلہ دے۔" (متی ۶۔۱۶)

اسلام میں بھی روزہ کی اصل خوبی یہی ہے اس لئے روزہ کی حالت میں سر میں تیل لگانا سرمہ ڈالنا خوشبو ملنا اسلام میں روزہ کے منافی نہیں منہ دھونے اور مسواک کرنے کی بھی تاکید ہے اس سے طہارت اور پاکی کے علاوہ یہ غرض بھی ہے کہ روزہ دار ظاہری پریشان حالی اور پراگندگی کی نمائش کر کے ریاء میں گرفتار نہ ہو اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے میں اور خدا کے اس حکم کے بجالانے میں نہایت تکلیف مشقت اور کوفت برداشت کر رہا ہے بلکہ ہنسی خوشی رضامندی اور مسرت ظاہر ہو۔

۱۱۔ روزہ دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے اس لئے ضرورت تھی کہ عام افراد امت کو اس میں غلو اور تعمق سے باز رکھا جائے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر و بیشتر روزے رکھتے تھے مہینوں

میں کچھ دن مقرر تھے، ہفتوں میں بھی کچھ دن مقرر تھے ان کے علاوہ کبھی کبھی رات کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے، لیکن دوسرے روزوں کی صرف استحباب تک رکھا، اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً ممانعت فرمائی، بعض صحابہ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا:

ایکم مثلی انی ابیت یطعمنی ربی و یسقینی۔
تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھے تو میرا خدا کھلاتا پلاتا ہے (یعنی روحانی غذا)

لوگوں نے اصرار کیا تو آپ ﷺ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کئے، جب مہینہ گزر گیا تو بطور سرزنش کے فرمایا، کہ اگر مہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا تو میں اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا۔

(۱)۔ قے ہونے کی فقہ حنفیہ میں کئی صورتیں ہیں ان میں سے بعض میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور بعض میں نہیں۔

روزہ کے مقاصد::

اس تفصیل کے بعد ہم کو غور کرنا ہے کہ اسلام میں روزہ کے کیا مقاصد ہیں، گو سطور بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہو چکا ہے، مگر ہم مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی تعلیم ربانی، محض حکم کے طور پر نہیں ہے بلکہ وہ سرتاپا حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے، اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور مادی فوائد اور منفعتوں کے چہارگانہ ستونوں پر قائم ہے، اور ان مصلحتوں اور منفعتوں کے اصول اور جوہر کو خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحیفہ الہامی نے ظاہر کر دیا، اور بتا دیا ہے، چنانچہ روزہ کے مقاصد اور اس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے تین مختصر فقروں میں بیان کر دیئے ہیں۔

(۱) لتکبروا اللہ علی ما ھدکم۔ (بقرہ: ۲۴)

تا کہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے اس پر اس کی بڑائی اور عظمت ظاہر کی۔

(۲) ولعلکم تشکرون۔ (بقرہ: ۲۳)

تا کہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو۔

(۳) لعلکم تتقون۔ (بقرہ: ۲۳)

تا کہ تم پرہیز گار بنو (یا تم میں تقوی پیدا ہو۔)

اوپر گزر چکا ہے کہ شریعت والے پیغمبروں کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدت متعینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی اور تا بہ امکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتوں سے وہ پاک رہے اور انہوں نے اس طرح اپنی روح کو عالم بالا سے اتصال کے لائق بنایا' یہاں تک کہ وہ مکالمہ الٰہی سے سرفراز ہوئے اور پیغام ربانی ان پر نزول کیا' حضرت موسیٰؑ نے چالیس روز اسی طرح بسر کئے تب توراۃ کی لوحیں ان کے سپرد ہوئیں' حضرت عیسیٰؑ نے بھی چالیس روز اسی طرح گزارے' تب حکمت کا سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے ابلا' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حرا میں ایک مہینہ یعنی تیس دن مصروف عبادت رہے' اس کے بعد فیضان الٰہی کا نور اس غار کے دہانہ سے طلوع ہوا۔

حامل قرآن کی پیروی::

اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیاء علیہم السلام کی ان متبرک و مقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے' یہود بھی حضرت موسیٰؑ کی پیروی میں ۴۰ دنوں کا روزہ مناسب اور صرف چالیسویں دن کا روزہ فرض سمجھتے تھے' عیسائیوں کو بھی حضرت عیسیٰؑ کی تقلید اور پیروی میں یہی چاہتے تھا مگر انہوں نے پال کی پیروی میں جیسے حضرت عیسیٰؑ اور احکام و سنن کی اتباع نہیں کی اس کی بھی نہ کی' اسی

طرح مسلمانوں کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول کی پیروی میں چند دن اسی طرح گزاریں، چنانچہ فرمایا:

یاایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم۔ (بقرہ:۲۳)

اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگوں پر (ان کے رسولوں کی پیروی اور ہدایت ملنے کے شکریہ میں) روزہ فرض کیا گیا تھا تم پر بھی فرض کیا گیا۔

(۱)۔ بخاری جلد ۱ صفحہ ۲٦٤

دین الٰہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیم محمدی کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گذشتہ امتوں نے اپنے اپنے پیغمروں کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز میں بھلا دیا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لاکھوں اور کروڑوں امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے اور اپنے رسول کی پیروی میں وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسری نفسانی خواہشوں سے پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے۔

شکریہ::

یہ روزہ انبیاء علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا، شکریہ ہے، اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے، وہ کتاب الٰہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایات روحانی جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی۔ جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلماتی سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوج کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کی تہذیب و اخلاق سے ان کی جہالت کو علم و معرفت سے ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا،

جس نے ان کی قسمتوں کے پانسے الٹ دیئے اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا' جس نے ذرۂ بے مقدار کو آفتاب اور مشت خاک کو ہمدوش ثریا بنا دیا' قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

ولتکبروا اللہ علی ما ھدکم و لعلکم تشکرون۔
(بقرہ:۲۳)

اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لئے (فرض ہوا) تا کہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی اور تا کہ تم اس کا شکریہ ادا کرو۔

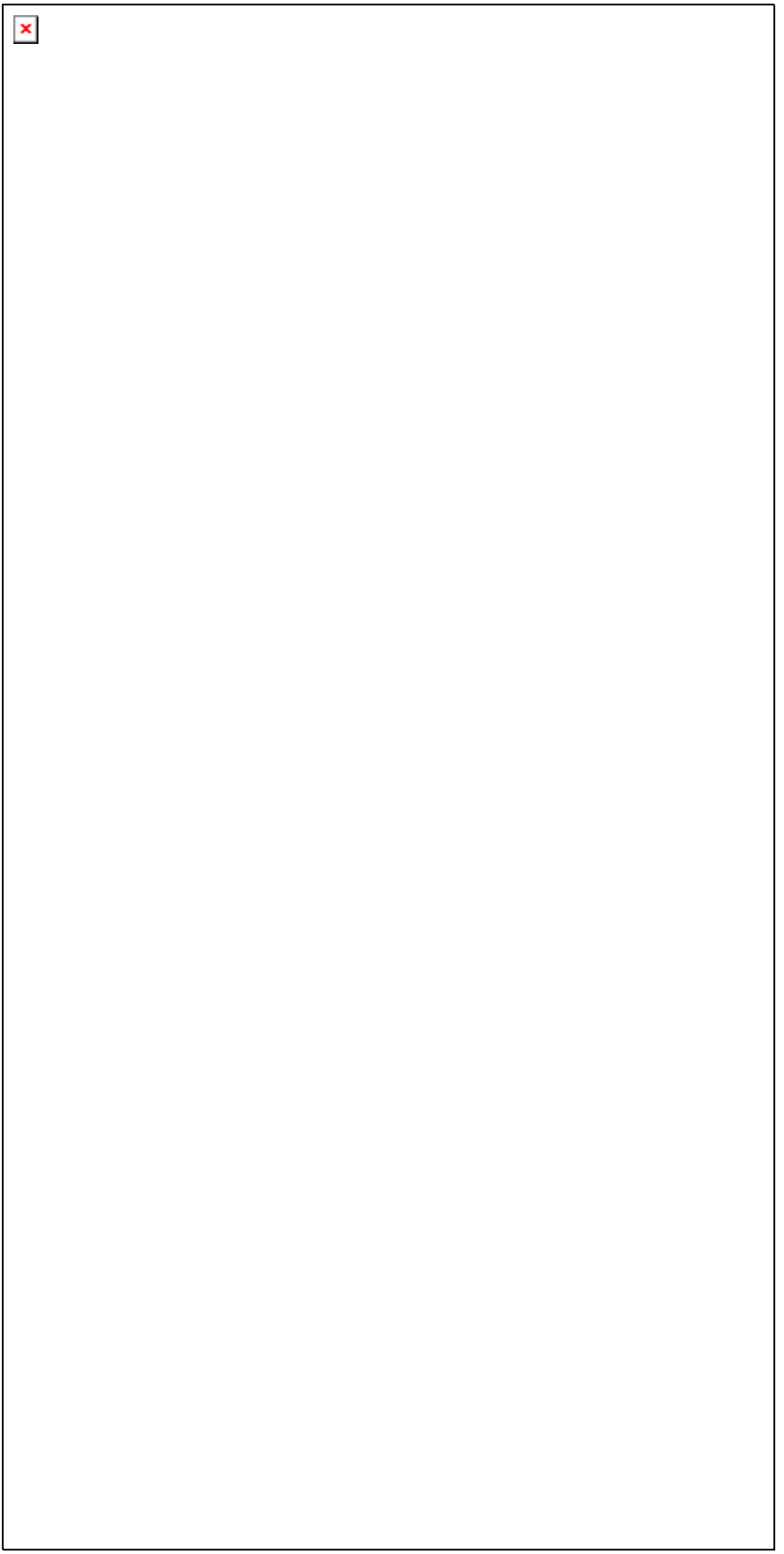
اس ہدایت ربانی اور کتاب الٰہی کے عطیہ پر شکرگزاری کا یہ رمز و اشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے عیدگاہوں میں جاتے' اور خوشی و مسرت کے ولولوں کے ساتھ عید کا دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں۔

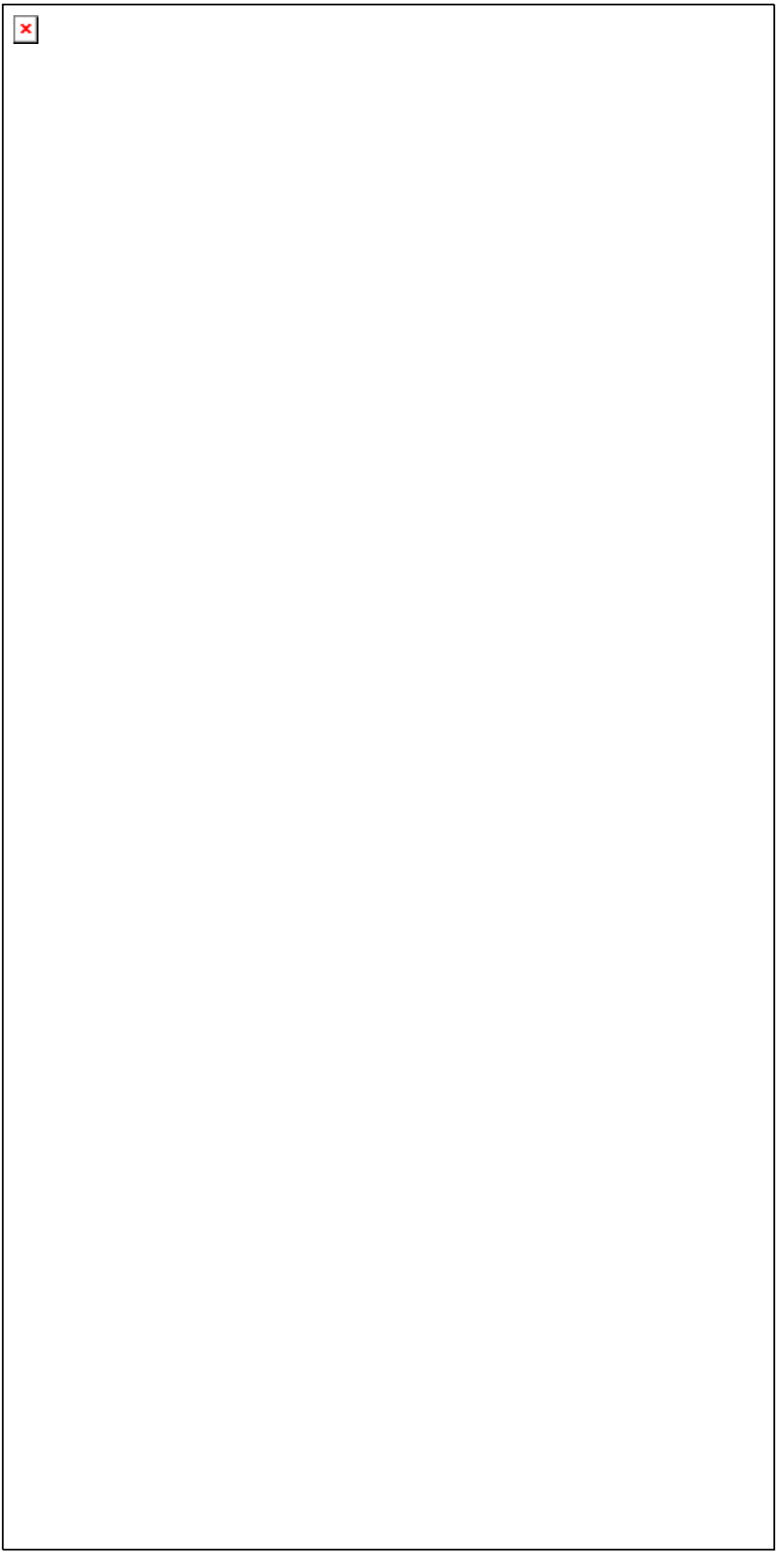
تقوی::

روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقوی اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ فرمایا گیا:

یایھا الذین امنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔ (بقرہ:۲۳)

اے ایمان والو! تم پر بھی اسی طرح روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تا کہ تم تقوی حاصل کرو۔





اور یہ بھی ممکن نہ ہو۔

فاطعام ستین مسکینا (مجادلہ: ۱)

تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔

ان احکام سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت صدقہ و خیرات' غریبوں کے کھلانے' بلکہ غلاموں کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے۔

۳۔ روزہ ہی امیروں اور پیٹ بھروں کو بتاتا ہے کہ فاقہ میں کیسی اذیت اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے' اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقموں سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہے' جو خود بھوکا نہ ہو اس کو بھوک کی' اور خود پیاسا نہ ہو اس کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیونکر ہوگا' بقول حافظ ابن قیم سوز جگر کے سمجھنے کے لئے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے' روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار' رحم اور ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کرتا ہے' چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال یہ تھا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپ ﷺ کی سخاوت ''بادرواں'' کی طرح (۱)۔ ہوتی تھی اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانوں کے ہاں اس مہینہ میں غریبوں اور فقیروں کی امداد و اعانت اور ان کو شکم سیر کیا جاتا ہے۔

۴۔ انسان گو کتنا ہی نعمت و ناز کی گودوں میں پلا ہو' اور مال و دولت سے مالا مال ہوتا ہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی' اور سختیوں کا خوگر بنائے' جہاد کے ہر متوقع میدان کے لئے بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر و ضبط سے اپنے آپ کو آشنا رکھنے کی ضرورت ہے یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدان جنگ میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے دوسرا نہیں کرتا' یہ گو ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مہینہ کرائی جاتی ہے تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے

اٹھانے کے لئے ہر وقت تیار رہے اور دنیا کی کشمکش جدوجہد سختی و محنت کا پوری طرح مقابلہ کر سکے' اسی لئے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی ''صبر'' کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے تا کہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے۔

۵۔جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے اس سے کہیں زیادہ حد سے زیادہ کھانا' انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں کا نشانہ بنا دیتا ہے' طب کے تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کیلئے ضروری ہے' مختلف بیماریوں کا یہ قطعی علاج ہے طبعی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا نا غہ کیا جائے' اسلام میں ہفتہ وار مسنون و مستحب روزے بھی ہیں مگر اسی کے ساتھ سال میں ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کیلئے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہیں' ان کو ذاتی تجربہ ہو گا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریوں کو دور کر دیتا ہے۔بشرطیکہ انہوں نے از خود کھانے پینے اور افطار و سحور میں بے اعتدالی نہ کی ہو' اس لئے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہے۔

۶۔انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتوں پر غور کرے تو اسے معلوم ہو گا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام میں گزر جاتا ہے' اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا بند کر دے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے' یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں صرف کیا جا سکتا ہے۔اگر ہمیشہ نہیں تو کم از کم سال میں ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے۔

(۱)۔ صحیح بخاری باب بدء الوحی۔

۷۔انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لئے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے' جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل و دماغ تخیرۂ معدہ کی مصیبت

سے پاک ہو' چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ صادق ہے۔

۸۔روزہ بہت سے گناہوں سے انسانوں کو محفوظ رکھتا ہے اس لئے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے' چنانچہ اوپر جہاں روزہ اور خیرات کی یکسوئی اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے' وہیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گناہوں اور غلطیوں کا کفارہ بھی ہے' بلکہ تو راہ میں تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا ہے(۱)۔اور اسلام میں بھی بہت سے موقعوں میں یہ کفارہ بتایا گیا ہے' چنانچہ اگر قسم کھا کر کوئی اس کو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے اگر اس کی سکت نہ ہو۔

فصیام ثلثہت ایامط ذلك کفارہت ایمانکم اذا حلفتم و احفظوا ایمانکم۔ (مائدہ:۱۲)

تو تین دنوں کے روزے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کا لحاظ رکھو۔

اسی طرح حج کی حالت میں شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہو سکے' اور چند مسکینوں کو کھانا نہ کھلایا جا سکے تو:

او عدل ذلك صیاما لیذوق وبال امرہط عفا الله عما سلف۔ (مائدہ:۱۳)

یا اس کے برابر روزہ' تا کہ وہ اپنے گناہ کی سزا چکھے اللہ نے معاف کیا جو ہو چکا۔

علی ہذا اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہو جائے تو اس مسلمان پر خون بہا یعنی ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا لازم آتا ہے' اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو۔

فصیام شھرین متابعین توبہت من الله (نساء:۱۳)

تو اس گناہ کو اللہ سے بخشوانے کیلئے دو مہینے کے لگاتار

اس سے اندازہ ہوگا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔

۹۔اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھئے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائے گی' روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم و مشتعل قوی کو تھوڑی دیر کے لئے سرد کر دیتا ہے' کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں' دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں' دل و دماغ' شکم سیر معدہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہیں' ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے یہ فرصت کی گھڑیاں' یہ قوی کے اعتدال کی کیفیت' یہ دل و دماغ کی جمیعت خاطر' یہ جذبات کا سکون ہوتا۔

ہمارے غور و فکر' اپنے اعمال کے محاسبہ' اپنے کاموں کے انجام پر نظر' اور اپنے کئے پر ندامت اور پشیمانی اور خدائے تعالیٰ کی بازپرس سے ڈر کیلئے بالکل موزوں اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کیلئے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے' اور نیکی اور نیک کاموں کیلئے ہمارے وجدانی ذوق و شوق کو ابھارتا ہے' یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمام تر عبادتوں اور نیکیوں کیلئے مخصوص کیا گیا ہے' اس میں تراویح ہے اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے' اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے' اور خیرات کرنا سب سے بہتر ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی فیاضی تو گو سدا بہار تھی' لیکن رمضان کے موسم میں وہ تیز ہواؤں سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔(۲)۔

---

(۱)۔احیاء ۱۶۔۳۰ سے ۳۴ تک و ۲۳' ۲۷ (۲)۔صحیح بخاری باب الوحی جلد اول صفحہ ۳

۱۰۔ان باتوں کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض و غایت تقوی قرار دی ہے' اگر روزہ

سے روزہ کی یہ غرض و غایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہئے کہ گویا روزہ رکھا ہی نہیں گیا' یا یوں کہنا چاہئے کہ جسم کا روزہ ہو گیا' لیکن روح کا روزہ نہ ہوا' اس کی تشریح محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ ''روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اپنا کھانا چھوڑ دے۔(۱)۔'' ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا' روزہ برائیوں سے روکنے کی ڈھال ہے تو جو روزہ رکھے اس کو چاہئے کہ لغو اور فحش باتیں نہ بکے' اور نہ جہالت (غصہ) کرے' یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو' اور گالی بھی دے' تو یہی کہے کہ میں روزے (۲)۔ سے ہوں' بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا ''روزہ اس وقت تک ڈھال ہے جب تک اس میں سوراخ نہ کر دو۔(۳)۔'' صحابہ نے دریافت کیا' یا رسول اللہ! اس میں سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے' فرمایا ''جھوٹ اور غیبت (۴)۔ سے'' چنانچہ بعض علماء کی رائے میں جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔(۵)۔

۱۱۔ تمام عبادات میں روزہ کو تقوی کی اصل اور بنیاد اس لئے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے جو رعایا اور نمائش سے بری ہے' جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے' دوسروں پر اس کا راز افشا نہیں ہو سکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے۔

۱۲۔ اسی اخلاص اور بے ریائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالی نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے لئے اپنا کھانا پینا اور ملذذات کو چھوڑتا ہے' اسی لئے:

الصوم لی' وانا اجزی بہ(۶)۔

روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزاء دوں گا۔

جزاء تو ہر کام کی وہی دیتا ہے' لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے

لئے اس کی جزاء کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا اور بعض علماء کے نزدیک اس کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب۔ (زمر)

صبر کرنے والوں کو مزدوری بے حساب پوری کی جائے گی۔

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے، اسی لئے روزہ دار بھی ''صابرین'' کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے۔

۱۳۔ روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے اسی لئے مشکلات کے حل کرنے کیلئے دعا اور صبر کرنے کی خاص ہدایت ہوئی ہے:

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الصوم جلد اول ص ۲۵۵، و ترمذی باب الصوم ٦٤، و ابوداؤد صوم ص ۲۳٦، و ابن ماجہ صوم ص ۱۲۲ (۲)۔ صحیح بخاری جلد ۱ ص ۲۵۲ صحیح مسلم صوم جلد ۱ ص ٤۲۷ مصر و موطا امام مالك صوم ۹۷، نسائی ۳۵۵۔ (۳)۔ سنن دارمی ص ۲۸ مجمع الفوائد بحوالہ نسائی۔ (٤)۔ مجمع الفوائد بحوالہ طبرانی فی الاوسط صفحہ ۱۵۲ میرٹھ۔ (۵)۔ فتح الباری جلد ٤ ص ۸۸ (٦)۔ صحیح بخاری و موطا وغیرہ کتاب الصوم۔

واستعینوا بالصبر و الصلوٰۃ۔ (بقرہ:۵)

اور (مشکلات پر) دعا اور صبر کے ذریعے سے مدد حاصل کرو۔

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے، لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیار نہیں، کیونکہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں، اس لئے اس کی مہارت اور مشق کے لئے شریعت نے روزہ رکھا ہے، اسی لئے اس آیت بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی کئے گئے ہیں۔ (۱)۔

۱۴۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی اعمال حسنہ میں ہے کہ جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے

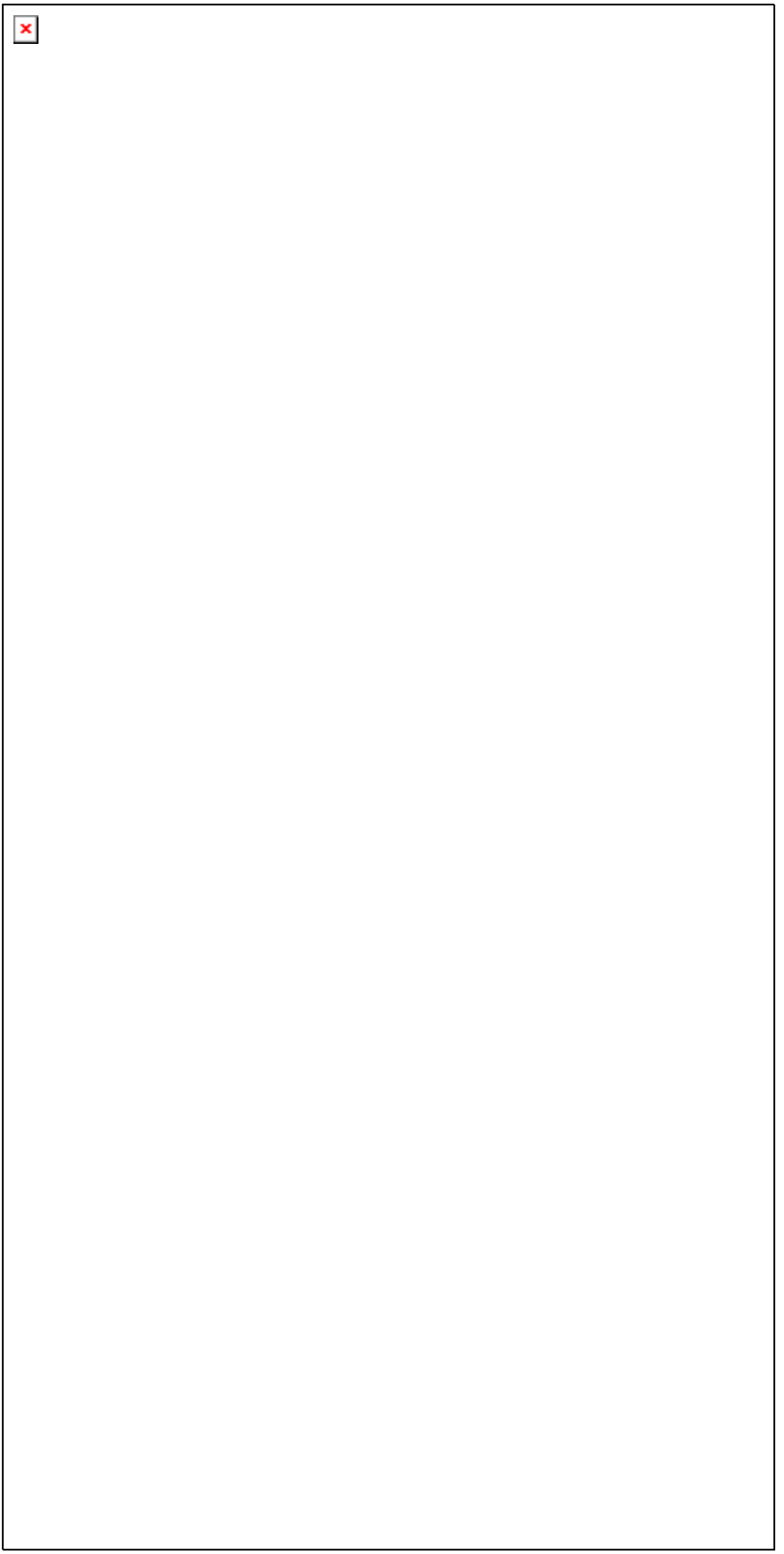
اپنے بندوں سے خطاپوشی گناہوں کی معافی اوراجرعظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ارشاد ہے:

والصائمین والصائمات والحفظین فروجہم والحفظت والذاکرین اللہ کثیرا و الذاکرات اعداللہ لھم مغفرہت و اجرا عظیما۔ (احزاب:۵)

اور روزہ دارمرد اور روزہ دارعورتیں اوراپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اورحفاظت کرنے والی عورتیں' اور خدا کو زیادہ یاد کرنے والے مرد اور زیادہ یاد کرنے والی عورتیں ان کے لئے اللہ نے تیار رکھی ہے' معافی اور بڑی مزدوری۔

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرائم کا کفارہ ہے اسی طرح ہمارے روحانی گناہوں کا بھی کفارہ ہے۔

(۱)۔ تفسیر ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکورہ ج ص ۱۹۹ مصر۔



رقمیں اور پیداواریں اس میں جمع ہوتی تھیں' اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور حکمرانی بڑھتی جاتی تھی' اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔(۱)۔

(۱)۔ توراہ اور بابل کلدان و یونان وغیرہ کی پرانی تاریخوں اور آثار قدیمہ میں اس بیان کے شواھد ملیں گے اور میری تصنیف ارض القرآن میں ان کے اقتباسات مذکور ھیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا' جہاں کلدانیوں کی آبادی اور حکومت تھی' یہاں بھی بدستور ستاروں کی پوجا ہوتی تھی' حضرت ابراہیمؑ نے نبوت پا کر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی' ان کے خاندان اور قوم کے لوگوں نے ان کو اس کے لیئے تکلیفیں دیں اور بالآخر ان کو اپنا آبائی وطن چھوڑ کر شام' مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی' یہ تمام وہ مقامات تھے جن میں سام کی اولاد پھیلی ہوئی تھی اور مختلف ناموں سے ان کی حکومتیں قائم تھیں' آثار' قومیات' لسانیات اور دوسرے تاریخی قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی اور یہیں سے نکل کر وہ یمن اور خلیج فارس کے سواحل سے عراق پہنچی تھیں اور شام و فلسطین گئی تھیں اور مصر میں ہکوس یا چرواہے (بدو) بادشاہوں کے نام سے حکمران تھیں۔(۱)۔

حضرت ابراہیمؑ نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب و شام کی سرحد کا رخ کیا' اور بحرمیت کے پاس اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو آباد کیا' اپنے بیٹے حضرت اسحاق کو کنعان (فلسطین) میں بسایا' اپنے دوسرے بیٹوں کو مدین وغیرہ کو حجاز کی طرف بحر احمر کے ساحل پر اس مقام پر جگہ دی جس کو ان کے انتساب سے آج تک مدین کہتے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر فاران کی وادی میں حضرت اسماعیلؑ کی سکونت مقرر کی یہ تمام مقامات وہ شاہراہ تھی جس پر مصر و شام سے حجاز و یمن اور حجاز و یمن سے مصر و شام آنے جانے والے تاجروں سوداگروں اور قافلوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔

اپنی اولاد کو اس خاص سلسلہ سے آباد کرنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقصد تھے ایک یہ کہ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کی بنا پر اس کو غلہ اور ضروری سامان ملنے میں تکلیف نہ ہو اور ساتھ ہی وہ بھی سوداگری میں بہا سانی شریک ہو سکے اور دوسرا یہ کہ خدا کی خالص توحید کے تبلیغ کے لیئے قوموں کی یہ گزرگاہ بہترین تبلیغی مرکز تھے' یہاں وہ عراق و شام کی جبار و قہار قوموں کے حدود سے جو مشہور بت پرست اور ستارہ پرست تھیں' علیحدہ رہ کر لوگوں میں دین حق کو پھیلا سکتی تھی۔

بیت اللہ::

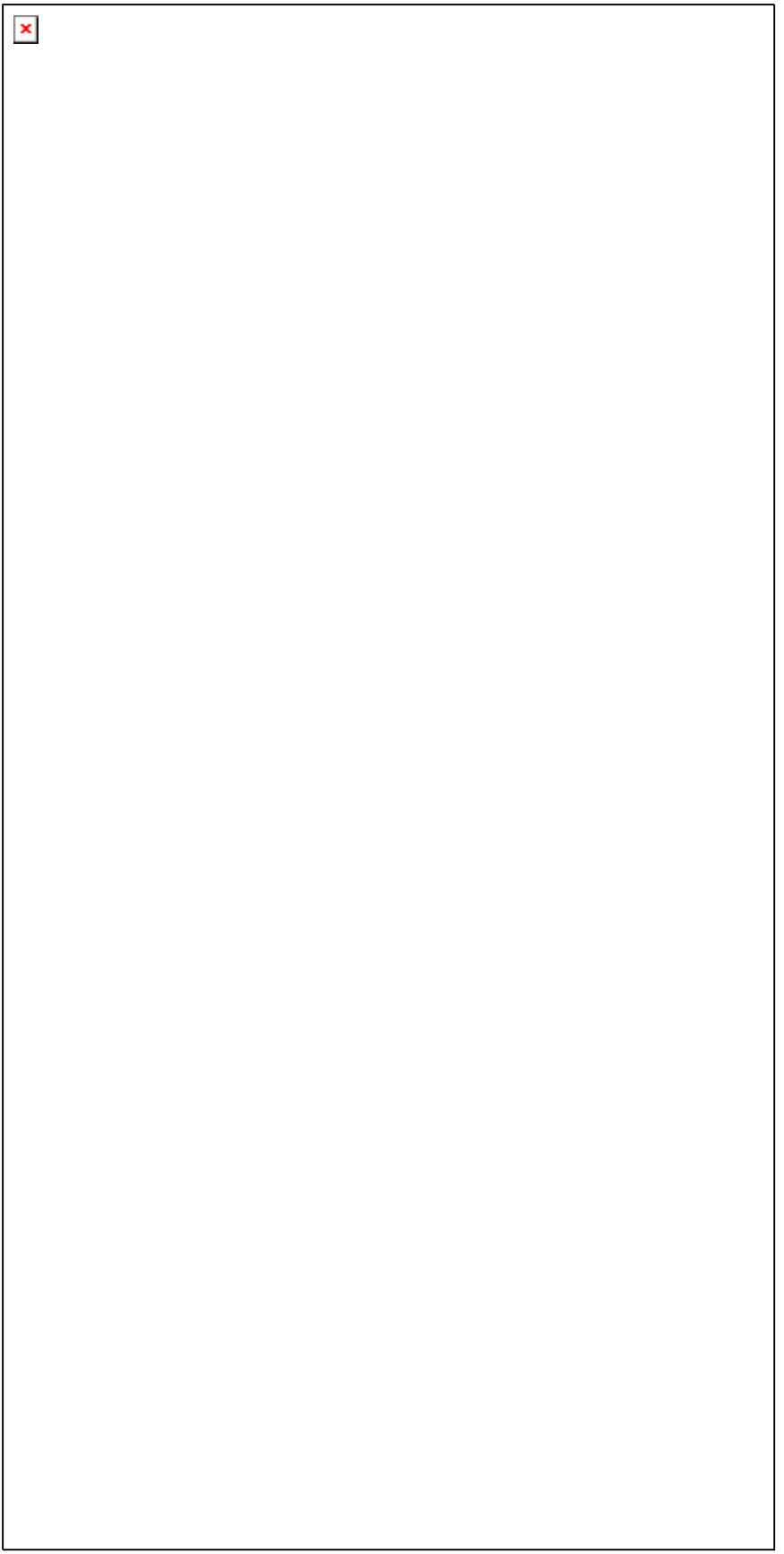
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دستور یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحانیت کا کوئی خطرہ نظر آتا وہاں خدا کے نام سے ایک پتھر کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا لیتے تھے' چنانچہ توراہ کتاب پیدائش میں ان کی تین قربان گاہوں یا ''خدا کا گھر'' بنانے کے واقعات مذکور ہیں۔

تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کے کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا' اور وہاں خداوند کے لیئے جو اس پر ظاہر ہوا ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے روانہ ہو کے اس نے ''بیت ایل'' (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا' بیت ایل اس کے پچھم اور عئی اس کے پورب تھا' اور وہاں اس نے خدا کے لیئے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا۔'' (۱۲۔۱۷۔۸) اس کے بعد ہے :

> ''اور وہ (ابراہیمؑ) سفر کرتا ہوا دکن سے بیت اللہ میں اس مقام تک پہنچا جہاں اس نے شروع میں ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں ابراہیمؑ نے خدا کا نام لیا۔'' (۱۳۔۴)

پھر ایک اور جگہ پہنچے جہاں ان کو خدا کی وحی اور برکت کا پیام پہنچا' اور حکم ہوا :

> ''اٹھ اور اس کے ملک کے طول و عرض میں پھر' کہ میں اسے تجھ کو دوں گا' اور ابراہیمؑ نے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور ممرے کے



اوپر کے اقتباسات میں اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام (مذبح قربان گاہ) بتایا گیا اور دوسرا بیت ایل یعنی بیت اللہ اور خدا کا گھر' اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی نسل میں اس قسم کی قربان گاہ اور بیت اللہ بنانے کا دستور تھا' اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ معظّمہ میں کعبہ' مسجد حرام' اور مسجد ابراہیم کے نام سے آج تک قائم ہے بلکہ اس کی نسبت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہے۔

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی اور اس کی شرائط::

اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں یہ بحث تفصیل سے آ چکی ہے کہ قرآن پاک کے بموجب حضرت ابراہیمؑ نے اپنے جس محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا اور توراہ کے مطابق جس کی قربانی کا حکم ہوا تھا۔ وہ حضرت اسماعیلؑ تھے' اور یہ بحث بھی وہیں گزر چکی ہے کہ قربانی کرنے سے توراہ کے محاورہ میں یہ مقصود ہے کہ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لیئے نذر کر دیا جائے وہ نذر کردہ جانوروں پر ہاتھ رکھ دیتا ہے اور وہ جانور اس کی طرف سے قربانی کیئے جاتے تھے' جو لوگ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لیئے نذر کیئے جاتے تھے وہ نذر کے دنوں میں سر نہیں منڈاتے تھے' جب نذر کے دن پورے ہو جاتے تھے تب ان کا سر مونڈا جاتا تھا' جو قربانی یا نذر پیش کی جاتی تھی وہ پہلے قربان گاہ پر ہلائی یا پھرائی جاتی تھی' اس کے بعد وہ قربانی کی جاتی یا جلائی جاتی تھی۔

ملت ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے::

توراہ اور قرآن پاک دونوں سے یہ ثابت ہے کہ ملت ابراہیمی کی اصلی بنیاد قربانی تھی' اور یہی قربانی حضرت ابراہیمؑ کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصلی خصوصیات تھی' اور اسی امتحان اور آزمائش میں پورے اترنے کی سبب سے وہ اور ان کی اولاد ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالا مال کی گئی' توراہ کی کتاب پیدائش میں ہے

(۲۲۔۱۶۔۱۷۔۱۸)

''خداوند فرماتا ہے اس لیئے کہ تو نے ایسا کام کیا' اور اپنا بیٹا
ہاں اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا' میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں
برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا' اور بڑھاتے ہی تیری
نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کے کنارے کی ریت کے
مانند بڑھاؤں گا اور تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازوں پر
قابض ہو جائے گی' اور تیری نسل سے زمین کی ساری قوم
برکت پائے گی' کیونکہ تو نے میری بات مانی۔''

قرآن پاک میں ہے:

واذا ابتلی ابراھیم ربہ بکلمت فاتمھن قال انی
جاعلک للناس اماما۔ (بقرہ:۱۲۵)

اور جب ابراہیم کے پروردگار نے چند باتوں میں اس کی
آزمائش کی' پھر اس نے ان کو پورا کیا تو خدا نے اس سے کہا
کہ میں تجھ کو لوگوں کیلئے پیشواء بنانے والا ہوں۔

ولقد اصطفینہ فی الدنیا وانہ' فی الاخرۃ لمن
الصلحین۔ اذقال لہ ربہ اسلم۔ قال اسلمت لرب
العلمین۔ (بقرہ:۱۳۰)

اور ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چنا اور وہ آخرت میں یقیناً نیکوں
میں سے ہے جب اس کے خدا نے اس سے کہا کہ اپنے کو
سپرد کر دے' اس نے کہا میں نے اپنے کو دنیا کے پروردگار
کے سپرد کر دیا۔

یابراھیم قد صدقت الرویا انا کذلک نجزی
المحسنین۔ (صافات:۱۰۴)

اے ابراہیمؑ تو نے اپنا خواب سچا کر دکھایا، ہم یونہی اچھے کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔

یہی وہ برکت ہے جس کو مسلمان دن میں پانچ مرتبہ خدا کے سامنے یاد کرتے ہیں:

اللھم بارک علی محمد وعلی ال محمد کما بارکت علی ابراھیم وعلی آل ابراہیمط

خدایا تو محمدؐ اور محمدؐ کی (جسمانی و روحانی) نسل پر برکت نازل کر، جس طرح تو نے ابراہیمؑ اور ابراہیمؑ کی (جسمانی و روحانی) نسل پر برکت نازل کی۔

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی، بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی، یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی، یہ اپنے عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کی نذر تھی، یہ خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثل منظر تھا، یہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا وہ امتحان تھا جس کو پورا کئے بغیر دنیا کی ''پیشوائی'' اور آخرت کی ''نیکی'' نہیں مل سکتی، یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کر دینا نہ تھا، بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی قربانی تھی، اور خدا کے حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا، اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندرونی نقش کا ظاہری عکس اور اس خورشید حقیقت کا ظل مجاز تھا۔

اسلام قربانی ہے::

اسلام کے لفظی معنی اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور اطاعت اور بندگی کے لیئے گردن جھکا دینا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے اس ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان باپ بیٹوں کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبہ کو صحیفۂ محمدی میں اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے:

فلما اسلم وتله للجبين۔ (صافات:۳)

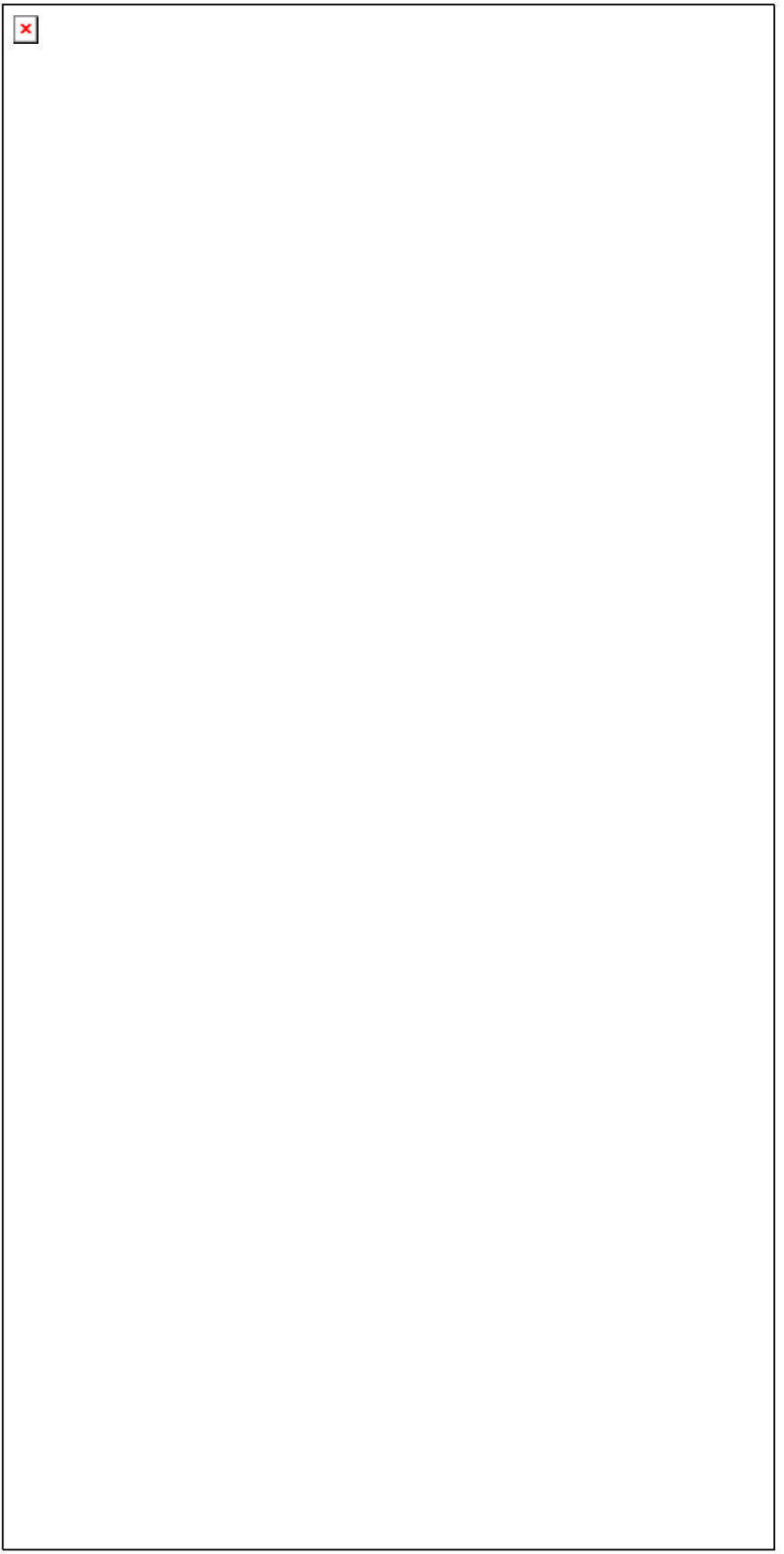
جب ابراہیم اور اسماعیل لائے (یا فرمانبرداری کی یا اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا) اور ابراہیم نے اپنے بیٹے (اسماعیل) کو پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا۔

ومن یرغب عن ملۃ ابراھیم الا من سفہ نفسہ ولقد اصطفینہ فی الدنیا وانہ فی الاخرۃ لمن الصالحین اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین۔ (بقرہ:۱۳۰)

اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند نہ کرے گا' لیکن وہ جو خود بیوقوف بنے' ہم نے اس کو دنیا میں مقبول کیا اور وہ آخرت میں بھی نیکوں میں سے ہوگا' جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ اسلام لا (یا فرمانبرداری کر یا اپنے کو سپرد کر دے) اس نے کہا میں نے پروردگار عالم کی فرمانبرداری کی (یا اپنے کو اس کے سپرد کر دیا)

الغرض ملت ابراہیمی کی حقیقت یہی اسلام ہے کہ انہوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا اور اس کے آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا تھا' یہی اسلام کی حقیقت اور یہی ملت ابراہیم ہے اور اسی بار امانت کو اٹھانے کے لیئے حضرت ابراہیمؑ بارہا خدا سے دعا فرماتے تھے کہ ان کی نسل میں اس بوجھ کے اٹھانے والے ہر زمانہ میں موجود رہیں' اور بالآخر ان کی نسل میں وہ امین پیدا ہوا' جو اس امانت کو لے کر تمام دنیا میں وقف عام کر دے' چنانچہ دعا فرمائی تو یہ فرمائی:

ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک وارنا مناسکنا وتب علینا انک



جو مکہ میں بیت اللہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے اسی فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے:

''خدا ابراہیم را امتحان کردہ بدو گفت اے ابراہیم' عرض کرد لبیک' گفت کہ اکنون پسرخودار کہ یگانہ تست و اورادوست می داری یعنی اسحاق رابردارو بزمین ''موریا'' برد' واورآور آن جابر یکے از کوئہ ہائیکہ تبونشان می دہم برائے قربانی' سوختنی بگذران' بامداوان (صبح) ابراہیم برخاستہ الاغ (گدھا) خود را بیاراست و دونفراز نوکران خودرابا پسر خویش ''اسحاق'' برداشتہ وہیزم برائے قربانی سوختنی شکستہ روانہ شدو بسوئے آن مکانیکہ خدا اورا فرمودہ بودرفت و درروز سوم ابراہیم چشمان خور رابلند کردہ آن مکان را از دورید' آنگاہ نجادمان گفت شمااین جابمانید تامن باپسر بدانجا' رویم و عبادت (دوسرے ترجموں میں سجدہ ہے) کردہ نزدو شمابازآئیم۔'' (پیدائش ۲۲)

اس عبارت میں اسحاق کا نام یہود کی تحریف اور اضافہ ہے اور مسلمان متکلمین نے قطعی دلیلوں سے اس تحریف و اضافہ کو ثابت کیا ہے اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں اس پر مختصر بحث گزر چکی ہے اور ہماری جماعت میں سے جناب مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے ''الرای الصحیح فی من ہوالذبیح'' نام ایک عربی رسالہ خاص اس مسئلہ پر مدلل ومفصل لکھا ہے' اس لیئے یہاں بحث بے محل ہے' بہرحال حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کیلئے جو مقام بتایا گیا تھا وہ سرزمین

مردہ تھی، وہ اس مقام سے جہاں وہ قیام پذیر تھے، چند روز کی مسافت پر تھی، حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعتوں کے مطابق ضروری تھا کہ جس مقام پر قربانی گزاری جائے وہ کوئی قربان گاہ اور بیت اللہ ہو، خاص کر اس لیئے بھی کہ وہاں حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی عبادت کی، اور سجدہ کیا اور وہ قربان گاہ یا بیت اللہ ایسا معروف و مشہور رہو کہ ساتھ کے نوکروں کو یہ کہا جا سکے کہ ''میں وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں۔'' یہ خصوصیتیں کعبہ کے سوا کہیں اور نہیں پائی جاتیں، اور نہ یہود و نصاریٰ کیلئے کسی دوسرے مقام کو ثابت کر سکے، اور نہ اس عظیم الشان واقعہ کی کسی قسم کی بھی یادگار حضرت اسحاقؑ کی نسل (بنی اسرائیل) میں موجود تھی اور نہ ہے اور نہ بیت المقدس، یا مسیحؑ کی ولادت گاہ سے اس واقعہ کے کسی یادگاری اثر کا تعلق پہلے تھا نہ اب ہے۔

برخلاف اس کے کہ بنو اسماعیل یعنی اسماعیلی، عربوں میں اس قربانی اور اس کی خصوصیات کی ایک ایک یادگار ہزارہا برس سے محفوظ چلی آتی ہے، اور گو اس میں امتداد زمانہ اور تغیرات کے سبب سے کسی قدر کمی بیشی، یا تعداد کی گمراہیوں کے سبب سے اس میں بعض مشرکانہ رسوم کی آمیزش ہو گئی تھی، عرب میں بت پرست بھی تھے، ستارہ پرست بھی تھے، کافر بھی تھے، مشرک بھی تھے، بلکہ عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی تھے، مگر عربوں کے قدیم اشعار سے ثابت ہے کہ ان سب کو خانہ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکساں اعتراف ہے، یہاں تک کہ عیسائی عرب بھی اس کی قسمیں کھاتے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ میں جہاں مشرکوں کے بتوں کی صفیں تھیں، حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کی تصویریں تھیں۔(۱)۔

(۱)۔ اخبار مکہ لازرقی و فتح الباری ذکر ھدم اصنام کعبہ و سیرت ابن ھشام۔

مکہ اور کعبہ::

کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفاء کے خیال کے مطابق عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں کا ''سمت القدم'' ہے' وہ ازل سے اس دنیا میں خدا کا معبد' اور خدا پرستی کا مرکز تھا' سب بڑے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی' اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اس کو قرار دیا کہ :

اول بیت وضع للناس۔ (آل عمران: ۱۰)

سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگوں کیلئے بنایا گیا۔

وہ وہی تھا' لیکن حضرت ابراہیمؑ سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا' حضرت ابراہیمؑ کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدہ میں توحید کا چراغ پھر روشن کیا' تو حکم ہوا کہ اس گھر کی چار دیواری بلند کر کے' دنیا میں توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے' چنانچہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق (حج ۳' ۴) کعبہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں بھی البیت العتیق (پرانا گھر) تھا کوئی نیا گھر نہ تھا' حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے مل کر' اس گھر کی پرانی بنیادوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر' پھر نئے سرے سے ان پر چہار دیواری کھڑی کی فرمایا: اذ یرفع ابراہیم القواعد من البیت ۔۔۔۔ (ابراہیم جب اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی' حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے اس افتادہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا' حضرت ابراہیمؑ نے عراق' شام' مصر ہر جگہ پھر کر' آخر اسی گمنام گوشہ کو منتخب کیا' جو باسطوت جباروں اور بت پرستوں اور ستارہ پرست قوموں کے حدود سے دور ایک بے نام و نشان صحرا میں ہر چار طرف سے پہاڑیوں سے گھرا تھا' اس لیئے قرآن پاک نے کہا:

واذ بوانا لا براھیم مکان البیت ان لا تشرک بی شیئا۔ (حج: ۴)

اور ہم نے ابراہیمؑ کیلئے اس گھر کی جگہ کو ''ٹھکانا بنایا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی البتہ دیواریں بے نشان تھیں' تو ہم نے ابراہیمؑ کو اسی گھر کی جگہ بتا دی اور اس کو ان کو جا پناہ اور ٹھکانا بتا دیا کہ بت پرستوں کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ کر دین حق کی تبلیغ کریں' تو راہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے یہ معبد موجود تھا' کیونکہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جس مقام پر خدا کی قربانی یا نذر یا عبادت کی جائے وہ کوئی معبد یا قربان گاہ ہو' اس بناء پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیمؑ' اسماعیلؑ کو قربان کرنے کے لیئے لائے تھے اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا تھا' کہ وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں ضروری ہے کہ وہ کوئی معبد ہو' اسی لیئے قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کی طرف اس گھر کی ایجاد نہیں' بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے' وطھر بیتی (اور میرے گھر کو عبادت گاہوں کے لیئے پاک و صاف کر) اس وقت تک اس سرزمین کے لیئے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا' یہ لفظ تو مجموعہ توراہ میں حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے ملتا ہے اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکھن کا ملک تھا' کہ یہ شام کے جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا' اور کبھی اس کا نام ''بیابان'' تھا اور آخری بیابان اس کا نام پڑ گیا' لفظ عرب (عربیہ) کے اصلی معنی بیابان و صحراء ہی کے ہیں' (۱)۔ اس لیئے حضرت ابراہیمؑ نے جس وقت یہ فرمایا تھا:

ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع

(ابراہیم:۳۷)

خداوندا میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بن کھیتی کی ترائی میں لا کر بسایا ہے۔

تو حقیقت میں یہ ''بن کھیتی کی ترائی اور بے آب و گیاہ میدان'' اس وقت اس کی

ایک امتیازی صفت تھی اور آخر یہی صفت اس ملک کا خاص نام بن گئی' اور اس لیئے حضرت ابراہیمؑ نے یہاں حضرت اسماعیلؑ کو آباد کرتے ہوئے یہ دعا مانگی تھی :

(۱)۔ اخبار مکہ للازرقی و فتح الباری ابن حجر ذکر ھدم اصنام کعبہ' و سیرت ابن ھشام۔

و ارزق اھلہ من الثمرات (بقرہ:۱۵)

اور خداوند یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی پہنچا۔

''مکہ'' قدیم زبانوں کے بعض محققوں کے نزدیک بابلی یا کلدانی لفظ ہے جس کے اصلی معنی ''گھر'' کے ہیں (۱)۔ اس سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں' ایک تو یہ کہ آبادی اس وقت قائم ہوئی جب بابل و کلدان کے قافلے ادھر سے گزرتے تھے اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور لغوی دلیل ہے' دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کی آبادی اس گھر کے تعلق سے وجود میں آئی اور یہ اس خانہ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے' بکہ نام حضرت داؤد کی زبور میں سب سے پہلے نظر آتا ہے' پہلی جلد کے مقدمہ میں اس کا حوالہ گزر چکا ہے یہاں یہ اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان میں ''بک'' کے معنی آبادی' یا شہر کے ہیں' جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہے یعنی بعل کا شہر (بعل دیوتا کا نام ہے) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی نام قرآن پاک میں آیا ہے :

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکہ (آل عمران:۱)

پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کیلئے بنایا گیا' وہ وہی ہے جو بکہ میں ہے۔

کعبہ کے لغوی معنی ''چوکھونٹے'' کے ہیں چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا' اور اب بھی اسی طرح ہے اس لیئے کعبہ کے نام سے بھی مشہور رہا۔

یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے یونان کا مشہور مورخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰؑ سے ایک صدی پہلے گزرا ہے، وہ عرب کے ذکر میں کہتا ہے:

ثمودیوں اور سباوالوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہیں۔(۳)۔

ثمود کا مقام شام وحجاز کی حدود میں تھا اور سباء کا یمن میں، ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے اور وہاں کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہونگے خانہ کعبہ ہے رومیوں کی تاریخ میں بھی خانہ کعبہ کا ذکر ملتا ہے، پروکوپس مورخ لکھتا ہے کہ ۵۴۱ء میں رومی سپہ سالار ریلزیر نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسہ مشاورت کیا اس میں شام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے، کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر رسوم فوراً حملہ کر دے گا اس پر سپہ سالار نے کہا:

> ''تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں ہے کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لیئے خاص کرتے ہیں اور اس زمانہ میں وہ ہر قسم کے ہتھیاروں سے پرہیز کرتے ہیں۔(۴)۔''

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے۔

---

(۱)۔ اس تحقیق پر مفصل بحث میری تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد میں ہے، از صفحہ ۵۷ تا ۵۷ طبع اول (۲)۔ تاریخ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان صفحہ ۲۲٤ مصر (۳)۔ گبن کی تاریخ عروج و زوال روم باب ۵۰ (٤)۔ نتائج الافہام فی تقویم العرب قبل الاسلام، محمود پاشا ملکی مطبع امیریہ بولاق مصر صفحہ ۳۵ بحوالہ (فرنچ) ایشیاٹک جرنل اپریل ۱۸۸۳ء

ان تمام شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا بنی اسماعیل ہمیشہ سے اپنے ان موروثی مراسم کو ادا کرتے تھے اور ان کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کے ساتھ

باقی رکھے ہوئے تھے' جاہلیت کے اشعار میں حج اور ارکان حج کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔(۱)۔یہاں تک کہ عیسائی عرب شعراء بھی عزت کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے' عرب کے بازاروں اور میلوں کی روایات کے قائم رکھنے میں بھی اس موسم حج کا اچھا خاصہ حصہ(۲)۔اور اسی کے سبب سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو ہجرت سے پہلے عرب کے دور دراز گوشوں میں یہاں تک کہ یمن و بحرین تک پہنچنے میں کامیابی ہوئی' کیونکہ حج کے موسم میں عرب کے تمام قبیلے مکہ کی وادی میں اس موروثی رسم کو ادا کرنے کے لیئے جمع ہو جاتے تھے۔

حج ابراہیمی یادگار ہے::

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا اور اس پر لبیک کہا تھا اور جس کی تعمیل کے لیئے وہ اس دور دراز مقام میں آئے تھے اور عین اس وقت چھری لے کر بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنا چاہا تھا اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم سن کر گردن جھکا دی تو آواز آئی تھی:

ان یابراھیم قد صدقت الرویا انا کذلک نجزی المحسنین۔ وفدینہ بذبح عظیم۔ (صافات:۳)

یہ کہ اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا' ہم ایسا ایسا ہی نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں اور ایک بڑی قربانی دے کر ہم نے اس کے بیٹے کو چھڑا لیا۔

اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر' بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کے لیئے مخصوص کر دینا اور اس کے ذریعہ سے اس گھر کا دائرہ ارضی میں خداپرستی کا مرکز بنانا ہے۔

واذ جعلنا البیت مثابہت للناس و امناط و اتخذوا من مقام ابراھیم مصلیط و عھدنا الی ابراھیم

واسمعیل ان طھرا بیتی للطائفین والعکفین والرکع السجود واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا بلدا امنا وارزق اھلہ من الثمرات من امن منھم باللہ والیوم الاخر قال ومن کفر فامتعہ قلیلا ثم اضطرہ الی عذاب النار وبئس المصیر۔ واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔ ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک و ارنا مناسکنا و تب

اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرجع اور امن بنایا اور (کہا کہ) ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم و اسماعیل سے عہد لیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف اور قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کیلئے پاک کرو اور یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ میرے پروردگار اس کو امن والا شہر بنا' اور اس کے بسنے والوں کو کچھ پھلوں کی روزی دے' جو ان میں سے خدا اور پچھلے دن پر ایمان لائے' خدا نے کہا اور جس نے انکار کیا' اس کو تھوڑا فائدہ پہنچاؤں گا' پھر اس کو دوزخ کے عذاب کے حوالہ کر دوں گا اور وہ کتنی بری بازگشت ہے اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (اور یہ دعا مانگ رہے تھے کہ) ہمارے رب (ہماری تعمیر کو) ہم سے قبول فرما' بیشک تو ہی سننے والا اور

(۱)۔ مولانا حمید الدین صاحب نے اپنی تصنیف الامعان فی اقسام القرآن میں اس قسم کے اشعار جمع کر دئیے ہیں (۲)۔ کتاب

علیناج انك انت التواب الرحیم۔ ربنا وابعث فیہم رسولا منہم یتلوا علیہم ایتك ویعلمہم الکتب والحکمہت ویز کیہمط انك انت العزیز الحکیم۔ ومن یرغب عن ملہت ابراھیم الا من سفہ نفسہط ولقد اصطفینہ فی الدنیا وانہ فی الاخرہت لمن الصالحین۔ اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العلمینط (بقرہ:۱۲۵،۱۲۶)

جاننے والا ہے اے ہمارے رب اور ہم کو اپنا ایک تابعدار (مسلم) فرقہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے ارکان بتا اور ہم پر اپنی رحمت رجوع کر (ہماری توبہ قبول کر) تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم والا ہے، اے ہمارے رب ان میں انہیں میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیج جو ان کو تیری آیتیں بتائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک وصاف بنائے بیشک تو غالب اور دانا ہے اور ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیرے گا، بجز اس کے جو اپنے آپ کو نادان بنائے حالانکہ ہم نے اس کو (ابراہیم کو) دنیا میں چنا اور آخرت میں نیکوکاروں میں سے ہوگا، یاد کرو جب اس نے اس سے کہا کہ (تابعدار مسلم) بن جا اس نے کہا کہ عالم کے پروردگار کا میں تابعدار (مسلم) بن گیا۔

واذ بوانا لابراھیم مکان البیت ان لا تشرك بی شیئاط وطہر بیتی للطائفین والقائمین والرکع

السجود واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیقط لیشهدوا منافع لهم ویذکروا اسم الله فی ایام معلومت علی ما رزقهم من بهیمهت الانعامج فکلوا منهها واطعموا البائس الفقیر۔ ثم لیقضوا تفثهم ولیوفوا نذورهم ولیطوفوا بالبیت العتیقط ذلك ومن یعظم حرمت الله فهو خیر له عند ربهط (حج:۳)

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لیئے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا کہ کسی کو میرا ساجھی نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف' قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیئے پاک کر' اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے' وہ تیرے پاس پیادہ اور (دور کے سفر سے تھکی ماندی) دبلی سواریوں پر ہر دور دراز راستہ سے آئیں گے' تا کہ وہ اپنے نفع کی جگہوں پر حاضر ہوں اور ہم نے ان کو جو چوپائے جانور روزی دیئے ہیں ان پر ان (کی قربانی) پر چند جانے ہوئے دنوں میں خدا کا نام لیں' تو ان میں سے کچھ تم کھاؤ اور بدحال فقیر کو کھلاؤ اس کے بعد اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی منتیں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا چکر لگائیں' یہ سن چکے اور جو کوئی اللہ کے اداب کی بڑائی رکھے تو وہ اس کے لیئے اس کے رب کے پاس بہتر ہے۔

واذ قال ابراهیم رب اجعل هذا بلدا منا واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام۔ رب انهن اضللن کثیرا من الناس فمن تبعنی فانه منی ومن عصانی فانك غفور

رحیم۔

اور یاد کرو جب ابراہیم نے یہ دعا کی' اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنا' اور مجھ کو میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا' میرے پروردگار ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے تو جو میری پیروی کرے گا' وہ مجھ سے ہو گا اور جو میری نافرمانی کرے گا تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔

ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوہت فاجعل افئدہت من الناس تہوی الیہم وارزقہم من الثمرات لعلہم یشکرون۔ ربنا انک تعلم مانخفی وما نعلنط وما یخفی علی اللہ من شی ء فی الارض ولا فی السماء۔(ابراہیم:۲)

اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی کچھ اولاد کو اس بن کھیتی کی ترائی میں تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے' اے ہمارے پروردگار یہ اس لیئے تا کہ تیری نماز کھڑی کریں تو جو کچھ لوگوں کے دلوں کو ایسا بنا کہ وہ ان کی طرف مائل ہوں اور ان کو کچھ پھلوں کی روزی دے' تا کہ یہ تیرے شکرگزار رہیں۔ اے ہمارے پروردگار تجھے معلوم ہے جو ہم چھپائیں اور ظاہر کریں اور اللہ سے زمین میں اور نہ آسمان میں کچھ چھپا ہے۔

قل صدق اللہ فاتبعوا ملہت ابراھیم حنیفا وما کان من المشرکین ان اول بیت وضع للناس للذی

ببکہ مبارکا وھدی للعلمین۔ فیہ ایت بینت مقام ابراھیم ومن دخلہ کان امنا ط واللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا ط ومن کفر فان اللہ غنی عن العلمین۔(آل عمران:۹۰)

کہہ کہ خدا نے سچ فرمایا تو ابراہیم کے دین کی پیروی کر شرک سے منہ موڑ کر اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا بے شک وہ پہلا گھر جو لوگوں کیلئے بنایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے بابرکت اور دنیا کیلئے راہنما اس میں کچھ کھلی ہوئی نشانیاں ہیں ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ اور جو اس میں داخل ہوا وہ امن پا جائے اور خدا کا لوگوں پر اس گھر کا قصد کرنا فرض ہے جس کو اس کے راستہ (سفر) کی طاقت ہو اور جو (اس قدرت کے باوجود) اس سے باز رہے تو خدا دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

یہ وہ آیتیں ہیں جن کا تعلق اس موضوع سے ہے ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیم کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکوں سے ہٹا کر جن میں وہ سرگرداں اور آوارہ پھر رہے تھے اور ایک امن کے سنسان مقام کی تلاش میں تھے تا کہ وہ خدائے واحد کی پرستش کے لیئے ایک گھر بنائیں یہ ٹھکانا عنایت کیا جو ازل سے اس کام کے لیئے منتخب تھا تا کہ وہ یہاں خدا کے گھر کی منہدم چار دیواری کو کھڑی کریں اور پھر اس کو توحید کا مرکز اور عبادت گزاروں کا مسکن بنائیں۔

یہ مقام ویران اور پیداوار سے خالی تھا اس لیئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی کہ خداوندا یہاں تیرے مقدس گھر کے پڑوس میں اپنی کچھ اولاد بساتا ہوں ان کو روزی

پہنچانا' اور لوگوں کے دلوں کو مائل کرنا وہ ادھر آتے رہیں' اور ان کو اس لیئے یہاں بساتا ہوں تا کہ وہ آس پاس کی بت پرست قوموں کی بت پرستی سے بچے رہیں' اور تیری خالص عبادت بجالائیں ان میں جو نیکوکار ہوں وہ میرے ہیں' اور جو بدکار اور گمراہ ہوں ان کا تو مالک ہے تو رحم والا اور معاف کرنے والا ہے' اور خداوندا! میری اولاد میں ایک رسول بھیجنا' جو ان کو نیک تعلیم دے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس مقام اور اس گھر میں حضرت ابراہیمؑ کی بہت سی یادگار نشانیاں ہیں اور ان کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ اور قربانی کا مقام ہے اس لیئے لوگوں کو چاہئے کہ دور دور سے یہاں آئیں اور اپنے دینی اور دنیاوی فائدوں کو حاصل کریں اور اس قدیم خانہ خدا کا طواف کریں' اور یہاں اسماعیلؑ کی یادگار میں قربانی کر کے غریبوں کو کھلائیں' اپنی نذر پوری کریں اور اس حالت میں وہ امن وسلامتی کے مجسم پیکر ہوں نہ وہ کسی پر ہتھیار اٹھا سکتے ہوں' نہ ایک چیونٹی تک کو مار سکتے ہوں' اور وہ اس حالت میں ظاہری زیبائش و آرائش اور عیش و آرام اور پرتکلف مصنوعی زندگی سے بھی پاک ہوں اور چند روز یہاں ابراہیمی یادگاروں پر ٹھہر ٹھہر کر ابراہیمی زندگی بسر کر کے ابراہیمی طریقہ خدا کو یاد کریں۔

اوپر توراہ کے حوالوں سے گزر چکا ہے کہ ابراہیم اور ان کی اولاد کا دستور تھا کہ وہ جہاں کہیں کوئی ربانی کرشمہ دیکھتے تھے تمدن کے ابتدائی عہد میں کسی بڑی تعمیر کے بجائے وہ بن گھڑے پتھر کو کھڑا کر کے خدا کا گھر بنا لیتے' وہاں قربانی گزارتے اور خدا کی عبادت کرتے تھے جو شخص نذر کیا جاتا تھا وہ اتنے دنوں تک سر نہیں منڈاتا تھا نذر پوری کر لینے کے بعد وہ سر پر استرا لگاتا تھا' پھر جہاں یہ مذکور ہے کہ اس گھر کی چھت پر نہ چڑھنا کہ تیری برہنگی نہ ظاہر ہو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بن سلا کپڑا پہنتے تھے اور کمر میں تہ بند باندھتے تھے توراہ کے فارسی اقتباس میں جو نقل ہوا ہے مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ کی قربانی

کے لیئے آواز دی تو حضرت ابراہیمؑ نے جواب میں ''لبیک'' کہا اور اردو میں ہے کہ ''میں حاضر ہوں'' کہا یہی صدا لبیک اللھم لبیک اسلامی حج میں اٹھتے بیٹھتے لگائی جاتی ہے۔

یہ بھی گزر چکا ہے کہ جس کو نذر یا قربانی کرتے تھے اس کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھراتے تھے یا نثار کرتے تھے حج میں یہ طواف کہلاتا ہے' غرض انہی سب ابراہیمی مراسم کے مجموعہ کا نام اسلام میں ''حج'' ہے۔

حج کی حقیقت::

ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں حاضری حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس معائدہ کو عبودیت کے اظہار کو کسی طرح بجالانا جس طرح وہ ہزاروں برس پہلے بجالائے اور خدا کی نوازشوں اور برکتوں سے مالا مال ہوئے' یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے' یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کر کے ظاہر کرتے ہیں' تمدن کے اس ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں وہ خود اپنے کو حضرت اسماعیلؑ کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں اس لیئے اتنے دنوں تک سر کے بال نہ منڈواتے نہ ترشواتے ہیں۔ دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں اور نہ خوشبو لگاتے ہیں اور نہ رنگین کپڑے پہنتے ہیں نہ سر چھپاتے ہیں اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ تین دن کے سفر کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے اور دوڑے ہوئے خدا کے گھر میں آتے تھے اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خدا

کی پکار پر لبیک کہا تھا' وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کی زبانوں پر ہوتا ہے:

لبیک اللھم لبیک۔ لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد و النعمت لک و الملک لا شریک لک۔

(صحیح مسلم)

میں حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں' میں حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں سب خوبیاں اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں اور سلطنت تیری ہی ہے' تیرا کوئی شریک نہیں۔

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ اور یہ توحید کی صدا ان تمام مقامات اور حدود میں بلند کرتے پھرتے ہیں' جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پڑے تھے اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربان گاہ پر نذر کرنے چلتے ہیں اس لیئے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت اللہ کے چاروں طرف پھیرا کر تصدیق کرتے ہیں پھر جہاں سے جہاں تک وہ صفاء سے مروہ تک حضرت ابراہیم دوڑ کر گئے تھے پھر مردہ پہنچ کر بیٹے کی قربانی کریں گے وہاں ہم دوڑتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اور گناہوں کی بخشائش چاہتے ہیں اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر اپنی تمام گذشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں خدا کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں روتے ہیں قصور معاف کراتے ہیں اور آئندہ زندگی کیلئے خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت' بندگی اور اطاعت کا نیا عہدو پیمان باندھتے ہیں اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن (۱)۔ ہے یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد ان بزرگوں کے نقش قدم اور ان کی دعا کے مقامات اور تجلیات ربانی کے مناظر دور دراز کے سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد اکثروں کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع اور جذبہ میں سرشار ایک بے آب و گیاہ اور خشک میدان اور جلے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اکٹھے ہو کر دعائے مغفرت کی پکار گذشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا

ماتم اپنی بدکاریوں کا اقرار اور پھر احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ تک بہت سے انبیاء اسی حالت اور اسی صورت میں اور یہیں پھر کھڑے ہو کر' ایسا روحانی منظر ایسا کیف اثر' ایسا گداز ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی پھر اپنی نذر کے دن پورے کر کے اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیمؑ کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں' جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں اور اس وقت اسی اطاعت اور اسی فدویت اسی سرفروشی اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں جو کبھی اس میدان میں اسی موقع پر اور اسی حالت میں اور اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی اور وہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں اور ان کی زبانوں سے حضرت ابراہیمؑ کے ہی الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ (صحیح مسلم کتاب الحج)

انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما ان من المشرکین۔ (انعام: ۹)

میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کی طرف منہ کیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا' موحد بن کر اور میں ان میں نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں۔

ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین۔ لا شریك لہ وبذلك امرت وانا اول المسلمین۔ (انعام: ۴)

میری نماز اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کیلئے ہے جو تمام دنیا کے پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے اور میں سب سے پہلے فرمانبرداری (اسلام) کا اقرار

کرتا ہوں۔

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم اور ارکان ہیں۔

(۱)۔ ترمذی کتاب الحج باب ما جاء من ادرك الامام و يجمع فقد ادرك الحج۔

حج کی اصلاحات::

حج کی فرضیت دوسری عبادات سے بالکل مختلف تھی عام اہل عرب نماز کے اوقات ارکان اور خصوصیات سے عملاً نابلد تھے اس لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو تعلیم دی اور بتدریج ان کو ترقی دی' زکوۃ ان میں سرے سے موجود نہ تھی اس لیئے عام صدقہ اور خیرات کے آغاز سے زکوۃ کی عملی فرضیت تک متعدد منزلیں طے کرنا پڑیں' روزہ نے بھی یوم عاشورہ سے لے کر رمضان تک مختلف قالب بدلے لیکن حج عرب کا ایک ایسا عام شعار تھا جس کے تمام اصول و ارکان پہلے سے موجود تھے' صرف ان کا محل اور طریقہ استعمال بدل گیا تھا' یا ان میں بعض مشرکانہ رسوم داخل ہو گئی تھیں' اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے بیک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا۔

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ ہر عبادت کی اصلی غرض ذکر الٰہی' طلب مغفرت اور اعلائے کلمتہ اللہ ہے' لیکن اہل عرب نے حج کو ذاتی و خاندانی نام و نمود کا ذریعہ بنا لیا تھا' چنانچہ جب تمام مناسک حج سے فارغ ہو چکے تھے تو تمام قبائل منیٰ میں آ کر قیام کرتے تھے' مفاخرت عرب کا ایک قومی خاصہ تھا اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لیئے کوئی موقع نہیں ہو سکتا تھا اس بناء پر ہر قبیلہ ذکر الٰہی کی جگہ اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

فاذكروا الله كذكركم اباء كم او اشد ذكرا۔

(بقرہ:۳۵)

جس طرح اپنے باپ دادوں کا ذکر کرتے ہو اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ خدا کی یاد کرو۔

۲۔قربانی کرتے تھے تو اس کے خون کو خانہ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے کہ خدا سے تقرب حاصل ہو جائے یہود میں بھی یہ رسم تھی کہ قربانی کے خون کا چھینٹا قربان گاہ پر دیتے تھے اور قربانی کا گوشت جلا دیتے تھے۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ یہ دونوں باتیں مٹا دی گئیں اور یہ آیت اتری:

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماء ھا ولکن ینالہ التقوی منکم۔ (حج:۵)

خدا کے پاس قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا اس کے پاس صرف تمہارا تقوی پہنچتا ہے۔

اور آگے چل کر یہ بھی بتا دیا کہ قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبوں کی ضیافت کی جائے اور اس جشن ابراہیمی کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے۔

۳۔اہل یمن کا دستور تھا کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تو زاد راہ لے کر نہیں چلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہیں' نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مکہ میں پہنچتے تھے تو بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی:(۱)۔

وتزودوا فان خیر الزاد التقوی۔ (بقرہ:۲۵)

زاد راہ ساتھ لے کر چلو' کیونکہ بہترین زاد راہ پرہیز گاری ہے۔

(۱)۔ بخاری جلد ۱ ص ۲۰۶ کتاب الحج

۴۔قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل میں جو امتیازات قائم کر لیئے تھے ان کی بناء پر قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے اس غرض سے خانہ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار

کر رکھ دیتے (۳)۔ تھے ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حسبۃ للہ کپڑا تقسیم کیا جاتا تھا اور مرد مردوں کو عورتیں عورتوں کو خاص طواف کے لیئے کپڑا مستعار دیتی تھیں اور وہ لوگ اسی کپڑے میں طواف کرتے تھے لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے ان کو برہنہ طواف کرنا تھا (۴)۔ اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعاً موقوف کر دیا اور یہ آیت اتری:

خذوا زینتکم عند کل مسجد (اعراف:۳)

ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔

اور ۹ھ کے موسم حج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو اس اعلان کے لیئے بھیجا کہ آئندہ کوئی ننگے ہو کر طواف نہ کرنے پائے' چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا اور اس وقت یہ رسم (۵)۔ اٹھ گئی۔

۵۔ قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اور تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے لیکن وہ خود حدود حرم کے اندر سے باہر نکلنا اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے اس لیئے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے' اس نے قریش کے اس امتیاز کا خاتمہ کر دیا' چنانچہ یہ آیت اتری (۶)۔:

ثم افیضوا من حیث افاض الناس (بقرہ:۲۵)

کوچ وہیں سے کرو جہاں سے تمام لوگ کرتے ہیں۔

۶۔ صفا اور مروہ کے درمیان جو وادی سے تیزی کے ساتھ دوڑ کر گزرتے تھے اور یہ ایک مذہبی سنت قرار پا گئی تھی' لیکن اسلام نے اس کو کوئی سنت قرار نہیں دیا۔ (۷)۔ یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

۷۔ جاہلیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی ورنہ اس نے حقیقت ایک بڑے میلہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس میں ہر طرف سے ہر قماش

کے لوگ جمع ہوتے تھے اور وہ سب کچھ ہوتا تھا جو میلوں میں ہوتا ہے' شور وغل ہوتا تھا' دنگا فساد ہوتا تھا' عورتوں سے چھیڑ خانی ہوتی تھی' غرض فسق وفجور کا ہر تماشہ وہاں ہوتا تھا' اسلام آیا تو اس نے یک لخت ان باتوں کو بند کر دیا اور حج کو تقدس' تورع' نیکی اور ذکر الٰہی کا سرتاپا مرقع بنا دیا حکم آیا:

فمن فوض فیھن الحج فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج وما تفعلوا من خیر یعلمہ اللہ۔ (بقرہ:۲۵)

پھر جس نے ان مہینوں میں حج کی نیت کی تو پھر حج میں عورت سے نہ چھیڑ چھاڑ ہے نہ فحاشی ہے نہ لڑائی دنگا ہے اور تم جو نیکی کرو گے اللہ کو معلوم ہو گی۔

۸۔ مناسک حج کے بعد جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے' ان میں دو گروہ ہو گئے تھے ایک کہتا تھا کہ جو لوگ ایام تشریق ہی میں واپس آتے ہیں' وہ گنہگار ہیں' دوسرا ان لوگوں کو الزام لگاتا تھا' جو دیر میں واپس ہوتے تھے' چونکہ ان میں درحقیقت کوئی گروہ گنہگار نہ تھا' اس لیئے قرآن مجید نے دونوں کو جائز رکھا۔

(۱)۔ طبقات ابن سعد تذکرہ حضرت حمزہ سید الشہدا (۲)۔ بخاری جلد ۱ ص ۲۲۶ کتاب الحج (۳)۔ بخاری جلد اول ص ۲۰۶ (٤)۔ بخاری جلد اول ص ۲۲۶ کتاب الحج (٥)۔ بخاری کتاب الحج باب لایطوف عریان (٦)۔ بخاری کتاب الحج' جلد اول ص ۲۲۶ (۷)۔ بخاری جلد اول ص ٥٤۳۔

فمن تعجل فی یومین فلا اثم علیہ و من تاخر فلا اثم علیہ لمن اتقی۔ (بقرہ:۲۵)

جو شخص عجلت کر کے ایام تشریف کے دو ہی دنوں میں واپس آیا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور جس نے دیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ اس نے تقوی اختیار کیا۔

۹۔ ایک خاموش حج ایجاد کر لیا تھا' یعنی حج کا احرام باندھتے تھے' تو چپ رہتے تھے

چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وجہ پوچھی، معلوم ہوا کہ اس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے انہوں نے اس کو منع کیا اور کہا کہ یہ جاہلیت کا کام (۱)۔ ہے۔

۱۰۔ خانہ کعبہ تک پیادہ پا جانے کی نذر کرتے تھے اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بڈھے کو دیکھا، کہ اپنے دو بیٹوں کے سہارے پیادہ پا جا رہا ہے وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس نے پیادہ پا چلنے کی نذر مانی ہے، ارشاد ہوا کہ خدا اس سے بے نیاز ہے کہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو سواری پر جانے کا حکم (۲)۔ دیا۔ اسی طرح عورتیں خانہ کعبہ تک کھلے سر اور برہنہ پا جانے کی نذر مانتی تھیں، آپ ﷺ نے ایک بار اسی قسم کی عورت کو دیکھا تو فرمایا کہ ''خدا اس پریشان حالی کا کوئی معاوضہ نہ دے گا اس کو سوار ہونا اور دوپٹہ اوڑھنا چاہئے۔ (۳)۔'' اسی سبب سے قربانی کے لیئے گھر سے جانور لاتے تھے اس پر صرف اس خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے سوار نہیں ہوتے تھے، چنانچہ ایک بار آپ ﷺ نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہانکتے ہوئے لے جا رہا ہے فرمایا کہ اس پر سوار ہو لو، اس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے تین بار اس کو اونٹ پر سوار ہونے کی تاکید کی۔ (۴)۔

۱۱۔ انصار حج کر کے واپس آتے تھے تو دروازے کی راہ سے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے، بلکہ پچھواڑے سے کود کر آتے تھے اور اس کو کار ثواب سمجھتے تھے، چنانچہ ایک شخص حج کر کے آیا اور دستور کے خلاف دروازے سے گھس آیا، تو لوگوں نے اس کو بڑی لعنت ملامت کیا اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی:

لیس البر بان تاتوا البیوت من ظھورھا ولکن البر من اتقی واتوا البیوت من ابوابھا۔ (بقرہ: ۲۴)

گھر کے پچھواڑے سے آنا کوئی نیکی نہیں ہے نیکی صرف اس

کی ہے جس نے تقوی حاصل کیا اور گھروں میں دروازے کی راہ سے آؤ۔

۱۲۔ بعض لوگ طواف کرتے تھے تو اپنے گنہگار اور مجرم ہونے کی حیثیت کو مختلف نامناسب طریقوں سے ظاہر کرتے تھے کچھ لوگ ناک میں نکیل ڈال لیتے تھے اور اس کو پکڑ کر ایک شخص کھینچتا پھرتا تھا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اسی طریقہ سے طواف کر رہا ہے تو اس کی نکیل کٹوا دی (۶)۔' اسی طرح آپ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے رسی سے اپنا ہاتھ ایک شخص سے باندھ دیا ہے اور وہ اس کو طواف کرا رہا ہے' آپ ﷺ نے رسی کاٹ دی اور فرمایا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف (۷)۔ کراؤ' ایک بار

(۱)۔ بخاری جلد ۱ ص ۵۴۱ (۲)۔ ترمذی کتاب النذور والایمان باب فی من یحلف بانمشی ولا یستطیع (۳)۔ ترمذی کتاب النذور والایمان (۴)۔ بخاری جلد ۱ ص ۲۲۹ کتاب الحج (۵)۔ ایضاً ص ۲۴۲ (۶)۔ نسائی کتاب الحج ص ۴۶۱ باب الکلام فی الطواف (۷)۔ بخاری کتاب الحج باب الکلام فی الطواف

آپ ؐ نے دیکھا کہ دو شخص ایک رسی میں جڑے ہوئے ہیں' وجہ پوچھی تو دونوں نے کہا کہ ہم نے یہ نذر مانی ہے کہ اسی طرح جڑے ہوئے خانہ کعبہ کا حج کریں گے۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ اس شکنجے کو دور کرو یہ نذر نہیں ہے نذر وہ ہے جس سے خدا کی ذات مقصود ہو۔ (۵)۔

۱۳۔ اہل عرب ایام حج میں عمرہ نہیں کرتے تھے' کہتے تھے کہ جب سواریاں حج سے واپس آ جائیں اور ان کی پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں' اس وقت عمرہ جائز ہو سکتا ہے' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاص ایام حج میں عمرہ کیا اور عملاً اس بے ضرورت رسم کو مٹا دیا۔ (۶)۔

۱۴۔ جاہلیت کے زمانہ میں کچھ لوگ تو حج کی نیت کرتے تھے اور وہ ان دنوں تجارت نہیں کرتے تھے اور اس کو طریقہ حج کے خلاف سمجھتے تھے اس لیئے اکثر لوگ جو

صرف تجارت اور بیو پار کے لیئے آتے تھے وہ حج میں شریک نہیں ہوتے تھے' بلکہ وہ صرف میلہ کی خاطر جمع ہوتے تھے ان کو حج سے سروکار نہ تھا' عکاظ اور ذوالمجاز وغیرہ بازاروں میں جمع ہو کر صرف تجارت اور بیو پار کرتے تھے اسلام آیا تو یہ دونوں طریقے الگ الگ جاری تھے اس کا نقصان یہ تھا کہ حاجی تجارت کے منافع سے محروم رہتے تھے اور غیر حاجیوں کا جو مجمع ہوتا تھا وہ صرف تماشائیوں کی بھیڑ ہوتی تھی' بازاری مقصد سے لوگ ہوتے تھے جن میں ہر قسم کی برائیاں جاری ہوتی تھیں' اسلام نے اس تفریق کو مٹا دیا اور کہہ دیا کہ تجارت اور بیو پار کے تقدس و حرمت کے خلاف نہیں اس لیئے یہ دونوں فریضے ایک ساتھ ادا ہو سکتے ہیں' فرمایا (۷)۔

لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکم۔

(بقرہ: ۲۵)

تمہارے لیئے یہ گناہ نہیں کہ (حج) کے زمانہ میں فضل الٰہی (تجارت) کی تلاش کرو۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو اس موقع پر جمع ہوتا تھا حج کی نیت سے جمع ہوتا تھا اس سے جاہلیت کے زمانہ کے اجتماعی مفاسد کا خاتمہ ہو گیا' اور ساتھ ہی اس اجتماع کے جائز تجارتی مشاغل کی ترقی ہو گئی۔

۱۵۔ صفاء و مروہ کے طواف کے متعلق پہلے ہی دو گروہ پیدا ہو چکے تھے انصار مناٰہ کا احرام باندھتے تھے جو مشلل میں قائم کیا گیا تھا اور طواف نہیں کرتے تھے ان کے علاوہ تمام عرب صفاء و مروہ کا طواف کرتے تھے خدا نے جب پہلے خانہ کعبہ کے طواف کا حکم دیا تھا اور صفاء و مروہ کے متعلق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تو آخر الذکر گروہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ یہ کوئی ناجائز فعل ہے؟ انصار نے بھی اس کے متعلق استفسار کیا اس پر یہ آیت نازل (۴)۔ ہوئی:

---

(۱)۔ فتح الباری جلد ۳ ص ۳۸۶ (۲)۔ صحیح بخاری باب ایام الجاھلیہ (۳)۔ اس آیت کے شان نزول میں روایتیں مختلف ہیں کچھ

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب حج میں تجارت کرنا برا جانتے تھے اس لئے یہ آیت اتری۔ دوسری روایتوں میں ہے کہ اہل عرب ان دنوں تجارت کرتے تھے اسلام جب آیا تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ اب حج خالص خدا کیلئے ہو گیا' اس لئے اب اس میں تجارت مناسب نہیں یہ آیت اس خیال کی تردید کیلئے اتری لیکن تمام روایتوں کو جمع کرنے سے وہ حقیقت معلوم ہوتی ہے جو اوپر متن کتاب میں لکھی گئی ہے اور روایتوں کے جمع کرنے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے (دیکھو تفسیر طبری و اسباب النزول واحدی میں آیت مذکورہ) (٤)۔ صحیح بخاری کتاب الحج جلد اول ص ۲۲۳۔

ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بھما۔

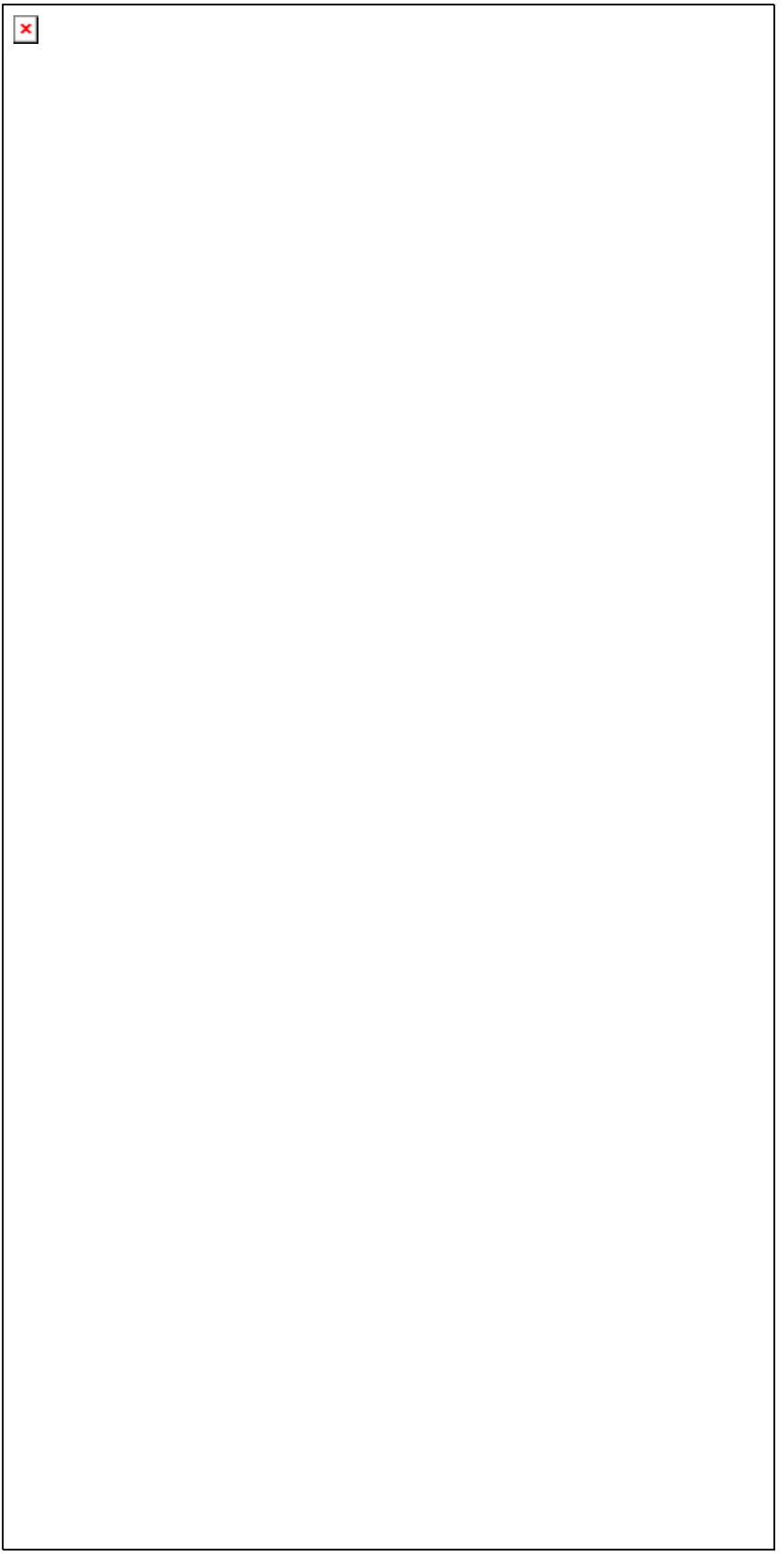
(بقرہ: ۱۹)

صفاء اور مروہ خدا کا شعار ہیں پس جو شخص حج یا عمرہ کرے اس کیلئے ان دونوں کا پھیرا لگانا گناہ نہیں ہے۔

حج کے ارکان::

اب اصلاح' ترمیم و اضافہ کے بعد حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی ان کی تفصیل اور ان کی مشروعیت کی مصلحتیں حسب ذیل ہیں:

احرام: تمام اعمال اگر چہ نیت پر مبنی ہوتے ہیں لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہو سکتا نماز کے لیئے تکبیر اسی نیت کا اعلان ہے احرام بھی حج کی تکبیر ہے احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آ جاتا ہے اس لیئے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو دنیوی عیش و نشاط زیب و زینت اور تفریح طبع کا ذریعہ تھیں' وہ شکار نہیں کر سکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کے لیئے کسی جاندار کی جان لینا بہر حال خود غرضی ہے بی بی سے متمتع نہیں ہو سکتا کہ یہ نفسانی و شہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ و



اور اس پرانے گھر کا طواف کریں۔

حجر اسود کا استلام حجر اسود کے لفظی معنی ''کالے پتھر'' کے ہیں' یہ کالے رنگ کا ایک پتھر ہے جو خانہ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قدم آدم بلند لگا دیا گیا ہے' خانہ کعبہ بیسیوں دفعہ گرا اور بنا' کبھی سیلاب میں بہہ گیا' اور کبھی آگ میں جل گیا' اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں پڑی تھی ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں' مگر اس عہد عتیق کی یادگار صرف یہی ایک پتھر رہ گیا تھا جس کو اہل عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا' اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے (الا یہ کہ ۳۱۷ھ میں باطنیہ اس کو کچھ دنوں کیلئے نکال کر لے گئے' اور پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں بیت المقدس سامنے پڑے گا' اور اسی لیئے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کیلئے وہ ایک نشان کا کام دے' ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں' سینہ سے بھی لگا سکتے ہیں' ہاتھ یا کسی لکڑی یا اور کسی چیز سے چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں یہ نہ سہی تو اس کی طرف صرف اشارہ بھی کر کے قناعت کر سکتے ہیں' یہ پتھر کہنے کیلئے تو ایک معمولی پتھر ہے مگر ایک مشتاق زیارت کی نگاہ میں اس تخیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی' شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی' مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کے مقدس لب' یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہیں' اور پھر تمام خلفائے راشدینؓ صحابہ کرامؓ آئمہ اعلام' اکابرؒ اسلام اور حکمائے عظام کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا تھا اور آج ہمارے گنہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں' ہمارے دلوں اور آنکھوں میں تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا کر دیتا ہے اور

باایں ہمہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پتھر ہے جس میں کوئی قدرت نہیں اور جیسا کہ بادۂ توحید کے ایک ہشیار متوالے (۱)۔ نے اس کو چوم کر کہا۔ ''اے کالے پتھر میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے' نہ تو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان' لیکن میں اس لیئے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا (۱)۔ ہے' الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہیں' بلکہ اس محبت کا نتیجہ ہے جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی روحانی اولاد کو ہے' ورنہ اگر کوئی نہ اسے چھوئے اور نہ بوسہ دے نہ اشارہ کرے تو اس سے اس کے ادائے حج میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا ::

صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں ہیں جو اب برائے نام رہ گئی ہیں' تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہیں' صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنی سواری کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسماعیلؑ کو لے کر آگے بڑھے تھے اور مروہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کرنی چاہی اور آخر منادی غیب کی آواز سے رک گئے اور اسماعیلؑ کی جگہ پر مینڈھا قربانی کیا' بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ہاجرہؑ حضرت اسماعیلؑ کو

---

(۱)۔ یعنی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ (۲)۔ مسلم و ترمذی و مستدرک وغیرہ باب الاستلام۔

لے کر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ہاجرہؑ صفا و مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں اور آخر زم زم کا چشمہ ان کو نظر آیا' یہ صفا و مروہ کی سعی انہیں کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے' بہر حال حج میں پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہیں پھر اس سے اتر کر دعائیں مانگتے ہوئے مروہ پر آتے ہیں وہاں بھی دعائیں مانگتے ہیں

کہ یہ دونوں وہ مقامات ہیں جہاں ربانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیمؑ اور ہاجرہؑ کو نظر آئے :

ان الصفا و المروہ من شعائر اللہ فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیہ ان یطوف بھما (بقرہ: ۱۹)

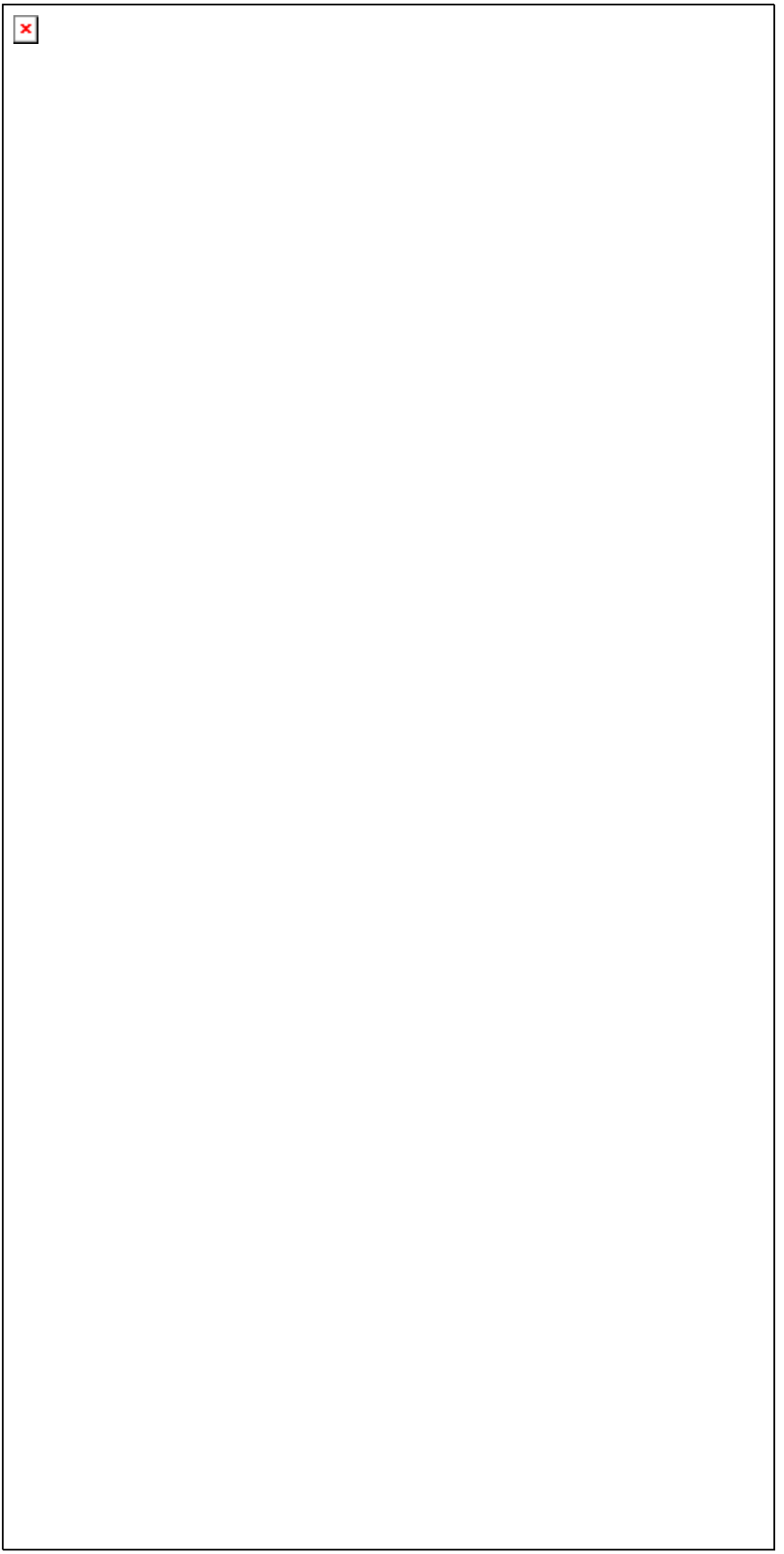
بے شک صفا مروہ خدا کا شعار ہیں' تو جو خانہ کعبہ کا حج کرے یا عمرہ کرے' اس کا اس پر پھیرے لگانا' گناہ نہیں۔

وقوف عرفہ::

عرفات میں نویں ذوالحجہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوال کے بعد سے غروب تک یہاں دعا اور خدا کی حمد میں مصروف رہنا پڑتا ہے اور اصل حج اسی کا نام ہے' یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں' یہیں ''جبل رحمت'' کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبہ عام دیتا ہے اور ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روز حشر کی یاد دلاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ سورہ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے یہ اجتماع اور اس کا بے نظیر مموثر منظر دلوں میں مغفرت اور رحمت الٰہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے ہر شخص کو دائیں' بائیں' آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہ جاتی ہے۔

قیام مزدلفہ::

حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے' عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے تھے' اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہ راست چلے جاتے تو راستہ کی خستگی



جاہلیت میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر فخاری کیا کرتے تھے جو اکثر لڑائی بھڑائی کی صورت اختیار کر لیتی تھی اس بیہودہ رسم کے روکنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ بجائے اس کے خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کی مفاخرت کے بجائے مسلمانوں کے باہم تعارف، محبت، مساوات اور یکجہتی کا مقام قرار دیا جائے فرمایا:

واذکروا اللہ فی ایام معدودت (بقرہ: ۲۵)

خدا کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو۔

قربانی::

یہ حضرت اسماعیلؑ کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے جس میں لوگ ایک دوسرے کو دوست احباب کو اور فقراء اور مساکین کو کھانا کھلائیں۔

ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومت علی ما رزقھم من بھیمت الانعام فکلوا منھا و اطعموا البائس الفقیر (حج: ۴)

اور مقررہ دنوں میں خدا کا نام اس پر لیا جائے جو جانور خدا نے روزی میں دیا تو اس میں سے کچھ خود کھا اور مصیبت کے مارے فقیر کو کھلاؤ۔

اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھ لیں کہ یہ بھی ذاتی ایثار کی تمثیل ہے۔

فمن تمتع بالعمرہ الی الحج فما استیسر من الھدی فمن لم یجد فصیام ثلثہ ایام فی الحج و سبعہ اذا رجعتم (بقرہ: ۲۴)

تو جو عمرہ اور حج دونوں کا ساتھ فائدہ اٹھائے تو جو قربانی اس سے ممکن ہو وہ کرے جس کو یہ بھی میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے حج میں اور سات دن واپس ہو کر۔

حق راس::

منٰی میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں' یہ اس پرانی رسم کی تعمیل ہے کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے' ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈوا دیئے جاتے تھے۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے اس لئے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی۔

محلقین رء وسکم و مقصرین (فتح: ۴)

اپنے سروں کو منڈا کر یا بال ترشوا کر۔

ولا تحلقو رء وسکم حتی یبلغ الھدی محلہ (بقرہ: ۲۴)

اور اپنے سر نہ منڈاؤ' جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے۔

(۱)۔ تورات قاضی ۱۳۔ ۵ گنتی ۶۔ ۵ (۲)۔ سعد جز ثانی قسم اول ص ۳۷ و سیرہ ابن ھشام بیر معونہ۔ واقعہ عمرو ابن امیہ و جز ناصیتہ واعتقہ۔

رمی جمار::

منٰی ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں' کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو قربانی کے لئے لے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر

ان کے دل میں وسوسہ ڈالا' انہوں نے اس کا یہاں رجم کہا' جس کے لفظی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا اور اس لئے شیطان کو "رجیم" یعنی کنکری مارا گیا کہتے ہیں۔ صاحب نظام القرآن کا نظریہ ہے کہ ابرہہ کے لشکر نے مکہ پر جب چڑھائی کی تھی تو چند غدار ثقفی عربوں نے اس کی رہنمائی کی' باقی عربوں نے اس ناگہانی حملہ کا بدویانہ سنگ اندازی سے مقابلہ کیا' جس کا ذکر سورہ فیل کی آیت ترمیھم بحجارۃ من سجیل میں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کو تباہ کیا' اور وہ غدار بھی ہلاک ہوئے' یہ کنکریوں کا پھینکنا اسی ترمیھم کی سنگ باری کی یادگار ہے' خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو... ان ستونوں پر پھینکتے ہیں اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں' چونکہ کنکری مارنا یا پھینکنا بظاہر ایک بیکار کام معلوم ہوتا ہے اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس کی تصریح فرمادی کہ اس کنکری پھینکنے سے مقصود اس بہانہ سے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں (۱)۔ ہے' قرآن پاک نے بھی اس حقیقت کی طرف اپنے الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

فاذا قضیتم مناسککم فاذکروا اللہ کذکرکم اباء کم او اشد ذکرا (بقرہ: ۲۵

جب سب ارکان ادا کر چکو تو اپنے باپ دادوں کو جیسے یاد کرتے ہیں ویسے ہی خدا کو یاد کر اس سے بڑھ کر۔

اسی رمی جمار پر مراسم حج کا خاتمہ ہوتا ہے۔

ان رسومات کی غایت::

اوپر کی تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پرانے عہد کے طریق عبادت کی یادگار ہیں جس کا باقی رہنا اس لئے ضروری ہے تاکہ انسانیت کے روحانی دور ترقی کا عہد آغاز ہماری نگاہوں کے سامنے ہمیشہ قائم رہے اور ہمارے جذبات و

احساس کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہیں اور خدا کی یاد اپنے گناہوں کی مغفرت اور آئندہ اپنی نیک زندگی گزارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیوں میں جوڑ پیدا کر کے' تغیر و اصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے' اسی لئے آنحضرت ﷺ نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا ''کہ کنکری مارنے صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے اور خانہ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصد خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں (۲)۔ ہے اور قرآن پاک کا ارشاد بھی اسی طرف ہے:

ویذکروا اسم اللہ فی ایام معلومت (حج:۲)

اور تاکہ ان مقررہ دنوں میں خدا کا نام یاد کرو۔

حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ شان اور ربانی نشان کے جلوہ گاہ ہیں' جہاں پہنچ کر اور جن کو دیکھ کر وہ خدائی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہیں اور اسی لئے قرآن پاک کی اصطلاح میں ان کا نام شعائر اللہ اور حرمت اللہ ہے یعنی خدا کے نشانات اور خدا کی محترم باتیں اور چیزیں اور انہی شعائر اللہ اور حرمت اللہ کی تعظیم و زیارت کا نام ارکان حج ہے' سورۂ حج میں حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے:

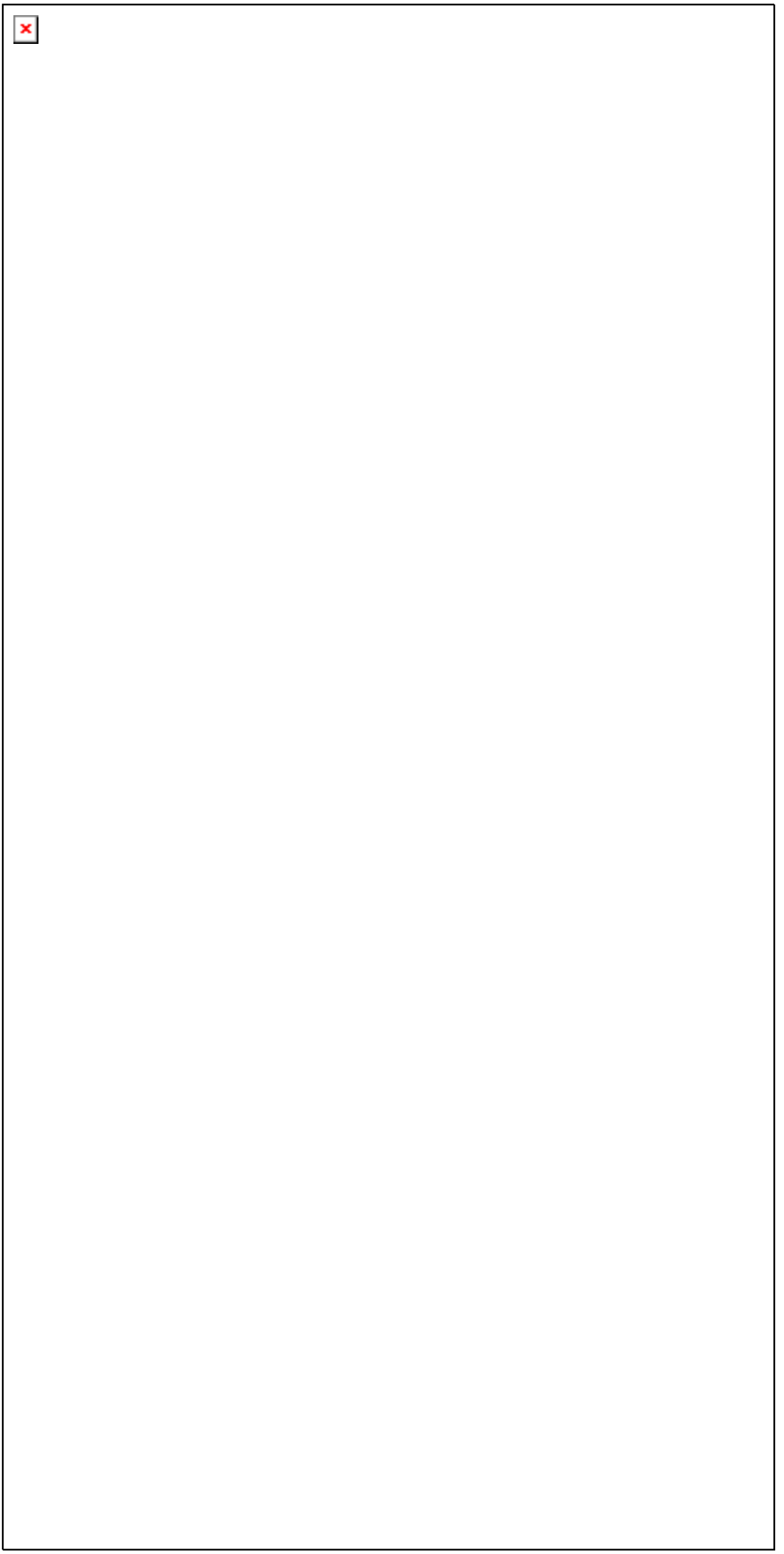
(۱)۔ مشکوہ باب رمی جمار بحوالہ دارمی و ترمذی قال الترمذی حدیث حسن صحیح (۲)۔ ترمذی' نسائی' دارمی و مستدرک حاکم کتاب الحج۔

ومن یعظم حرمت اللہ فھو خیر لہ عند ربہ۔ (حج:۴)

اور جو اللہ کی محترم چیزوں کا ادب کرے تو وہ اس کے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے۔

صفا اور مروہ کی نسبت ہے:

ان الصفا والمروہت من شعائر اللہ۔ (بقرہ:۱۹)



ماحول اور سامان کو لوٹنا یا چرانا بھی خاص طور سے منع کیا گیا کہ یہ اس خانہ الٰہی کے پاس ادب کے خلاف ہے تا کہ عرب جیسے بے امن ملک میں ان ڈاکوؤں اور رہزنوں اور بدمعاشوں کی وجہ سے قافلوں کا آنا جانا نہ رکے۔

ولا امین البیت الحرام یبتغون فضلا من ربھم ورضوانا۔ (مائدہ: ۱)

اور نہ اس ادب کے گھر کے قصد کرنیوالوں کو حلال سمجھو جو اپنے پروردگار کی مہربانی اور خوشنودی کو تلاش کرنے نکلے ہیں۔

اگر کسی حاجی سے کسی جانور کے قتل کی حرکت قصداً صادر ہوتو اس پر اس کا خون بہا لازم آتا ہے جس کا نام کفارہ ہے یعنی اس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی یا چند محتاجوں کو کھانا کھلانا یا اتنا ہی روزہ رکھنا فرمایا:

یایھا الذین امنوا لا تقتلوا الصید وانتم حرم۔ ومن قتلہ منکم متعمدا فجزآء مثل ماقتل من النعم یحکم بہ ذوا عدل منکم ھدیا بلغ الکعبہت او کفارہت طعام مسکین اوعدل ذلک صیاما لیذوق وبال امرہ۔ (مائدہ: ۱۳)

اے ایمان والو! جب تم احرام میں ہوتو شکار کو مت مارو اور تم میں جو جان کو مارے گا تو اس کے مارے ہوئے کے برابر بدلہ ہے مواشی میں سے اس کا فیصلہ تم میں سے دو بہتر آدمی کریں کہ اس کو کعبہ تک پہنچا کر قربانی کی جائے یا اس کے گناہ کا اتار ہے کچھ محتاجوں کو کھانا کھلانا یا اسی کے برابر روزے تا کہ وہ مجرم اپنے جرم کی سزا چکھے۔

اس سے ثابت ہوا کہ حج تمام تر صلح وسلامتی اور امن وآشتی ہے' اس مقصد کے خلاف حاجی سے اگر کوئی حرکت ہو جائے تو اس کا کفارہ اس پر واجب آتا ہے۔

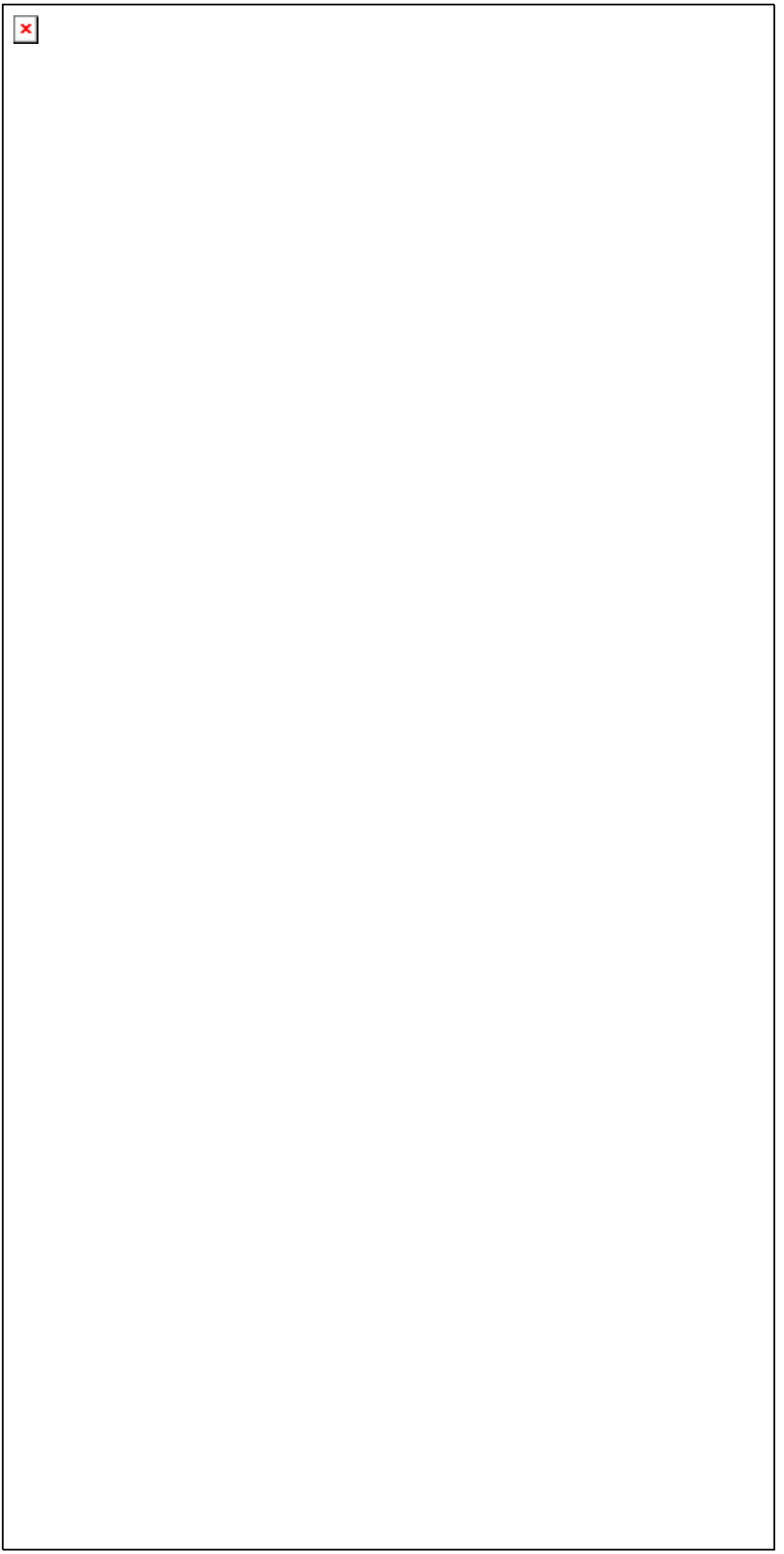
حج کی مصلحتیں اور حکمتیں::

محمد رسول اللہ ﷺ جس شریعت کا تکمیلی صحیفہ لے کر آئے اس کی سب سے بڑی خصوصیات یہی ہیں' کہ دنیا و دین کی جامع ہے اور اس کا ایک ایک حرف مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتروں سے معمور ہے' وہ اپنے احکام اور عبادات کے فائدہ ومنفعت اور غرض وغایت کے بتانے کیلئے کسی باہر کی امداد کا محتاج نہیں بلکہ اس نے ان اسرار کے چہرہ سے خود اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹایا ہے' نماز' زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی خود اسلام کے صحیفہ ربانی میں مذکور ہیں۔

قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے خانہ کعبہ کی تعمیر اور اسماعیلؑ کی نذر اور مکہ میں ان کے قیام کے سلسلہ میں جو دعا مانگی وہ تمام تر ان فوائد ومقاصد کی جامع ہے' آیئے ان آیتوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈال لیں:

واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا۔ واتخذوا من مقام ابراھیم مصلیٰ وعھدنا الی ابراھیم واسمعیل ان طھرا بیتی للطائفین والعکفین والرکع السجود. واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا بلدا امنا وارزق اھلہ من الثمرات۔ (بقرہ:۱۵)

اور جب ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگوں کا مرجع مرکز اور امن بنایا اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے یہ ذمہ کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کیلئے پاک وصاف کرو اور جب ابراہیم نے کہا' میرے پروردگار



راستہ سے آئیں گے تا کہ فائدے کی جگہوں میں آ کر جمع ہوں اور چند مقررہ دنوں میں اس بات پر خدا کا نام یاد کریں کہ ہم نے ان کو جانور روزی کئے۔

واذ قال ابراهيم رب اجعل هذا بلدا امنا واجنبني و بني ان نعبد الاصنام رب انهن اضللن كثيرا من الناس فمن تبعني فانه مني و من عصاني فانك غور رحيم۔ ربنا اني اسكنت من ذريتي بواد و غير ذي زرع عند بيتك المحرم۔ ربنا ليقيموا الصلوٰت فاجعل افئدت من الناس تهوي اليهم وارزقهم من الثمرات لعلهم يشكرون۔ (ابراہیم:٦)

جب ابراہیم نے کہا میرے پروردگار اس آبادی کو امن والی بنا' اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی پوجا کریں' میرے پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا تو جس نے میرا کہا مانا وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے' ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد اس بن کھیتی کے ترائی میں تیرے مقدس گھر کے پاس آباد کی ہے ہمارے پروردگار! تا کہ وہ نماز کھڑی رکھیں تو لوگوں کے کچھ دلوں کو ایسا بنا کہ وہ انکی طرف جھکیں اور انکو پھلوں کی روزی دے تا کہ شکرگزار رہیں۔

ان آیتوں میں حسب ذیل باتوں کی تصریح ہے۔

ا۔ خانہ کعبہ اہل توحید کا ایک مرکز و مرجع اور ملت ابراہیمی کا موطن و مسکن ہے۔

۲۔حضرت ابراہیمؑ نے یہاں اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گزاری اور خدائے واحد کی عبادت کرتی رہے اور بت پرست قوموں کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے تاکہ پہلے کی طرح یہ گھر پھر بےنشان نہ ہو جائے اور آخر ان میں رسول مبعوث ہو، جس کی صفتیں ایسی ہوں۔

۳۔یہ لوگ ایک ویرانہ جس میں کھیتی نہیں آباد ہوئے ہیں، اور صرف اس غرض سے آباد ہوئے ہیں کہ تیرے گھر آباد رکھیں، تو تو اس بےثمر اور شور زمین میں ان کی روزی کا سامان کرنا اور لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکاتا کہ وہ ان سے محبت کریں۔

۴۔حکم ہوا کہ لوگوں میں اس گھر کے حج کا اعلان عام کر، ہر قریب اور دور کے راستہ سے لوگ لبیک کہیں گے تاکہ یہاں آ کر دین و دنیا کا فائدہ حاصل کریں اور چند مقررہ ایام میں خدا کا نام لیں۔

۵۔جو لوگ یہاں عبادت اور حج کی نیت سے آئیں، خداوندا تو ان کے گناہ معاف کر، تو بڑا مہربان ہے اور رحیم ہے۔

۶۔خداوندا! میری اولاد وہی ہے جو میرے مشرب و مذہب اور میرے راستہ پر چلے اس لئے تمام وہ لوگ جو ملت ابراہیمی کے پابند ہوں آل ابراہیمؑ ہیں اور حضرت ابراہیمؑ کی دعاؤں اور برکتوں کے مستحق ہیں۔

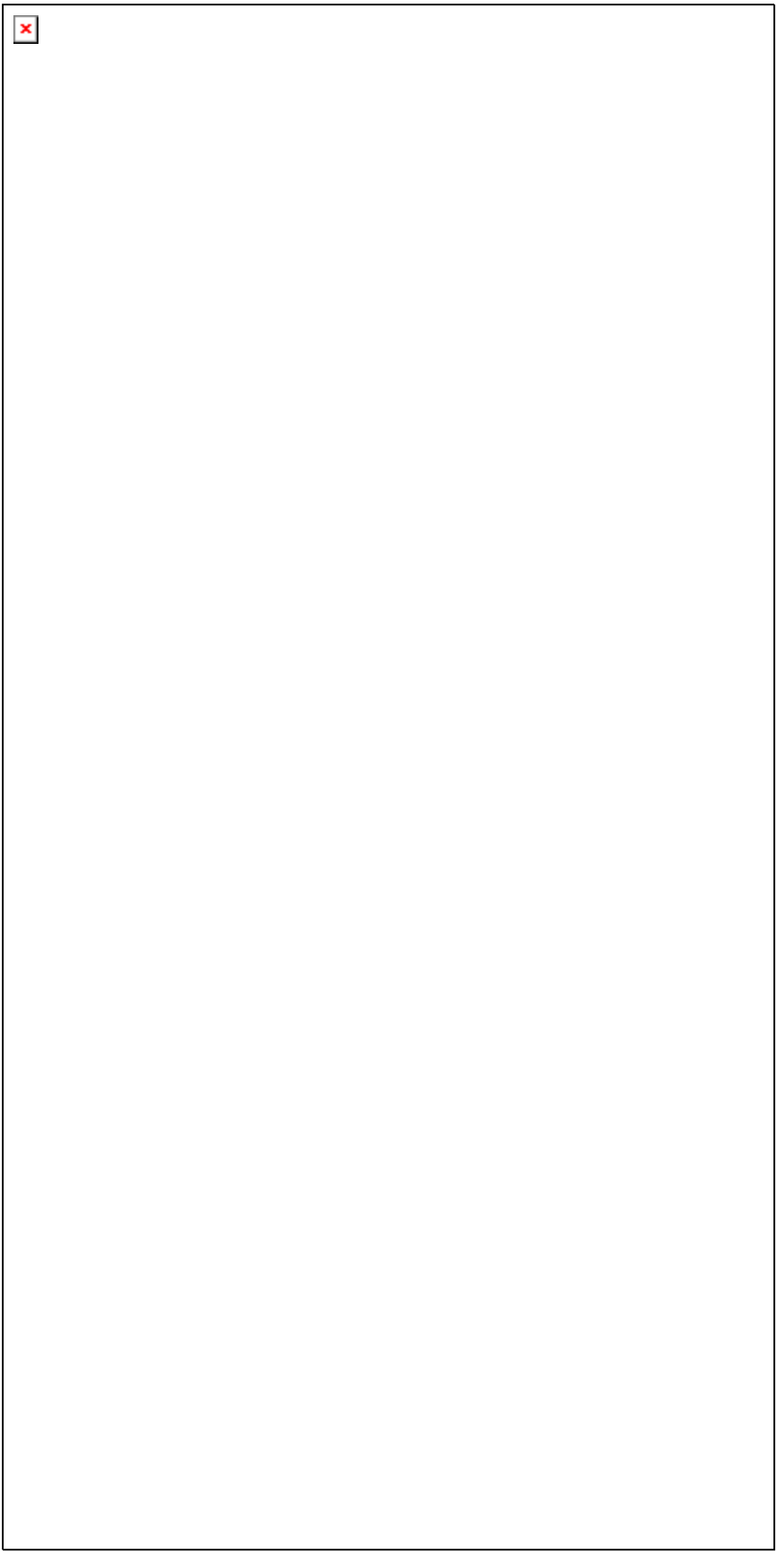
الغرض حج کے یہی منافع اور مقاصد ہیں جن میں سے ہر ایک کے ماتحت متعدد فوائد اور اغراض ہیں۔

مرکزیت ::

خانہ کعبہ اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطۂ قدم ہے یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت و غفاری کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ ابلا

اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے جن کی کرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا' یہ وہ جغرافیائی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں' جو مختلف ملکوں اور اقلیتوں میں بستے ہیں' مختلف زبانیں بولتے ہیں مختلف لباس پہنتے ہیں' مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں' مگر وہ سب کے سب ہی باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں اور ایک ہی مقام کو ام القریٰ مان کر' وطنیت' قومیت' تمدن و معاشرت رنگ و روپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن و معاشرت (ملت ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں جس سے انسانیت کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تھوڑے دن کے لئے عرصہ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں ایک لباس احرام میں' ایک وضع میں' دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں' اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں' یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے جو انسانوں میں جنگ و جدال اور فتنہ و فساد کے اسباب ہیں اس لئے یہ حرم ربانی نہ صرف اس معنی میں امن کا گھر ہے کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے' بلکہ اس لحاظ سے بھی ان کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں مٹا دیتی ہے۔

لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت اور وطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں' مگر ملت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملت



تولی سعی فی الارض لیفسدفیھا ویھلک الحرث النسلط واللہ لا یحب الفساد۔ (بقرہ:۲۵)

بعضے آدمی ایسے ہیں کہ ان کی بات دنیا کی زندگی میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور جو اس کے دل میں ہے اس پر وہ خدا کو گواہ بناتے ہیں' حالانکہ وہ پرلے درجہ کے جھگڑالو ہیں اور جب پیٹھ پھیریں تو ملک میں دوڑتے ہیں کہ اس میں بے امنی برپا ہو اور تاکہ کھیتیاں اور جانیں تلف ہوں اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

پھر دو آیتوں کے بعد فرمایا:

یاایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوت الشیطن۔ انہ لکم عدو مبین۔ (بقرہ:۲۵)

اے ایمان والو! تم اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو کہ تمہارا وہ کھلا دشمن ہے۔

اسلام کے احکام اور مسائل جو دم دم میں اور سال بسال دور دراز اقلیموں' ملکوں اور شہروں میں اس وقت پھیل سکے' جب سفر اور آمد و رفت کا مسئلہ آسان نہ تھا اس کا اصلی راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہے' اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا سب سے آخری حج جو حجۃ الوداع کہلاتا ہے' اسی اصول پر کیا' وہ انسان جو تیرہ برس تک مکہ میں یک و تنہا رہا' ۲۳ برس کے بعد وہ موقع آیا جب اس نے تقریباً ایک لاکھ کے مجمع کو بیک دفعہ خطاب کیا اور سب نے سمعاً و طاعۃً کہا۔ آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدینؓ اور دوسرے خلفائے زمانہ صحابہ کرامؓ اور آئمہ اعلام نے اسی طرح سال بسال جمع ہو کر احکام اسلام کی تلقین و تبلیغ کی خدمت ادا کی اسی کا نتیجہ تھا کہ نت

نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے اور پہنچتے رہتے ہیں۔

یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے صحابہؓ اور عالم، محدث مفسر اور فقیہ جو اسلامی فتوحات اور نوآبادیوں کے سلسلہ میں تمام دنیا میں پھیل گئے تھے وہ سال بسال پھر آ کر یہاں سمٹ جاتے تھے اور دنیا کے تمام گوشوں سے آ کر حرام ابراہیمؑ میں جمع ہو جاتے ہیں اور باہم ایک دوسرے سے مل کر اس علم کو جو ابھی دنیا میں متفرق و پراگندہ تھا ابراہیمی درسگاہ کے صحن میں ایک دفتر میں جمع کر دیتے تھے، یہیں آ کر بخارا کا باشندہ، اسپین اور مراکش کے رہنے والوں سے شامی، عراقی، اور مصری حجازی سے بصری کوفی سے کوفی، بصری سے ترمذی نیشاپوری سے اندلسی، سندھی (ہندوستان) سے رومی یمنی فیض پاتا تھا اور روم کے دم میں سندھ کا علم اسپین میں اور اسپین کی تحقیق سندھ میں پہنچ جاتی تھی، مصر کی تصنیف و روایت ترکستان میں اور ترکستان کا فیصلہ مصر و شام میں پہنچ جاتا تھا، ابن مسعودؓ کے شاگرد ابن عمرؓ اور عائشہؓ کے تلامذہ اور مستفیدین کے تمام دنیا میں پھیل جانے کے باوجود بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات و واقعات و مغازی اور احکام و فرامین و وصایا کا سارا دفتر پھر سمٹ کر ایک ہو گیا، اور آپ کے سیر و مغازی اور احادیث و تعلیمات مرتب و مدون ہو کر ہر مسلمان کے سامنے آ گئیں اور مؤطا صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور احادیث کے متعدد دفاتر عالم وجود میں آئے اور آئمہ مجتہدین کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ مسائل کے متعلق دوسرے اماموں کے خیالات و معلومات سے مستفید ہو کر اجتماعی مسائل کو الگ کر سکیں اور اس سے پہلے کہ کتابیں مدون ہوں اور پھیلیں ہر ملک اور ہر شہر کے علماء دوسرے ملک اور شہر کے علماء کے خیالات و معلومات سے واقف ہو سکے اور زمانہ کے حالات کے زیر اثر آج تک کم و بیش یہ سلسلہ قائم ہے۔

یہ اس کی مرکزیت کا نتیجہ یہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے حالات میں گرفتار ہیں

وہ دور دراز مسافتوں کو طے کر کے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیل کر' دریا' پہاڑ' جنگل' آبادی اور صحراء کو عبور کر کے یہاں جمع ہوتے' ایک دوسرے سے ملتے' ایک دوسرے کے درد وغم سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے ہیں جس سے ان میں باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے یہیں آ کر چینی' مراکشی سے تونسی ہندی سے تاتاری حبشی سے فرنگی زنگی سے عجمی عربی سے یمنی نجدی سے اتر کر افغانی سے مصری' ترکستانی سے روسی الجزائری سے افریقی یورپین سے جاوی بلغاری سے ملتا ہے اور سب مل کر باہم ایک قوم' ایک نسل ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہیں۔

اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھ آتا ہے' زمانہ کے رنگ کو پہچاننے اور سیاسیات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے لگتا ہے بین الاقوامی معاملات سے دلچسپی لیتا ہے اور دنیا کے ہر اس گوشہ کے حالات سے جس کے منارہ سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو کر اس کو خاص ذوق ہوتا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان دنیائے اسلام اور اسلامی ملکوں کے حالات وواقعات کے لئے بے چین نظر آتا ہے' پھر اسی کا نتیجہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمانوں کو بھی اچھی خاصی تعداد ایسے ملے گی جس کو دنیا کے سفر کا کچھ تجربہ ہوگا اور خشکی وتری سے اس کو کچھ واقفیت ہوگی' دنیا کی جغرافیائی معلومات کے بڑھانے اور ترقی دینے میں سفر حج نے بہت کچھ مدد کی ہے مسلمانوں میں بکثرت ایسے جغرافیہ نویس اور سیاح گزرے ہیں جنہوں نے اصل میں حج کی نیت سے سفر کیا اور بالآخر اس سفر نے دنیا کی ایک عام سیاحت کی حیثیت اختیار کر لی' یاقوت رومی نے اپنے جغرافیہ تقویم البلدان کے مقدمہ میں مسلمانوں میں جغرافی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی سفر حج کو قرار دیا ہے۔

رزق ثمرات::

اس مرکز کو قائم اور آباد رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ اس شوروبرانے میں بسنے والوں

کیلئے رزق کا کوئی سامان کیا جائے' اسی لئے حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی تھی کہ خداوندا میں نے اپنی اولاد کو اس بے حاصل اور بے آب و گیاہ سرزمین میں آباد کیا ہے تو لوگوں کے دل ان کی طرف جھکانا اور ان کے رزق کا سامان کرنا اور ان کو پھل کی روزی دینا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی' اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ یہاں کے بسنے والوں کیلئے زکوٰۃ و خیرات کی کوئی رقم خاص کی جاتی' لیکن یہ ان لوگوں کی اخلاقی پستی اور دون فطرتی کا سبب ہو جاتی' وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جاتے' جو ان کے منصب کی عزت اور شرف کے مناسب نہ ہوتا' اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلوں میں تجارت کا شوق پیدا کیا اور اس کو ان کی روزی کا سامان بنا دیا' حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کا جہاں کہیں پرانی تاریخوں میں وجود نظر آتا ہے وہ تجارت اور سوداگری کے بھیس میں ملتا ہے' حضرت یعقوبؑ ہی کے زمانہ میں جو حضرت اسماعیلؑ کے بھتیجے اور حضرت اسحاقؑ کے بیٹے تھے بنی اسماعیل کا تجارتی قافلہ عرب سے مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے (تکوین ۳۷۔۲۸ سے ۳۶ تک) توراۃ کے متعدد مقامات میں عرب سوداگروں اور تاجروں کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے' خود قریش بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجر اور سوداگر تھے جس کا ذکر سورہ ''ایلاف قریش'' میں ہے وہ ایک طرف یمن اور حبشہ تک اور دوسری طرف شام و مصر اور روم تک جاتے تھے۔ (۱)۔

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی مکہ معظمہ کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی شکم سیری کیلئے کافی نہ تھی اس لئے خود مکہ کی سرزمین کو اور حج کے مقام کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی' چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کا ایک بڑا میلہ تھا اور عکاظ وغیرہ کا بڑا بازار لگتا تھا اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا کہ یہ دعائے ابراہیمی کا مصداق اور اس شورہ بے حاصل زمین کے بسنے والوں کیلئے روزی کا سامان تھا' اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہاں آنے لگتے چنانچہ سال کے دو تین مہینے میں یہاں کے رہنے

والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر کما لیتے ہیں کہ وہ سال بھر کھا پی سکیں مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا تو پورے راستہ اور منزلوں کے بدو اپنے پھل اور پیداوار لے کر آتے ہیں اور خرید وفروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہیں' کھانا' پینا' مکان' سواری اور دوسری ضروریات اسی شہر اور اس کے آس پاس سے تمام حاجی حاصل کرتے ہیں اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہیں اور یہی زرمعاوضہ اہل مکہ کے قوت لایموت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

قربانی کی اقتصادی حیثیت::

اس ملک کی فطری پیداواروں میں اگر کوئی چیز ہے تو وہ جانوروں کی پیداوار ہے اس بناء پر قربانی کے فریضہ نے بھی اہل عرب اور اہل بادیہ کیلئے ان جانوروں سے اپنی روزی کے پیدا کرنے کا سامان کر دیا' ہر سال تقریبًا ایک لاکھ حاجی قربانی کرتے ہیں جن میں سے بعض کئی کئی کرتے ہیں اس حساب سے سالانہ دو لاکھ جانوروں سے کم کی قربانی نہیں ہوتی اور عمومًا دنبہ کی قیمت آٹھ روپے (۲)۔اور بکری کی چار روپے وہاں ہوتی ہے تو اس تقریب سے کم وبیش دس بارہ لاکھ روپے ہر سال اہل بادیہ کو اپنے جانوروں کی فروخت سے ملتے ہیں اور یہ اس بے آب وگیاہ اور ویران ملک کے باشندوں کی بہت بڑی مدد ہے۔

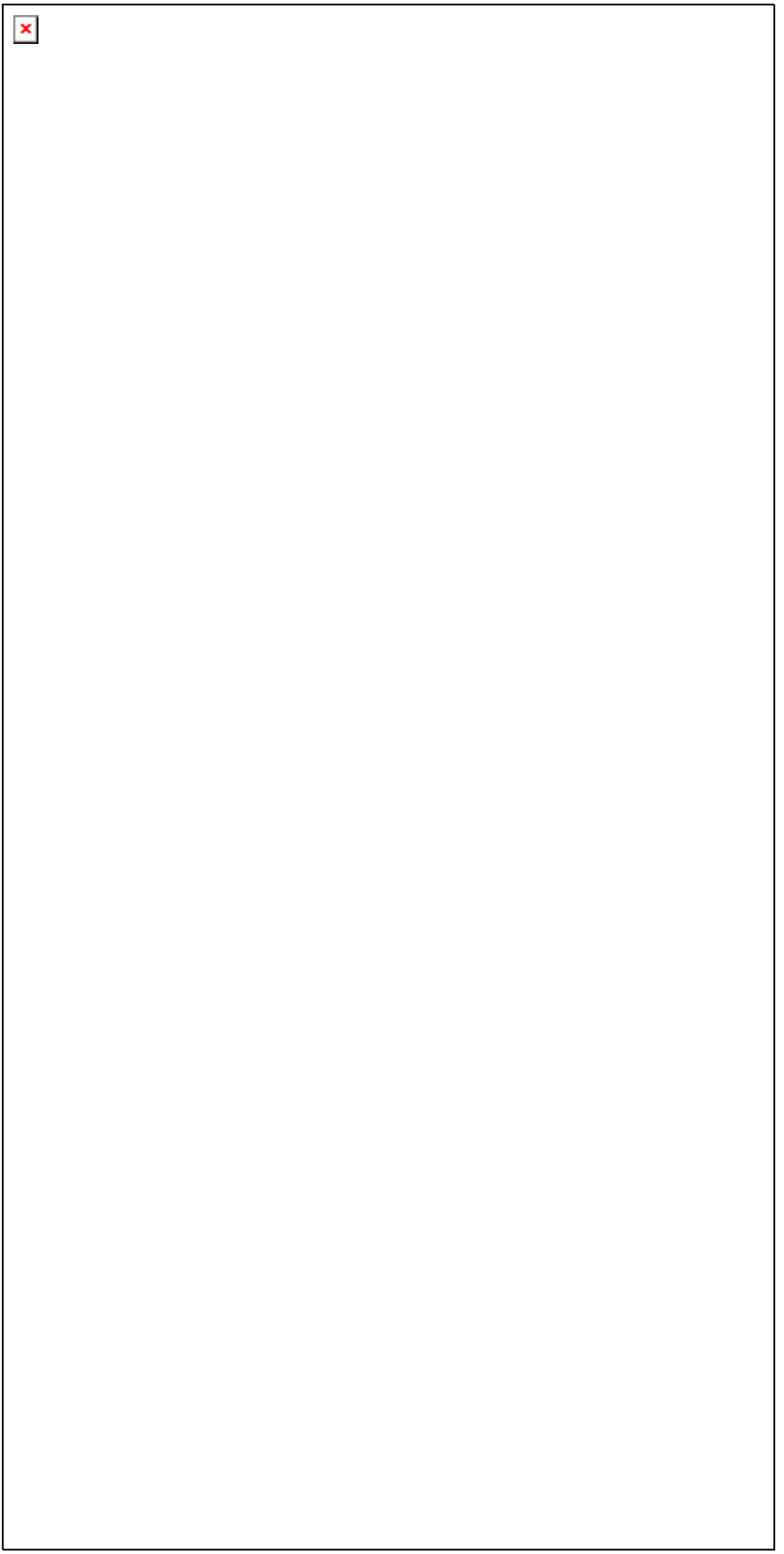
ابراہیمی دعا کی مقبولیت::

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی دعا میں خاص طور سے پھلوں کا ذکر کیا تھا:

وارزق اهله من الثمرات۔ (بقرہ:۳۵)

اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں میں سے روزی دینا۔

اس دعا کا اثر یہ ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے بازاروں میں ہر وقت تازہ سے تازہ پھل' میوے سبزی وترکاریاں نظر آتی ہیں اور دعائے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہیں کہ زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان کی حلاوت کا مزہ بھی ملنے لگتا ہے۔



وتزودوا فان خیر الزاد التقوی واتقون یاولی الالباب'
لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلا من ربکمط
(بقرہ:۲۵)

اور راہ کا توشہ (خرچ) لے کر چلو' کہ راستہ کا سب سے اچھا توشہ تقوی (بھیک مانگنا) ہے' تم پر گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے ہوئے چلو (یعنی بیوپار کرتے ہوئے۔)

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو دین کے سفر میں جائز نہیں' درست نہ تھا کہ اول تو ''طلب رزق'' ہر حال میں بجائے خود اسلام میں عبادت اور نیکی کا کام ہے' دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعاء کی بناء پر یہ خود حج کے مقاصد میں کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی کی ترقی اور بقا ممکن نہیں' یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خانہ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لئے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے یہ مقام گویا مسلمانوں کے عالمگیر تجارتی کاروبار کا مرکز اور ممالک اسلامیہ کی صنعتوں کی سالانہ نمائش گاہ ہے' جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے وہ کونسا اسلامی ملک ہے جہاں کی صنعت کا نمونہ یہاں دیکھنے والے کو نظر نہیں آ سکتا' لیکن افسوس ہے کہ آج کل کے مسلمانوں نے حج کے اس اہم نکتہ کی اہمیت کو کچھ تو بھلا دیا ہے اور کچھ غیر مسلمانوں کی تجارتی چیرہ دستی سے وہ دبے بھی ہیں اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکوں کا مرکزی بازار تھا' یورپ کی مصنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے اس جنگ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہیں۔

روحانیت::

روحانیت سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتیں ہیں جو ان مقامات کی زیارت اور ان ارکان حج کے ادا کرنے سے قلب و روح میں پیدا ہوتی ہیں ان کی ایک حیثیت تو

باطنی، دوسری تاریخی اور تیسری خالص روحانی ہے وطنی ہونے کے یہ معنی کہ گو مسلمان دنیا کے ہر ملک میں رہتے، ہر زبان بولتے اور ہر لباس پہنتے ہیں تاہم ان کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے کہ وہ جسمانی طور سے کہیں ہوں تاہم روحانی طور سے ان کا مسکن عرب ہی کی سرزمین ہے وہی ملت ابراہیمی کا مقام ہے، اسلام کا مولد اور قرآن کا مہبط ہے اس لئے دور دراز مسافتوں سے ولولہ اور شوق کے بازوؤں سے اڑ کر جب لوگ یہاں پہنچتے ہیں تو اس ریگستان اور پہاڑ کو دیکھ کر ان کی محبت کا سرچشمہ ابلنے لگتا ہے اور ان کے دل میں اسلام کے وطن اور قرآن کی سرزمین کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے مسلمان جس ملک میں بھی ہے اس کو وہاں اسلام اپنے خالص وطن میں نظر نہیں آتا، ہر جگہ اس کو اپنے ساتھ دوسری قومیں بھی نظر آتی ہیں، اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب بھی دکھائی دیتے ہیں اپنے تمدن کے ساتھ دوسرے تمدنوں کا منظر بھی سامنے ہوتا ہے، لیکن یہاں اسلام اس کو اپنے خالص رنگ میں جلوہ گر معلوم ہوتا ہے، گرد و پیش آگے پیچھے، داہنے بائیں، ہر طرف اور ہر سمت اس کو اسلام ہی کا مجسم پیکر دکھائی دیتا ہے اور اس وقت سرزمین عرب اور دنیا کے کل ممالک کا تعلق اس کی نگاہ میں ایسا نظر آتا ہے جس طرح نوآبادیوں کے رہنے والوں کی نگاہ میں اپنی مادر وطن (مدر لینڈ) کی حیثیت، آج انگریز ہندوستان عراق، مصر، فلسطین، سائپرس جبل الطارق، نیوزی لینڈ، سنگاپور، آسٹریلیا، یوگنڈا، ٹرانسوال، زنجبار، اور افریقہ اور کینیڈا (امریکہ) کے متفرق ملکوں میں آباد ہیں، تاہم انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ ان کی نگاہ میں اس وسیع برطانوی مملکت کا جس میں آفتاب نہیں غروب ہوتا مرکز ہے وہ ان کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے، وہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، لٹریچر، ہر چیز میں اپنے اس آبائی وطن و مسکن کی پیروی کرتے ہیں، جب ان کی آنکھیں اس کے دیدار سے مشرف ہوتی ہیں تو اپنی خالص اور بے میل تہذیب اخلاق اور تمدن کے ملک کو دیکھ کر مسرت اور خوشی سے روشن ہو

جاتی ہیں۔ وہ اس کے ایک ایک در و دیوار کو عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس وقت ان کے دل میں وہ احساسات پیدا ہوتے ہیں جو دوسرے ملکوں قوموں اور تمدنوں میں رہنے کی وجہ سے ان کی فرسودہ اور پژمردہ ہو جانے والی فکر اور عمل کی قوتوں کو بیدار کر دیتے ہیں اور وہ یہاں آ کر اپنی خالص تہذیب و تمدن کے پاک و صاف چشمہ حیات میں نہا کر نئے سرے سے پھر جوان ہو جاتے ہیں۔ بلاتشبیہہ اسی قسم کی کیفیت اور لذت ان مسلمانوں کی ہے جو عرب کو اپنا' اپنے مذہب کا اپنی قومیت کا' اپنے تمدن کا اپنے علوم و فنون کا مولد و مسکن سمجھتے ہیں ان میں سے جب کسی کو اس ملک اور اس شہر کی زیارت کا موقع ملتا ہے تو اس کا ذرہ ذرہ اس زائر کے دامن دل سے لپٹ جاتا ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

یہی فلسفہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ وصیت فرمائی کہ اس ملک میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب' کعبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا صحیفہ نہ رہنے دیا جائے اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرک و کافر اس ادب والی مسجد کے قریب بھی نہ آنے پائیں' تاکہ یہاں اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک و صاف اور کفر و شرک کی ہر قسم کی نجاستوں سے محفوظ رہے۔ تاکہ ہر گوشہ اور ہر سمت سے یہاں آ کر مسلمان خالص اور روح ایمانی کو تازہ کر سکیں قرآن پاک نے مکہ معظمہ کو ''ام القری'' یعنی ''آبادیوں کی ماں'' کہا ہے' اگر مکہ معظمہ تمام دنیا کی آبادیوں کی اصل نہ بھی ہو تو اسلامی دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اس کا مرجع اور ماوی تو ضرور ہے۔

تاریخیت ::

اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اور حرم پاک کے ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے آدمؑ سے لے کر ابراہیمؑ تک اور ابراہیمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ تک

جو کچھ ہوا ہے اس کا تمام تر تعلق ارض حرم کے کوہ وصحرا اور در و دیوار سے ہے' یہیں حضرت آدمؑ نے سکونت کی اور عرش کے سایہ میں خدا کا گھر بنایا یہیں حوّا نے آ کر ان سے ملاقات کی' یہیں نوحؑ کی کشتی نے آ کر دم لیا' حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے یہاں پناہ لی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہیں ولادت پائی' یہیں وہ پہاڑی ہے (صفا) جہاں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ اپنے گدھے چھوڑ کر اترے' یہیں وہ دوسری پہاڑی ہے (مروہ) جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی' یہیں وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت ہاجرہؑ کو پیاس کے عالم میں نظر آیا' یہیں وہ خانہ کعبہ ہے جس کی چہار دیواری کو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بلند کیا' یہیں وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر انہوں نے خدا کے آگے سر جھکائے اسی کے قریب منٰی' مشعر حرام اور عرفات ہیں' جو شعائر اللہ ہیں' یہیں وہ پتھر (حجر اسود) ہے جو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقدس ہاتھوں سے مس ہوا' یہی وہ سرزمین ہے جہاں وہ گلیاں اور راستے ہیں جو جبرئیل امین کی گزرگاہ تھے' یہیں وہ غار حرا ہے جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی۔ یہیں وہ صحن حرم ہے جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ترپن (۵۳) برس بسر کئے اور یہی وہ مقام ہے جہاں براق کے قدم پڑے تھے اور یہی وہ مکانات ہیں جن کی ایک ایک اینٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے کیا قرآن پاک کا اشارہ انہیں مناظر اور مشاہد کی طرف نہیں' جہاں اس نے کہا:

فیہ ایت بینت مقام ابراھیم۔ (آل عمران: ۱)

اس حرم میں کھلے کھلے (ربانی) نشانات میں ابراہیم کے قیام کی جگہ۔

ان مقامات اور مناظر میں کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے تو اس کے ادب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے اس کے ایمان کا خون جوش مارنے

لگتا ہے اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے' جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں تڑپنے لگتی ہے' جدھر نظر ڈالتا ہے دل وجد کرتا ہے آنکھیں اشکبار رہوتی ہیں' اور زبان تسبیح وتہلیل میں مصروف ہو جاتی ہے اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ' عقیدت کو مضبوط اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے :

ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب۔
(حج: ۴)

اور جو خدا کی نشانیوں اور یادگاروں کی عظمت کرتا ہے تو وہ دلوں کے تقوی کے سبب سے ہے۔

ومن یعظم حرمت اللہ فھو خیر لہ عند ربہ (حج: ۴)
اور جو خدا کی حرمتوں کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کیلئے اس کے خدا کے نزدیک بہتر ہے۔

خالص روحانیت : ::

''حج کی حقیقت'' میں گزر چکا ہے کہ وہ دراصل اس رسمی قربانی اور اس دوڑ دھوپ کا نام نہیں یہ تو حج کی روحانیت کی صرف جسمانی اور مادی شکل ہے حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلیں ہیں اسی لئے سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہیں بلکہ ''حج مبرور'' رکھا ہے یعنی ''وہ حج جو سراپا نیکی ہو'' اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے جو عرفات کے سائلوں کے لئے خاص ہے' حج کی روحانیت اور حقیقت توبہ' انابت اور گذشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد اور آئندہ کے لئے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے اور اس کا اشارہ خود دعائے ابراہیم میں مذکور ہے :

ربنا واجعلنا مسلمین لك و من ذریتنا امۃ مسلمۃ لك ص و ارنا مناسکنا وتب علیناج انك انت التواب الرحیمط (بقرہ:۱۵)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار (مسلم) بنا اور ہماری اولاد میں سے اپنا ایک فرمانبردار گروہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے احکام اور دستور سکھا اور ہم پر رجوع ہو (یا ہم کو معاف کر) تو (بندوں کی طرف) رجوع ہونے والا (یا ان کو معاف کرنے والا) اور رحم کرنے والا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی ان کی دوسری دعاؤں کی طرح قبول کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوا کہ حج درحقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین میں حاضر ہوکر جہاں اکثر نبیوں، رسولوں اور برگزیدوں نے حاضر ہوکر اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اعتراف کیا اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد واقرار ہے اور ان مقامات میں کھڑے ہوکر اور چل کر خدا کی بارگاہ میں اپنی سیہ کاریوں سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوئے مولیٰ کو منانا ہے، تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو کہ وہ تو اپنے تائب گنہگاروں کی طرف رجوع ہونے کے لئے ہر وقت تیار ہے، وہ تو رحم وکرم لطف وعنایت کا بحر بیکراں ہے۔

یہی وہ سبب ہے کہ شفیع المذنبین ﷺ نے فرمایا کہ ''حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں، جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) احرام کی حالت میں گزارتا ہے اس کا سورج ڈوبتا ہے تو اس کے گناہوں کو لے کر ڈوبتا ہے۔(۱)۔

صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بشارت دی کہ عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں، جس میں خدا اپنے بندوں کو دوزخ کے

عذاب سے آزاد کرتا ہے' وہ اس دن اپنے بندوں سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے اور اپنے ان بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''جو انہوں نے مانگا (وہ ہم نے قبول کیا۔) ''مؤطا امام مالک میں ہے کہ آپ ﷺ نے یہ خوشخبری سنائی ''بدر کے دن' کہ عرفہ کے دن کے سوا زیادہ شیطان کسی دن ذلیل' رسوا اور غضب ناک نہیں ہوتا' کیونکہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے اور گناہ معاف ہو رہے ہیں۔'' اسی طرح اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں مخلصانہ حج ادا کرنے والوں کو رحمت اور مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے' یہ تمام حدیثیں درحقیقت اسی دعائے ابراہیم وارنا مناسکنا وتب علینا۔ (اور ہمارے حج کے دستور ہم کو سوجھا اور ہماری توبہ قبول فرما) کی تفسیریں ہیں۔

ان تمام بشارتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے' اسی لئے احرام باندھنے کے ساتھ لبیک اللھم لبیک۔ (خداوند میں حاضر ہوں) کا ترانہ دم بدم اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے طواف میں' سعی میں' کوہ صفا پر' کوہ مروہ پر' عرفات میں' مزدلفہ میں' منیٰ میں ہر جگہ جو دعائیں مانگی جاتی ہیں ان کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے اور اس بنا پر کہ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ (۲)۔ گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے' جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہیں ہے اس لئے حج مبرور والوں کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں گو کہ توبہ سے ہر جگہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں اس کے لئے کعبہ اور عرفات کی کچھ تخصیص نہیں' لیکن حج کے مشاعر' مقامات اور ارکان اپنے گوناگوں تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ جو یہاں کے سوا اور کہیں نہیں' صدق توبہ کیلئے بہتر سے بہتر مواقع پیدا کرتے ہیں ان مقامات کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب میں ہے' اس کا نفسیاتی

---

(۱)۔ نسائی و ترمذی و بزار و طبرانی کبیر بحوالہ جمع الفوائد' کتاب الحج جلد اول ص ۱۲۳ میرٹھ (۲)۔ سنن ابن ماجہ باب ذکر التوبہ

اثر دل پر بڑا گہرا پڑتا ہے وہ مقامات جہاں انبیاء علیہ السلام پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول اور انوار الٰہی کی بارش ہوئی' وہ ماحول وہ فضا تمام گناہگاروں کی ایک جگہ اکٹھا ہو کر دعا و زاری' فریاد و بکا اور آہ و نالہ' وہ قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد' جہاں خدا اور اس کے برگزیدہ بندوں کے بیسیوں راز و نیاز کے معاملات گزر چکے ہیں' دعا اور اس کے تاثر اور اس کے قبول کے بہترین مواقع ہیں جہاں حضرت آدمؑ و حوّا نے اپنے گناہوں کی معافی کی دعا کی' جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی اور اپنی اولاد کیلئے دعا مانگی' جہاں حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد اپنی پناہ ڈھونڈی' جہاں دوسرے پیغمبروں نے دعائیں کیں' جہاں محمد رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر اپنی اور اپنی امت کیلئے دعائیں مانگیں' وہی مقامات وہی مشاہد اور دعاؤں کے وہی ارکان ہم گناہگاروں کی دعائے مغفرت کیلئے کس قدر موزوں اور مناسب ہیں کہ پتھر سے پتھر دل بھی ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کیلئے تیار ہو جائے اور انسان اس ابر کرم کی چھینٹوں سے سیراب ہو جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً یہاں برگزیدگان الٰہی پر عرش الٰہی سے برستا رہا ہے اور ہنوز آں ابر رحمت درفشان است۔

انسان کی نفسیات (سائیکالوجی) یہ ہے اور روزمرہ کا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی بڑے اور اہم تغیر کیلئے ہمیشہ زندگی کے کسی موڑ اور حد فاصل کی تلاش کرتا ہے جہاں پہنچ کر اس کی گذشتہ اور آئندہ زندگی کے دو ممتاز حصے پیدا ہو جائیں اسی لئے لوگ اپنے تغیر کیلئے جاڑا' گرمی یا برسات کا انتظار کرتے ہیں بہت سے لوگ شادی کے بعد یا صاحب اولاد ہونے کے بعد یا تعلیم سے فراغت کے بعد یا کسی نوکری کے بعد یا کسی بڑی کامیابی یا کسی خاص مہم اور سفر کے بعد یا کسی کے مرید ہو جانے کے بعد بدل جاتے ہیں' یا اپنے کو بدل لینے پر قادر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی کے یہ اہم واقعات اور سوانح ان کی اگلی اور پچھلی زندگی میں فصل اور امتیاز کا خط

ڈال دیتے ہیں جہاں سے ادھر یا ادھر مڑ جانا ممکن ہو جاتا ہے۔ حج درحقیقت اسی طرح انسان کی گذشتہ اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک حد فاصل کا کام دیتا ہے اور اصلاح اور تغیر کی جانب اپنی زندگی کو پھیر دینے کا موقع بہم پہنچاتا ہے' یہاں سے انسان اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو اس کو ختم کر کے نئی زندگی شروع کرتا ہے ان بابرکت مقاموں پر حاضر اور وہاں کھڑے ہو کر جلیل القدر انبیائے کرام اور خاصان الٰہی کھڑے ہوئے خدا کے گھر کے سامنے قبلہ کے روبرو جو اس کی نمازوں اور عقیدتوں اور مناجاتوں کی غائبانہ سمت ہے اپنی پچھلی زندگی کی کوتاہیوں پر ندامت اور اپنے گناہوں کا اعتراف اور آئندہ اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ اور اقرار وہ اثر پیدا کرتا ہے کہ شر سے خیر کی طرف اور خیر سے اور زیادہ خیر کی طرف زندگی کا رخ بدل جاتا ہے اور زندگی کا گذشتہ باب بند ہو کر اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ اس کے بعد اپنے نئے اعمال کیلئے نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے اسی لئے سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ نے یہ فرمایا:

من حج للہ فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدتہ امہ۔ (۱)۔

جس نے خدا کے لئے حج کیا اور اس میں ہوس رانی نہ کی اور گناہ نہ کیا تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے جیسے اس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا۔

(۱)۔ سنن ابی داؤد کے علاوہ بقیہ تمام کتب صحاح کی کتاب الحج میں یہ حدیث موجود ہے۔

یعنی ایک نئی زندگی ایک نئی حیات اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے جس میں دین اور دنیا دونوں کی بھلائیاں جمع اور دونوں کی کامیابیاں شامل ہوں گی' یہ فلسفہ خود قرآن پاک کی ان آیتوں کا خلاصہ ہے جو حج کے باب میں ہیں اور جس کی آخری آیتیں طواف کی دعاء کا آخری ٹکڑا ہیں۔

ثم افیضوا من حیث افاض الناس واستغفروا اللہ۔ ان اللہ غفور رحیم. فاذا قضیتم مناسککم فاذکروا اللہ کذکرکم اباء کم او اشد ذکرا فمن الناس من یقول ربنا اتنا فی الدنیا وما لہ فی الاخرہت من خلاق و منھم من یقول ربنا اتنا فی الدنیا حسنہت و فی الاخرہت حسنہت وقنا عذاب النار اولئک لھم نصیب مما کسبوا واللہ سریع الحساب

(بقرہ:۲۵)

پھر طواف کیلئے وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلے اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگو بیشک خدا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے اور جب حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح آپ اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے یا ان سے بھی زیادہ تو بعض لوگ (حج کی دعائیں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں دے اور ایسوں کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا اور وہ ہیں جن کو اپنی کمائی کا حصہ ملے گا اور اللہ تمہارے اعمال کا تم سے جلد حساب لینے والا ہے۔

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہیں مثلاً:

۱۔ حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس کر سکتا ہے حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل وعیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے اس لئے آدمی حج کے

لئے اس وقت نکلتا ہے جب اہل وعیال کی ضرورتوں کا سامان کر لیتا ہے اس لئے اس کو اہل وعیال کے مصارف کی ذمہ داریاں خود بخود محسوس ہو جاتی ہیں معاملات میں قرض انسان کے سر کا بوجھ ہے اور حج وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اس سے سبکدوش ہو جائے اس لئے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے۔

عام طرز معاشرت اور دنیوی کاموں میں آدمی اپنے سینکڑوں دشمن پیدا کر لیتا ہے لیکن جب خدا کی بارگاہ میں جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بری الذمہ ہو کے جانا چاہتا ہے اس لئے رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض وحسد سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے لوگوں سے اپنے قصور معاف کرواتا ہے' روٹھوں کو مناتا ہے قرض خواہوں کے قرض ادا کرتا ہے اس لحاظ سے حج معاشرتی اخلاق اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

۲۔ اسلام آج ہر **ملک** میں ہے اس لئے ہر **ملک** کی زبان اس کی زبان ہے۔ تاہم اس کی ایک عمومی زبان بھی ہے جو اس **ملک** کی زبان ہے جہاں دنیا کے ہر **ملک** سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہیں اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر میں کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہیں اس کا اثر یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو وہ اس **ملک** کی زبان سے اور زبان سے کہی تو الفاظ سے آشنا ہوتی ہے اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔

۳۔ مساوات اسلام کا سنگ بنیاد ہے اگر چہ نماز بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے لیکن وسعت کے ساتھ اس کی اصلی نمائش حج کے زمانہ میں ہوتی ہے' جب امیر وغریب جاہل و عالم' بادشاہ و رعایا ایک لباس میں' ایک صورت میں' ایک میدان میں ایک ہی طرح کے خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں نہ کسی کے لئے کوئی جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے' نہ آگے پیچھے کی قید۔

۴۔ بہت سی اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ کسب حلال ہے' چونکہ ہر شخص حج کے مصارف

میں مال حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے اس کو خود حلال وحرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے اور اس کا جو اثر انسان کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔

الغرض ''حج'' اسلام کا صرف مذہبی رکن نہیں بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور ہر مسلمان کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

جہاد

وجاھدوا فی اللہ حق جھادہ(حج:۷۸)

عام طور سے اسلام کے سلسلۂ عبادات میں جہاد کا نام فقہاء کی تحریروں میں نہیں آتا مگر قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے' اس لئے ضرورت ہے کہ اس فریضہ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دی جائے اور اس حقیقت پر ناواقفیت کے جو تو برتو پردے پڑ گئے ہیں ان کو اٹھایا جائے۔

''جہاد'' کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں' مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے ''جہاد'' کا لفظ ''جہد'' سے نکلا ہے' جہاد اور مجاہدہ' فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں' اسی کے قریب قریب اسی کے اصطلاحی معنی بھی ہیں' یعنی حق کی بلندی' اور اس کی اشاعت اور حفاظت کیلئے ہر قسم کی جدوجہد' قربانی اور ایثار گوارا کرنا' اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں' اس راہ میں صرف کرنا' یہاں تک کہ اس کیلئے اپنی' اپنے عزیز و اقارب کی' اہل وعیال کی' خاندان وقوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا' ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا' ان کے حملوں کو روکنا اور اس کیلئے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کیلئے بھی پوری طرح تیار رہنا یہی جہاد ہے اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

افسوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سرسبز ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے صرف ''دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ'' کے تنگ میدان میں محصور کر دیا ہے' یہ بات بار بار کہی اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس تعلیم اور شریعت کو لے کر دنیا

میں آئے، وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں، بلکہ عمل اور سرتاپا عمل ہے، آپ ﷺ کے مذہب میں نجات کا استحقاق، گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبہ، دھیان، اور الٰہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں، بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت اور جزوسزاء کے اعتقاد کے بعد انہیں کے مطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے، اسی لئے قرآن پاک میں ''جہاد'' کا مقابل لفظ ''قعود'' (بیٹھنا یا بیٹھ رہنا) استعمال کیا گیا ہے، جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترک فرض ہے، سورۂ نساء میں ہے:

لا یستوی القعدون من المئومنین غیر اولی الضور والمجاھدون فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھمط فضل اللہ المجاھدین

مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جسمانی معذوری نہ ہو، اور پھر بیٹھے رہیں اور وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کر رہے ہوں، برابر نہیں، اللہ نے اپنی

باموالھم وانفسھم علی القعدین درجہتط و کلا وعد اللہ والحسنیط فضل اللہ المجاھدین علی القعدین اجرا عظیما۔ (نساء:۱۳)

جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے، اور ہر ایک سے خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے۔

اس بیٹھنے اور ''جہاد'' کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، سستی کرنے اور آرام ڈھونڈنے کے سراسر خلاف ہے۔

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے' اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ''جہاد'' اور ''قتال'' دونوں ہم معنی ہیں' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن پاک میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں۔ اس لئے ''جہاد فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں جہاد کرنا) اور ''قتال فی سبیل اللہ'' (خدا کی راہ میں لڑنا) ان دونوں لفظوں کے ایک معنی نہیں ہیں بلکہ ان دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے' یعنی ہر ''جہاد'' قتال نہیں ہے بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قتال اور دشمنوں سے لڑنا بھی ہے' اسی لئے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے چنانچہ اسی سورۂ نساء کی اوپر کی آیت میں اور دوسری آیت میں جہاد کی دو صریح قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ (۱) جہاد بالنفس اور (۲) جہاد بالمال' یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرنا' جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کے لئے ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے' یہاں تک کہ اپنی جان تک کو جوکھوں میں ڈال دینے' آگ میں جلائے جانے' سولی پر لٹکائے جانے' تیر اور نیزے میں چھد جانے اور تلوار سے کٹ جانے کے لئے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے' مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سربلند کرنے کے لئے اپنی ہر ملکیت کو قربان' اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لئے تیار رہے' اسی جان اور مال کی باطل محبت' شخص اور قوم دونوں کی ترقی و سعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے' اگر یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم کامل موحد ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی' جسمانی و روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے' اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

ترقی و سعادت کا یہ گر صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا گیا اور آپ ہی یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصول ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے مکہ میں مسلمانوں نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہادرانہ مقابلہ

کیا' ریگستان کی جلتی دھوپ' پتھر کی بھاری سل' طوق و زنجیر کی گرانباری' بھوک کی تکلیف' پیاس کی شدت' نیزہ کی انی' تلوار کی دھار' بال بچوں سے علیحدگی' مال و دولت سے دست برادری اور گھر بار سے دوری' کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی' اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ میں انہوں نے تلوار کی چھاؤں میں جس طرح گزارے وہ دنیا کو معلوم ہے۔

انما المئومنون الذین امنوا باللہ و رسولہ ثم لم یرتابوا و جاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ اولئك ھم الصدقون۔ (حجرات: ۲)

مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر اس میں وہ ڈگمگائے نہیں اور خدا کے راستہ میں اپنی جان سے اور اپنے مال سے جہاد کیا' یہی سچے اترنے والے لوگ ہیں۔

فالذین ھاجروا اخرجوا من دیارھم واوذوا فی سبیلی وقتلوا وقتلوا لا کفرن عنھم سیاتھم ولا دخلنھم جنت۔ الایہ (آل عمران: ۲)

پھر جنہوں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے' ہیں ان کے گناہوں کو اتاروں گا' اور ان کو بہشت میں داخل کروں گا۔

جہاد کی قسمیں::

۱۔ جب جہاد کے معنی' محنت سعی' بلیغ اور جہد و جہد کے ہیں' تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہو سکتا ہے' علمائے دل کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے

نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور اسی کا نام ان کے ہاں ''جہاد اکبر'' ہے' خطیب نے تاریخ میں حضرت جابرؓ صحابی سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے ان صحابہ سے جو ابھی ابھی لڑائی سے واپس آئے تھے فرمایا' تمہارا آنا مبارک' تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہوائے نفس سے لڑنا ہے۔ حدیث کی دوسری کتابوں میں اس قسم کی اور بعض رویاتیں بھی ہیں۔ (۱)۔ چنانچہ ابن نجار نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور خواہش سے جہاد کرے۔'' یہی روایت دیلمی میں ان الفاظ میں ہے کہ بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لئے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو۔ یہ تینوں روایتیں گو فن کے لحاظ سے چنداں مستند نہیں' مگر درحقیقت بعض صحیح حدیثوں کی تائید اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہیں:

والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین۔ (عنکبوت:۷)

اور جنہوں نے ہمارے بارہ میں جاہد کیا (یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی) ہم ان کو اپنا راستہ آپ دکھائیں گے اور بے شبہ خدا نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

اس پورے سورہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حق کے لئے ہر مصیبت و تکلیف میں ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے' اور اگلے پیغمبروں کے کارناموں کا ذکر کیا ہے کہ وہ ان مشکلات میں کیسے ثابت قدم رہے اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا' سورہ کے آغاز میں ہے:

ومن جاھد فانما یجاھد لنفسہ ط ان اللہ لغنی عن العلمین۔ (عنکبوت: ۱)

اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی

نفس کے لئے جہاد کرتا ہے' اللہ تو جہان والوں سے بے نیاز ہے۔

اور سورہ کے آخر میں فرمایا کہ ''ہمارے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول میں' یا ہماری خوشنودی کی طلب میں جو جہاد کرے گا اور محنت اٹھائے گا ہم اس کے لئے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دیں گے اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائیں گے' یہی مجاہدہ' کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے' سورۂ حج میں ارشاد ہوا:

(۱)۔ بحوالہ کنز العمال کتاب الجہاد ج ۲ ص ۲۸۵ حیدر آباد دکن۔

وجاهدوا في الله حق جهاده۔ هو اجتبكم وما جعل عليكم في الدين من حرج ملة ابيكم ابراهيم۔ (حج: ۱)

اور محنت کرو اللہ میں پوری محنت' اس نے تم کو چنا ہے' اور تمہارے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی' تمہارے باپ ابراہیم کا دین ہے۔

''یہ اللہ میں محنت اور جہاد کرنا'' جہاد اکبر ہے' جس پر ملت ابراہیمی کی بنا ہے' یعنی حق کی راہ میں عیش و آرام' اہل و عیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا' ترمذی' طبرانی' حاکم اور صحیح ابن حبان میں (۱)۔ مذکور ہے' کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابی سے فرمایا کہ ''المجاهد من جاهد نفسه۔'' یعنی ''مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔'' صحیح مسلم میں ہے' ایک دفعہ آپ ﷺ نے صحابہ سے پوچھا کہ ''تم پہلوان کس کو کہتے ہو۔'' عرض کیا ''جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں۔'' فرمایا ''نہیں پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔ (۲)۔ اور اس حریف کو زیر کر سکے' جس کا اکھاڑہ خود اس کے سینہ میں ہے۔

۲۔ جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے اس کا

دور کرنا ہر حق طلب کے لئے ضروری ہے' ایک انسان کے پاس گر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو فائدہ پہنچائے' تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ طمانیت نہیں پیدا ہو سکتی جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے' اسی لئے ارشاد ہوا کہ :

ادع الی سبیل ربك بالحکمت و الموعظت الحسنت و جادلهم بالتی هی احسن۔ (نمل:۳۶)

تو لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف آنے کا بلاوا حکمت و دانائی کی باتوں کے ذریعہ سے اور اچھی طرح سمجھا کر دے اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی اچھے اسلوب سے کر۔

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے' جہاد کی ایک قسم ہے اور اسی طریقہ دعوت کا نام ''جہاد بالقرآن'' ہے کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل' اپنی آپ موعظت' اور اپنے لئے آپ مناظرہ ہے' قرآن کے ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کیلئے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں محمد رسول اللہ ﷺ کو روحانی جہاد یعنی روحانی بیماریوں کی فوجوں کو شکست دینے کیلئے قرآن کی تلوار ہاتھ میں دی گئی اور اسی سے کفار و منافقین کے شکوک و شبہات کے پردوں کو ہزیمت دینے کا حکم دیا گیا' ارشاد ہوا:

فلا تطع الکفرین و جاهدهم به جهادا کبیرا (فرقان:۵)

تو کافروں کا کہا نہ مان اور بذریعہ قرآن کے تو ان سے جہاد کر بڑا جہاد۔

بذریعہ قرآن کے جہاد کر یعنی قران کے ذریعہ سے تو ان کا مقابلہ کر' اس قرآنی جہاد و مقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے ''جہاد کبیر'' بڑا جہاد اور بڑے زور کا مقابلہ فرمایا ہے' اس سے

اندازہ ہوگا کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن کی نظر میں کتنی ہے' علماء نے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے اور اس کو جہاد کا مہتم بالشان درجہ قرار دیا ہے' امام ابوبکر رازی حنفی نے احکام القرآن میں اس پر لطیف بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں

(۱)۔ ایضاً کتاب الایمان ج ۱ ص ۳۹ (۲)۔ صحیح مسلم باب من یملك نفسه عندالغضب جلد ۲ ص ۳۹۶' مصر۔

سے بڑھ کر ہے۔(۱)۔ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کیلئے عقل' فہم' علم اور بصیرت حاصل کرے' اور انکو اس راہ میں صرف کرے' اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آ سکتے ہوں' انکو اس لئے حاصل کرے کہ ان سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام دے گا' یہ علم کا جہاد ہے جو اہل علم پر فرض ہے۔

۳۔ جہاد بالمال: انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے اس کا منشاء بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے یہاں تک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل وعیال کے آرام و آسائش کے لئے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرضی کے لئے دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپے پر موقوف ہیں' اس لئے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جدوجہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے' اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لئے مسلمانوں کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے' آنحضرت ﷺ کی تعلیم وصحبت کی برکت سے صحابہ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سے سخت گھڑیوں میں جس طرح مالی جہاد کیا ہے' وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہیں اور انہیں سیرابیوں سے دین حق کا باغ چمن آرائے نبوت کے ہاتھوں سرسبز و شاداب ہوا اور اسی لئے اسلام میں ان بزرگوں کا بہت بڑا رتبہ ہے۔

ان الذین امنوا وھاجروا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ۔ (انفال:۷۲)

بے شک وہ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے جہاد کیا۔

قرآن پاک میں مالی جہاد کی تنبیہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیتیں ہیں، بلکہ بمشکل کہیں جہاد کا حکم ہوگا، جہاں اس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو، اور قابل لحاظ یہ امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشا گیا ہے، جیسے:

انفروا خفافا وثقالا وجاھدوا باموالکم و انفسکم فی سبیل اللہ ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون۔ (توبہ:۴۱)

ہلکے یا بھاری ہو کر جس طرح ہو نکلو، اور اپنے اور اپنی جان سے خدا کے راستے میں جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم کو معلوم ہو۔

انما المؤمنون الذین امنوا باللہ ورسولہ ثم لم یرتابوا وجاھدوا باموالھم و انفسھم فی سبیل اللہ اولئک ھم الصادقون۔ (حجرات:۱۵)

مومن وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے پھر اس میں شک نہیں کیا، اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستہ میں جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے ہیں۔

فضل اللہ المجاھدین باموالھم وانفسھم علی القعدین درجۃ۔ (نساء:۹۵)

اپنے مال اور نفس سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہنے

پر ایک درجہ کی فضیلت دی ہے۔

اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتیں ہیں:

میدان جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کیلئے ممکن نہیں، لیکن مالی شرکت ہر ایک کیلئے آسان ہے۔

(۱)۔ احکام القرآن رازی قسطنطنیہ جلد ۳ ص ۱۱۹

جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت پیش نہیں آتی ہے، لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے۔

انسانی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت، اس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آ جاتی ہے۔

گر جان طلبی مضایقہ نیست
گر زر طلبی سخن دریں است

اس لئے مال کو جان پر مقدم رکھ کر ہر قدم پر انسان کو اس کی اس کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے۔

۴۔ جہاد کی ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادائیگی میں اپنی جان و مال و دماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے، عورتیں حضور انور ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ! ہم کو غزوات کے جہاد میں شرکت کی اجازت دی جائے ارشاد ہوا کہ ''تمہارا جہاد نیک حج (۱)۔ ہے۔'' کہ اس مقدس سفر کے لئے سفر کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرنا، صنف نازک کا ایک جہاد ہی ہے، اسی طرح ایک صحابی یمن سے چل کر خدمت اقدس میں اس غرض سے حاضر ہوتے ہیں کہ کسی لڑائی کے جہاد میں شرکت کریں، آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تمہارے ماں باپ ہیں، عرض کی، جی ہاں، فرمایا ''ففیھما فجاھد'' تو تم انہیں کی خدمت میں جہاد کرو، (۲)۔ یعنی ماں باپ کی خدمت کرنا بھی جہاد ہے، اسی طرح خطرناک سے خطرناک موقع پر حق کے اظہار میں بے باک ہونا بھی جہاد

ہے آپؐ نے فرمایا:

ان من اعظم الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر۔ (ترمذی' ابواب الفتن)

ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے انصاف کی بات کہہ دینا ہے۔

۵۔اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس' یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا' جہاد کے ان تمام اقسام میں شامل ہے۔جن میں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو' اور اسکی آخری حد خطرات سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں نثار کر دینا ہے' نیز دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آ پڑے اور وہ حق کی مخالفت پر تل جائیں' تو ان کو راستہ سے ہٹانا اور اس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبہ کمال ہے' ایسے جانثار اور جانباز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو خدا کی راہ میں قربان کیا' وہ ہمیشہ کیلئے اس کو بخش دی جائے یعنی فانی حیات کے بدلہ اسی کو ابدی حیات عطا کر دی جائے' اسی لئے ارشاد ہوا:

ولا تقولوا لمن يقتل في سبيل الله اموات بل احياء ولكن لا تشعرون۔ (بقرہ: ۱۹)

جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ نہ کہو' بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو اس کا احساس نہیں۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الجهاد۔ (۲)۔ ابوداؤد و ترمذی کتاب الجهاد۔

آل عمران میں ان جانبازوں کی قدر افزائی ان الفاظ میں کی گئی:

ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا بل احياء عند ربهم يرزقون. فرحين بما اتهم الله من فضله و يستبشرون بالذين لم يلحقوا بهم من

خلفهم الا خوف عليهم ولا هم يحزنون۔ (آل عمران:۱۷۰)

جوخدا کی راہ مارے گئے ان کومردہ گمان نہ کر' بلکہ وہ زندہ ہیں' اپنے پروردگار کے پاس ان کوروزی دی جارہی ہے'خدا نے ان کواپنی جومہربانی عطا کی ہے اس پر وہ خوش ہیں'اور جواب تک ان سے اس زندگی میں ہونے کی وجہ سے نہیں ملے ہیں ان کوخوشخبری دیتے ہیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہے'نہ وہ غم میں ہیں۔

ان جانثاروں کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''شہید'' ہے یہ عشق ومحبت کی راہ کے شہید زندۂ جاوید ہیں۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدئہ عالم دوام ما

یہ اپنے اسی خونی گلگوں پیراہن میں قیامت کے دن اٹھیں (۱)۔گے'اورحق کی جوعملی شہادت اس زندگی میں انہوں نے ادا کی تھی'اس کا صلہ اس زندگی میں پائیں گے ولیعلم الذین امنواویتخذ منکم شھدآء (آل عمران:۱۴۰) اسی کے ساتھ وہ جانباز بھی جو گواپنا سر ہتھیلی پر رکھ کرمیدان میں اترے تھے'لیکن ان کے سر کا ہدیہ دربار الٰہی میں اس وقت اس لئے قبول نہ ہوا کہ ابھی ان کی دنیاوی زندگی کا کارنامہ ختم نہیں ہوا تھا وہ بھی اپنے حسن نیت کی بدولت رضائے الٰہی کی سند پائیں گے'اسی لئے ان کو عام مسلمان ادب وتعظیم کے لئے ''غازی'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں:

ومن یقاتل فی سبیل اللہ فیقتل او یغلب فسوف نئوتیہ اجرا عظیما۔ (نساء:۱۰)

اور جوخدا کی راہ میں لڑتا ہے'وہ پھر یا مارا جاتا ہے یا وہ غالب

آتا ہے تو ہم اس کو بڑا بدلہ عنایت کریں گے۔

فالذین ھاجروا واخرجوا من دیارھم واوذوا فی سبیلی وقتلوا لاکفرن عنھم سیئاتھم ولادخلنھم جنت تجری من تحتھا الانھر لوابا من عندالله والله عنده حسن الثواب۔ (آل عمران: ۲۰)

تو جنہوں نے میری خاطر گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ان کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں اور وہ لڑے اور مارے گئے ہم ان کے گناہوں کو چھپا دیں گے اور ان کو جنت میں داخل کریں گے جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی خدا کی طرف سے ان کو یہ بدلہ ملے گا اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

ان آیات کی تفسیر وتشریح میں آنحضرت ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ احادیث میں مذکور ہے جس میں شہیدوں کی فضیلتیں اور ان آخروی نعمتوں کی تفصیل نہایت مموثر الفاظ میں ہے، اسی شہادت اور غزا کے عقیدے نے مسلمانوں میں مشکلات کے مقابلہ اور دشمنوں سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کر دی جس کی زندگی اور تازگی کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی وہی عالم ہے یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانوں کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آمادہ کر دیتا ہے اور اس حیات جاوید کی تلاش میں ہر مسلمان بیتاب نظر آتا ہے یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت ﷺ نے ظاہر کی اور فرمایا کہ "مجھے آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں اور دوبارہ مجھے زندگی ملے اور میں اس کو بھی قربان کر دوں اور پھر تیسری زندگی ملے اور اس کو بھی میں خدا کی راہ میں نثار کر دوں۔ (۲)" ذرا ان فقروں پر ایک بار اور نگاہ ڈال لیجئے، ان میں یہ نہیں ہے کہ میں دوسرے کو مار ڈالوں بلکہ یہ ہے کہ حق کے راستہ میں میں مارا

جاؤں اور پھر زندگی ملے اور پھر مارا جاؤں پھر زندگی ملے اور پھر مارا جاؤں۔

کشتگان خنجر تسلیم را

ھر زماں از غیب جان دیگر است

(۱)۔ صحیح مسلم کتاب الجھاد (۲)۔ ایضاً

دائمی جہاد::

یہ تو وہ جہاد ہے جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہیں آتا اور جس کو آتا بھی ہے تو عمر میں ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے مگر حق کی راہ میں دائمی جہاد وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آ سکتا ہے اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر امتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت علم دین کی اشاعت' حق کی نصرت' غریبوں کی مدد' زیر دستوں کی امداد' سیہ کاروں کی ہدایت امر بالمعروف نہی عن المنکر اقامت عدل' رد ظلم اور احکام الٰہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے' یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش وسکون' ایک جہاد بن جائے اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے' سورۂ آل عمران کی جس میں جہاد کے مسلسل احکام ہیں' آخری آیت ہے:

یایھا الذین امنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔ (آل عمران: ۲۰)

اے ایمان والو! مشکلات میں ثابت قدم رہو' اور مقابلہ میں مضبوطی دکھاؤ اور کام میں لگے رہو' اور خدا سے ڈرو' شاید کہ تم مراد کو پہنچو۔

یہی وہ جہاد محمدی ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی اور فتح وفیروزی کا نشان ہے۔

عبادات قلبی

یہ اسلام کی ان عبادات کا بیان تھا جو جسمانی ومالی کہلاتی ہیں' گو کہ دل کے اخلاص کا

شمول ان میں بھی ہے لیکن اسلام میں بعض ایسی عبادات بھی ہیں جن کا تعلق تمام تر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے، پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں ہر نیکی کا کام عبادت ہے اس لئے تمام امور خیر، خواہ وجسمانی یا مالی یا قلبی ہوں عبادات کے اندر داخل ہیں، فقہاء نے صرف جسمانی اور مالی عبادات سے کی ہے لیکن حضرات صوفیا نے جسمانی اور مالی عبادات کے ساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے، اصل یہ ہے کہ فقہاء نے اپنا فرض منصب صرف جسمانی اور مالی فریضوں تک محدود رکھا ہے اور صوفیا نے ان سارے فریضوں کو یکجا کیا ہے جن سے اسلام نے انسان کے قلب وروح کی درستی کا کام لیا ہے، پیش نظر تصنیف نہ تو فقہ کی کوئی کتاب ہے، اور نہ تصوف کی، اس کا مقصود ان فرائض کو بتانا ہے جن کی تاکید وتوصیف قرآن پاک نے بار بار کی ہے اور اسی تاکید وتوصیف سے ہم کو اسلام میں ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

اس قسم کے چند فرائض جن کا مرتبہ عبادات پنجگانہ کے بعد قرآن پاک میں سب سے زیادہ نظر آتا ہے "تقوی اخلاص، توکل، صبر اور شکر ہیں، یہ وہ فرائض ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور اسی لئے ان کا نام "قلبی عبادات" رکھا جا سکتا ہے، یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہیں جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات پنجگانہ بھی جن پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے، جسد بے روح بن جاتے ہیں، یہ بات گو یہاں بے محل ہے مگر کہنے کے قابل ہے کہ فقہ اور تصوف کی ایک دوسرے سے علیحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے روح اور دوسری طرف اعمال تصوف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے۔

ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر شر کی تمیز کے لئے خلش ہو "تقوی" ہے، پھر اس کام کو خدائے واحد کی رضامندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے یہ "اخلاص" ہے، پھر

اس کام کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ رہے، یہ ''توکل'' ہے، اس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں یا نتیجہ مناسب حال برآمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے اور خدا سے آس نہ توڑی جائے اور اس راہ میں اپنے برا چاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہا جائے۔ یہ ''صبر'' ہے، اور اگر کامیابی کی نعمت ملے تو اس پر مغرور ہونے کی بجائے اس کو خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے اور جسم و جان اور زبان سے اس کا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے یہ ''شکر'' ہے۔

ذیل کی سطروں میں اسی اجمال کی تفصیل آتی ہے۔

تقوی

تقوی سارے اسلامی احکام کی غایت ہے::

اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقوی سے ادا کر سکتے ہیں' اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اس تقوی کی روح کو پیدا کرنا ہے' قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں' جو تقوی والے ہیں:

ھدی للمتقین۔ (بقرہ: ۱)

یہ کتاب تقوی والوں کو راہ دکھاتی ہے۔

اسلام کی ساری عبادتوں کا منشاء اسی تقوی کا حصول ہے:

یایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم و الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔ (بقرہ:۳)

اے لوگو اپنے اس پروردگار کی جس نے تم کو اور تمہارے پہلو کو پیدا کیا' عبادت کرو' تا کہ تم تقوی پاؤ۔

حج کا منشا بھی یہی ہے:

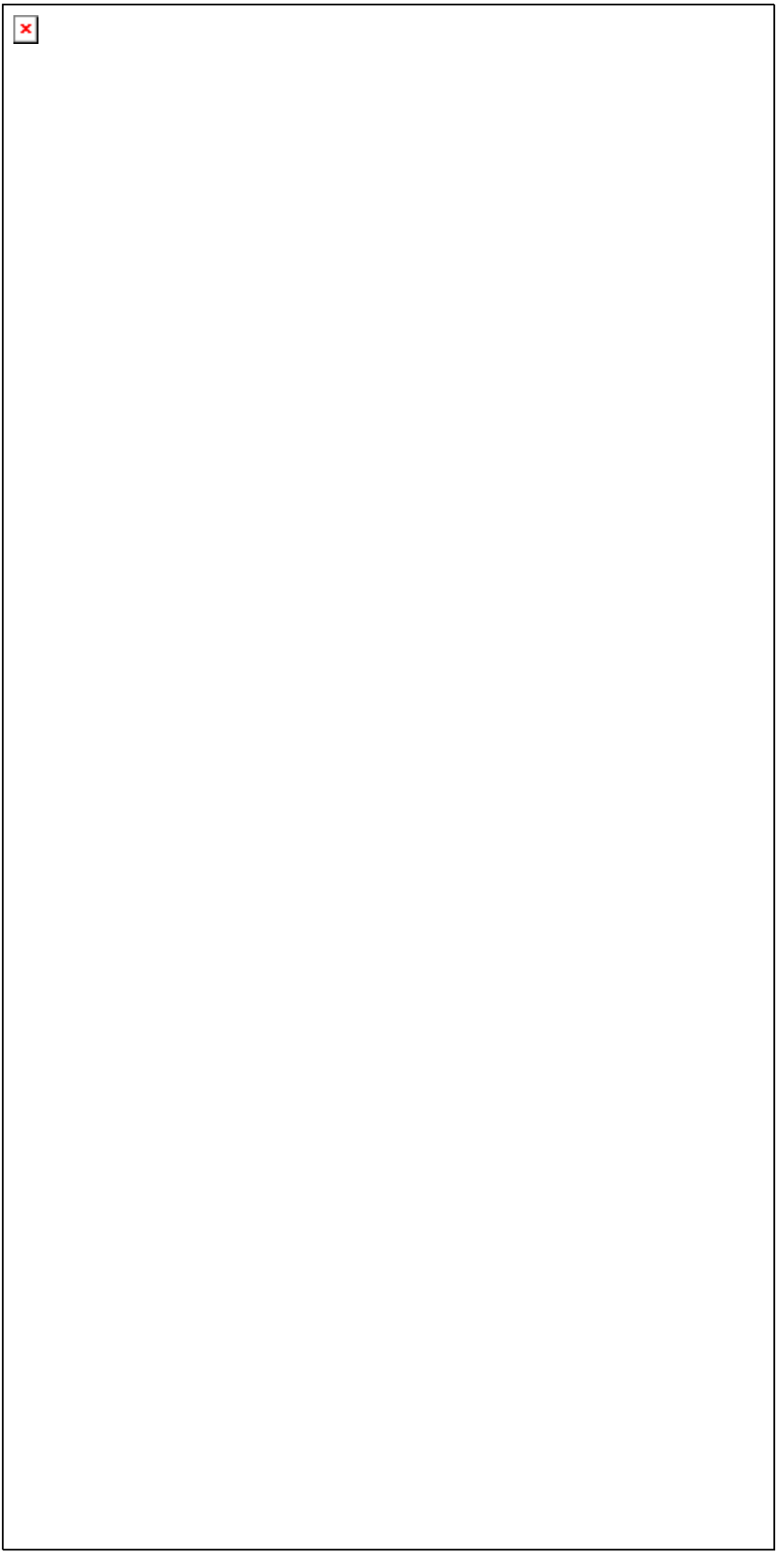
ومن یعظم شعائر فانھا من تقوی القلوب۔ (حج:۴)

اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان ومقامات) کی عزت کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقوی سے ہے۔

قربانی بھی اسی غرض سے ہے:

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماء ھا ولکن ینالہ التقوی منکم۔ (حج:۵)

خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا' لیکن تمہارا



اور اگر صبر کرو اور تقوی کرو تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔

تتقوا و تصلحوا بین الناس۔ (بقرہ:۲۸)

اور تقوی کرو اور لوگوں کے درمیان صلح کراؤ۔

وان تحسنوا و تتقوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرا۔ (نساء:۱۹)

اور اگر اچھے کام کرو اور تقوی کرو تو اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔

اہل تقوی تمام اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں::

آخرت کی ہر قسم کی نعمتیں انہیں تقوی والوں کا حصہ ہے:

ان المتقین فی مقام امین۔ (دخان:۴)

بے شبہ تقوی والے امن وامان کی جگہ میں ہوں گے۔

ان المتقین فی جنت و نعیم۔ (طور:۱)

بے شک تقوی والے باغوں میں اور نعمت میں ہوں گے۔

ان المتقین فی جنت و عیون۔ (ذاریات:۱)

شک نہیں کہ تقوی والے باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔

ان المتقین فی جنت و نہر۔ (قمر:۱)

بلاشبہ تقوی والے باغوں اور نہروں میں ہوں گے۔

ان المتقین فی ظلل و عیون۔ (مرسلات:۱)

بلاشک تقوی والے سایوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔

ان للمتقین عند ربھم جنت النعیم۔ (ن:۲)

یقیناً تقوی والوں کے لئے ان کے پروردگار کے پاس نعمت

کے باغ ہیں۔

ان للمتقین مفازا۔ (نبا: ۲)

بے شبہ تقوی والوں کے لئے کامیابی ہے۔

ان للمتقین لحسن مباب۔ (ص: ۴)

لاریب تقوی والوں کے لئے بازگشت کی اچھائی ہے۔

کامیابی اہل تقوی کیلئے ہے::

گو بظاہر ابتداء میں اہل تقوی کو کسی قدر مصیبتیں اور بلائیں پیش آئیں' یا بہت سی حرام اور مشتبہ لیکن بظاہر بہت سی عمدہ چیزوں سے محروم ہونا پڑے' ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششوں اور ناروا راستوں سے پرہیز کرنا پڑے' اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ ان کو مال و دولت عزت وشہرت اور جاہ ومنصب سے محرومی رہی لیکن دنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی دنیا کے ظاہری ثمروں کی بنا پر کام کے اچھے برے نتیجوں کا فیصلہ کر لینا چاہئے۔ حالانکہ جو جتنا دور بین ہے اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری نتیجہ پر نگاہ رکھتا ہے' حقیقی دور بین اور عاقبت اندیش وہ ہیں جو کام کی اچھائی برائی کا فیصلہ دینا کے ظاہری چند روزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ آخرت کی دائمی اور دیرپا فائدہ کی بنا پر کرتے ہیں' اور جب ان کی نظر آخرت کے ثمروں پر رہتی ہے تو دنیا بھی ان کی بن جاتی ہے' اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیابی اور فوز وفلاح انہیں کی قسمت میں ہوتی ہے' فرمایا:

والعاقبہت للمتقین۔ (اعراف: ۱۵)

اور آخری انجام تقوی والوں کیلئے ہے۔

ان العاقبہت للمتقین۔ (ہود: ۴)

بے شبہ انجام کار تقوی والوں کیلئے ہے۔

والاخرہت عند ربك للمتقین۔ (زخرف:۳۵)

اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک تقوی والوں کیلئے ہے۔

والعاقبہت للتقوی۔ (طہ:۷۶)

اور انجام کار تقوی کیلئے ہے۔

اہل تقوی اللہ کے محبوب ہیں::

یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہیں' جب وہ کلام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں' اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف یا انعام یا ہر دلعزیزی کی صورت میں نہیں چاہتے' تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں میں بھی ان کی ساتھ عقیدت' محبت اور ہر دلعزیزی پیدا ہوتی ہے۔

ان اولیاء الا المتقون۔ (انفال:۳۴)

تقوی والے ہی خدا کے دوست ہیں۔

فان اللہ یحب المتقین۔ (آل عمران:۷۶)

تو اللہ بے شک تقوی والوں کو پیار کرتا ہے۔

ان اللہ یحب المتقین۔ (توبہ:۴)

اللہ بلاشبہہ تقوی والوں کو پیار کرتا ہے۔

واللہ یحب المتقین۔ (جاثیہ:۱۹)

اور اللہ تقوی والوں کا دوست ہے۔

معیت الٰہی سے سرفراز ہیں::

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معیت کے شرف سے ممتاز اور اس کی نصرت و مدد سے سرفراز ہوتے ہیں' اور جس کے ساتھ اللہ ہو اس کو کون شکست دے سکتا ہے۔

واعلموا ان اللہ مع المتقین۔ (بقرہ:۲۴)

اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ تقوی والوں کے ساتھ ہے۔

(توبہ:۱۶)

اور یقین مانو کہ لاریب اللہ تقوی والوں کے ساتھ ہے۔

قبولیت اہل تقوی ہی کو حاصل ہے::

ایک کام ہزاروں اغرض اور سینکڑوں مقاصد کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے' مگر ان میں اللہ تعالی صرف انہیں کے کاموں کی پیشکش کو قبول فرماتا ہے' جو تقوی کے ساتھ اپنے کام انجام دیتے ہیں' فرمایا:

انما یتقبل اللہ من المتقین۔ (مائدہ:۶)

اللہ تو تقوی والوں ہی سے قبول فرماتا ہے۔

اس لئے انہیں کے کاموں کو دنیا میں بھی بقا' قیام اور ہر دلعزیزی نصیب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی۔

تقوی والے کون ہیں::

یہ جان لینے کے بعد کہ تقوی ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت' اور وہی سارے اسلامی تعلیمات کی روح ہے اور دین کی تمام نعمتیں اہل تقوی ہی کے لئے ہیں' یہ جاننا ہے کہ تقوی والے کون ہیں' قرآن پاک نے اس سوال کا بھی جواب دے دیا ہے' چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے جو سورۂ زمر میں ہے:

والذی جاء بالصدق و صدق بہ اولئك ھم المتقون۔

لھم ما یشائون عند ربھم۔ذلك جزآء المحسنین۔

(زمر:۴)

اور جو سچائی لے کر آیا اور اس کو سچ مانا' وہی لوگ ہیں تقوی والے ان کے لئے ان کے رب کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں'

یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا۔

یعنی تقوی والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ مانے وہ کسی کام میں ظاہری فائدوں فوری ثمرہ، مال و دولت اور جاہ وعزت کے نقطہ پر نہیں بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو، مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادو سے بال بھر ہٹنا نہیں چاہتا، لیکن اہل تقوی کا پورا حلیہ سورۂ بقرہ میں ہے:

ولکن البر من امن باللہ والیوم الاخر والملئکہت والکتب والنبین واتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتمی والمسکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب۔ واقام الصلوہت واتی الزکوہت والموفون بعدھم اذا عاھدوا وجو الصبرین فی البساء والضوآء وحین البساط اولئک الذین صدقوا و اولئک ھم المتقون. (بقرہ: ۲۲)

لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر، اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر، ایمان لایا اور اپنا مال اس کی محبت پر رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافر اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کے آزاد کرانے میں دیا، اور نماز کو برپا کیا، اور زکوۃ ادا کی، اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو ایفاء کرنے والے ہیں اور سختی، تکلیف اور لڑائی میں صبر کرنے والے ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے ٹھہرے، اور یہی تقوی والے ہیں۔

ان آیتوں میں تقوی والوں کا نہ صرف عام حلیہ، بلکہ ایک ایک خط وخال نمایاں کر دیا گیا، اور بتایا گیا ہے کہ یہی خدا کی نگاہ میں سچے ٹھہرنے والے اور تقوی والے ہیں۔

تقوی کی حقیقت کیا ہے::

تقوی اصل میں وقوی ہے عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں لیکن وحی محمدی ﷺ کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالی کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر وشر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے یہ بات کہ تقوی اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکان حج کے بیان کے موقع پر ہے:

ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب۔

(حج:۴)

اور جو شعائر الٰہی کی تعظیم کرتے ہیں تو وہ دلوں کے تقوی سے ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقوی کا اصلی تعلق دل سے ہے اور وہ سلبی کیفیت (بچنا) کے بجائے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے وہ امور خیر کی طرف دلوں میں تحریک پیدا اور شعائر الٰہی کی تعظیم سے ان کو معمور کرتا ہے ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہے:

ان الذین یغضون اصواتھم عند رسول اللہ اولئک الذین امتحن اللہ قلوبھم للتقوی لھم مغفرہت واجر عظیم۔ (حجرات:۱)

بے شک جو لوگ رسول اللہ کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقوی کے واسطے جانچا

ہے ان کو معافی ہے اور بڑا بدلہ۔

اس آیت میں بھی تقوی کا مرکز دل ہی کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ رسول ﷺ کی تعظیم کا احساس تقوی سے پیدا ہوتا ہے' ایک اور تیسری آیت میں تقوی کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے:

فالهمها فجورها وتقوها۔ (الشمس: ۱)

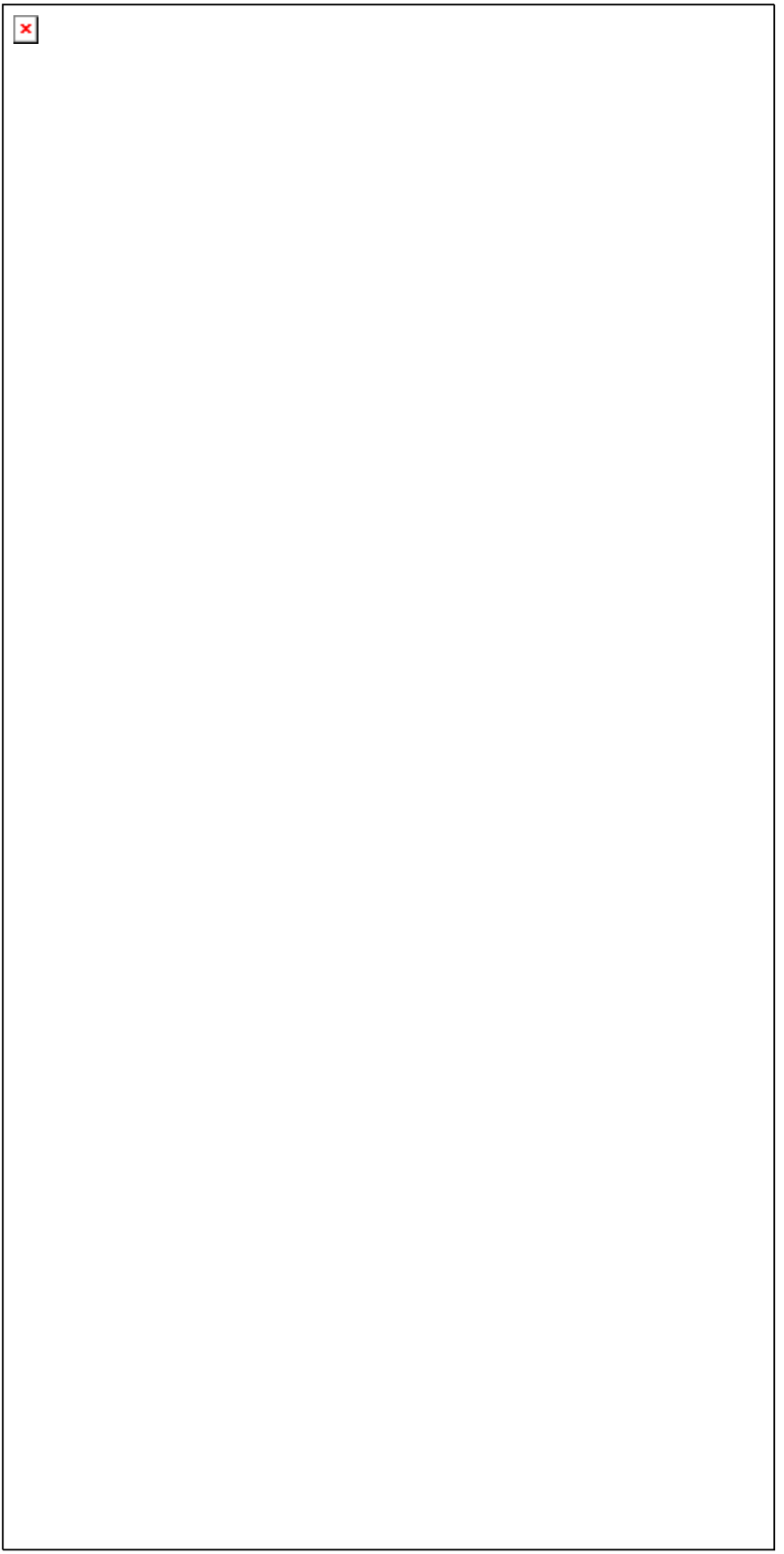
تو ہر نفس میں اس کا فجور اور اس کا تقوی الہام کر دیا۔

فجور تو ظاہر ہے کہ گنہگاری اور نافرمانی کی جڑ ہے' ٹھیک اسی طرح تقوی تمام نیکیوں کی بنیاد' اور اصل الاصول ہے اور دونوں بندہ کو فطرۃ ودیعت ہیں' اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا ہے اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے' مگر بہر حال یہ دونوں الہام ربانی ہیں' اور سب کو معلوم ہے کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے' اسی لئے یہی تقوی کا مقام ہے۔

تقوی کا لفظ جس طرح اس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے' اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاق پایا جاتا ہے' صحابہؓ نے کفار کے اشتعال دلانے اور ان سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا' تو اللہ تعالی نے ان کی اس مستحسن روش کو تقوی فرمایا:

اذ جعل الذين كفروا في قلوبهم الحمية حمية الجاهلية فانزل الله سكينته على رسوله وعلى المؤمنين والزمهم كلمة التقوى وكانوا احق بها واهلها۔ (فتح: ۴)

اور جب کفار نے اپنے دلوں میں پچ رکھی' نادانی کی پچ' تو اللہ نے اپنا چین اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اتارا' اور ان کو تقوی کی بات پر لگا رکھا' اور وہی تھے اس کے لائق اور اس



تقوی یہاں ہے۔

اور یہ کہہ کر دل کی طرف اشارہ فرمایا' جس سے بے شک وشبہہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تقوی دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے' جو تمام نیکیوں کی محرک ہے' اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے' اور یہی سبب ہے کہ قرآن پاک کی راہنمائی کی غایت' ساری ربانی عبادتوں کا مقصد اور تمام اخلاقی تعلیموں کا ماحصل قرار پایا۔

اسلام میں برتری کا معیار::

اسلام میں تقوی کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اثر یہ ہے کہ تعلیم محمدی ﷺ نے نسل' رنگ' وطن' خاندان' دولت' حسب نسب' غرض نوع انسانی کے ان صدہا خود ساختہ اعزازی مرتبوں کو مٹا کر صرف ایک ہی امتیازی معیار قائم کر دیا' جس کا نام تقوی ہے اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے' اور اس لئے وہی معیار امتیاز بننے کے لائق ہے' چنانچہ قرآن پاک نے ببانگ بلند یہ اعلان کیا:

جعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عنداللہ اتقکم۔ (حجرات:۲)

ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے صرف اس لئے بنایا کہ باہم شناخت ہو سکے' تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقوی والا ہے۔

اس اعلان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دو مختصر لفظوں میں ادا فرمایا کہ ''الکرم التقوی۔'' یعنی بزرگی وشرافت تقوی کا نام ہے' اور اسی کے لئے حجتہ الوداع کے اعلان عام میں پکار کر فرمایا کہ ''عرب کو عجم پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں' برتر وہ ہے جس میں سب سے زیادہ تقوی ہے۔''

اخلاص

مخلصین له الدین۔(قرآن)

مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے' اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغہ گوشت سے وابستہ ہے' عقائد ہوں یا عبادات' اخلاق ہوں یا معاملات انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اس کی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے' اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے:

الا وان فی الجسد مضغہت اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب۔ (۱)۔

ہشیار ہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے اور وہ خراب ہو تو سارا بدن خراب ہوتا ہے' ہوشیار رہو کہ وہ دل ہے۔

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے فعل کی بنیاد اور اساس ہے' اس لئے مذہب کی ہر عمارت اس بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے' اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے اس کا محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو اور نہ اس سے مقصود ریا و نمائش جاہ منفعت' طلب شہرت یا طلب معاوضہ وغیرہ ہو' بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم بجا آوری اور خوشنودی ہو' اسی کا نام اخلاص ہے' رسول کو حکم ہوتا ہے: فاعبداللہ مخلصا لہ الدین۔الا للہ الدین الخالص (زمر:۱) (تو اللہ کی عبادت کر خالص کرتے ہوئے اطاعت گزاری کو اسی کے لئے' ہشیار ہو کہ اللہ ہی کے لئے ہے خالص اطاعت گزاری۔)

مقصود یہ ہے کہ خدا کی اطاعت گزاری میں' خدا کے سوا کسی اور چیز کو اس کا شریک نہ

بنایا جائے۔ وہ چیز خواہ پتھر' یا مٹی کی مورت' یا آسمان و زمین کی کوئی مخلوق یا دل کا تراشا ہوا کوئی باطل مقصود ہو اسی لئے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض و غایت کو بھی بت پرستی قرار دیا ہے' فرمایا:

ارایت من اتخذ الھہ ھوبہ۔ (فرقان: ۴)

کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنالیا ہے۔

چنانچہ اسلام کی یہ اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری و باطنی بت پرستی سے پاک ہو' رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے:

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الایمان باب من استبرالدینہ و صحیح مسلم باب اخذ الحلال وترک الشبہات۔

قل انی امرت ان اعبداللہ مخلصا لہ الدین وامرت لان اکون اول المسلمین۔ قل انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم' قل اللہ اعبد مخلصا لہ دینی فاعبدوا ماشئتم من دونہ۔ (زمر: ۲)

کہہ دے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اطاعت گزاری کو اللہ کے لئے خاص اس کی عبادت کروں' اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں پہلا فرمانبردار بنوں' کہہ دے کہ میں ڈرتا ہوں' اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں' بڑے دن کے عذاب سے کہہ دے کہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں' اپنی اطاعت گزاری کو اس کے لئے خالص کر کے تو تم (اے کفار) خدا کو چھوڑ کر جس کی عبادت چاہئے کرو۔

قرآن پاک کے سات موقعوں پر یہ آیت ہے:

مخلصین لہ الدین۔

اطاعت گزاری کو خدا کے لئے خالص کر کے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لئے ہو' یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بت پرستی اور خواہش نفسانی کو دخل نہ ہو اور الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلی۔ (لیل:۱) یعنی خدائے برتر کی ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو۔

انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں' اس سے ہم کو کوئی دنیاوی غرض اور ذاتی معاوضہ مطلوب نہیں:

وما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی رب العلمین۔ (شعراء:۱۰۹،۱۰۸،۱۰۷،۱۰۶)

اور میں اس پر کوئی مزدوری تم سے نہیں چاہتا میری مزدوری تو اسی پر ہے جو ساری دنیا کا پروردگار ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے بھی یہی فرمایا گیا:

یقوم لا اسئلکم علیہ مالا ان اجری الا علی اللہ۔ (ہود:۲۹)

اے میری قوم! میں تم سے اس پر دولت کا خواہاں نہیں میری مزدوری تو خدا ہی پر ہے۔

خود ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہہ دینے کا فرمان ہوا' میں تم سے اپنے لئے کوئی مزدوری و اجرت نہیں چاہتا اگر چاہتا بھی ہوں تو تمہارے ہی لئے:

قل ما سالتکم من اجر فھو لکم۔ ان اجری الا علی اللہ وھو علی کل شی ء شھید۔ (سبا:۴۷)

کہہ دے کہ میں نے تم سے جو اجرت چاہی تو وہ تمہارے ہی لئے میری اجرت تو اللہ پر ہے' وہ ہر بات پر گواہ ہے۔

یعنی وہ ہر بات کا عالم اور نیتوں سے واقف ہے' وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش بے غرض اور صرف خدا کے لئے ہے' دوسری جگہ فرمایا:

لا اسئلکم علیہ اجرا الا لمودہت فی القربی۔

(شوریٰ:۳)

میں اس پر تم سے کوئی مزدوری نہیں چاہتا مگر قرابت داروں میں محبت رکھنا۔

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششوں سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے پہنچائے' اس کے لئے وہ تم سے کسی ذاتی منفعت کا خواہاں نہیں' اگر وہ اس کے معاوضہ میں کچھ چاہتا ہے تو یہ ہے کہ قرابت داروں کا حق ادا کرو' اور آپس میں محبت رکھو۔

اس قسم کی بات ایک اور آیت میں ظاہر کی گئی ہے:

قل ما اسئلکم علیہ من اجر الا من شاء ان یتخذ الی ربہ سبیلا۔ (فرقان:۵)

کہہ دے کہ میں تمہاری اس رہنمائی پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا' مگر یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ پکڑے۔

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ حق قبول کر لیں۔

دنیا میں بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے' کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے' لیکن اگر اس کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ اس مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض یا محض دکھاوا اور نمائش تھا تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً نگاہوں سے گر جائے گی' اسی طرح روحانی عالم میں بھی خدا کی نگاہ میں اس چیز کی کوئی قدر نہیں جو اس کی بارگاہ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کے لئے پیش کی گئی ہو' مقصود اس سے یہ ہے کہ نیکی کا

ہر کام دنیاوی لحاظ سے بے غرض و بے منت اور بلا خیال مزدور اجرت اور تحسین و شہرت کی طلب سے بالاتر ہو' یہ تحسین و شہرت کا معاوضہ بھی دیں تو الگ رہا دنیا بھی انہیں کو عطا کرتی ہے جن کی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا کام انہیں شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے۔

ہم جو کام بھی کرتے ہیں اس کی دو شکلیں پیدا ہوتی ہیں' ایک مادی جو ہمارے ظاہری جسمانی اعضاء کی حرکت و جنبش سے پیدا ہوتی ہے' دوسری روحانی جس کا ہیولی ہمارے دل کے ارادہ و نیت' اور کام کی اندرونی و غرض و غایت سے تیار ہوتا ہے' کام کی بقاء اور برکت دین اور دنیا دونوں میں اس روحانی پیکر کے حسن و قبح اور ضعف و قوت کی بنا پر ہوتی ہے' انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہے' اسی لئے اس اخلاص کے بغیر اسلام میں نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ اخلاق و معاملات عبادت کا درجہ پاتے ہیں' اس لئے ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر غیر مخلصانہ غرض و غایت سے بالا' اور ہر دنیاوی مزدور اجرت سے پاک رکھیں' تورات اور قرآن دونوں میں ہابیل اور قابل آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصہ ہے دونوں نے خدا کے حضور میں اپنی اپنی پیداوار کی قربانیاں پیش کیں' خدا نے ان میں سے صرف ایک کی قربانی قبول کی اور اسی کی زبان سے سے اپنا یہ ابدی اصول بھی ظاہر فرما دیا:

انما یتقبل اللہ من المتقین۔ (مائدہ:۵)

خدا تو متقیوں ہی سے قبول کرتا ہے۔

متقی بھی وہی ہوتے ہیں جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لئے کام کرتے ہیں' انہیں کا کام قبول ہوتا ہے اور ان کو دین و دنیا میں فوز و فلاح بخشا جاتا ہے ان کو خدا کے ہاں محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور دنیا میں ان کو ہر دلعزیزی ملتی ہے' ان کے کاموں کو شہرت نصیب ہوتی ہے اور ان کے کارناموں کو زندگی بخشی جاتی

ہے وہ جماعتوں اور قوموں کے محسن ہوتے ہیں لوگ ان کے کاموں سے نسلاً بعد نسلٍ فیض یاب ہوتے ہیں اور ان کے لئے رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں' حضرت موسیٰؑ کے عہد میں فرعونیوں کو ایک پیغمبر اور جادوگر کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا کہ ان دونوں سے انہوں نے عجائب وغرائب امور کا یکساں مشاہدہ کیا' خدا نے فرمایا ان دونوں کے عجائب وغرائب میں ظاہری نہیں باطنی صورت کا فرق ہے ایک کے کام کی غرض صرف تماشا اور بازی گری ہے اور دوسرے کا نتیجہ ایک پوری قوم کی اخلاق وروحانی زندگی کا انقلاب ہے' اسی لئے یہ فیصلہ ہے کہ :

ولا یفلح الساحر حیث اتی ۔ (طٰہٰ:۳)

اور جادوگر جدھر بھی آئے فلاح نہیں پائے گا۔

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مصر کے جادوگروں کے حیرت انگیز کرتب صرف کہانی بن کر رہ گئے اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات نے ایک نئی قوم' ایک نئی شریعت' ایک نئی زندگی' ایک نئی سلطنت پیدا کی جو مدتوں تک دنیا میں قائم رہی۔

غرض عمل کا اصلی پیکر وہی ہے جو دل کے کارخانہ میں تیار ہوتا ہے اسی لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لیا جائے' اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود حل ہو جائے گا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لئے ارادہ اور نیت کو کیوں ضروری قرار دیا ہے۔

توکل

فتوکل علی اللہ۔(آل عمران)

توکل قرآن پاک کی اصطلاح کا اہم لفظ ہے عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لئے جدوجہد اور کوشش نہ کی جائے' بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں کسی حجرے یا خانقاہ میں بیٹھ رہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کرے گا' یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو رہے گا' اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں' لیکن یہ سراسر وہم ہے اور مذہبی اپاہجوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے' جس کو اسلام سے ذرہ بھی تعلق نہیں۔

توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں' لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا' کسی کام کے کرنے میں یا نہ کرنے میں؟ جھوٹے صوفیوں نے ترک عمل' اسباب وتدابیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کر کے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے' حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورا ارادہ وعزم اور تدبیر کوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا اگر اس کام میں بھلائی ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں ضروری ہم کو کامیاب فرمائے گا۔

اگر تدبیر اور جدوجہد وکوشش کا ترک ہی توکل ہوتا ہے تو دنیا میں لوگوں کو سمجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو مبعوث نہ کرتا اور نہ ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لئے جدوجہد اور سعی وسرگرمی کی تاکید فرماتا اور نہ اس راہ میں جان ومال کی قربانی کا حکم دیتا' نہ بدر واحد اور خندق وحنین میں سواروں تیراندازوں' زرہ پوشوں اور تیغ آزماؤں کی ضرورت پڑتی اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی۔

توکل مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل پیش آئے۔تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ لے لو' مشورہ کے بعد

جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اس کے انجام دینے کا عزم کرلو' اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کر دو' اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حسب خواہ نتیجہ پیدا کرے گا' اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی حکمت و مصلحت اور مشیت سمجھو' اور اس سے مایوس اور بودے نہ بنو' اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جد و جہد کا نتیجہ اور اثر ہے بلکہ یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا تم پر فضل و کرم ہوا' اور اسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا' آل عمران میں ہے:

وشاورهم في الامر فاذا عزمت فتوكل على الله ان الله يحب المتوكلين ان ينصركم الله فلا غالب لكم وان يخذلكم فمن ذالذي ينصركم من بعده وعلى الله فليتوكل المؤمنون۔ (آل عمران:۱۷۹)

اور کام (یا لڑائی) میں ان سے مشورہ لے لو' پھر جب پکا ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ رکھو' بیشک اللہ (اللہ پر) بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آ سکے گا' اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اسکے بعد تمہاری مدد کر سکے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ رکھیں۔

ان آیات نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کر دی' کہ توکل بے دست و پائی اور ترک عمل کا نہیں' بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم و ارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا مددگار ہے تو کوئی ہم کو ناکام نہیں کر سکتا' اور اگر وہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش و

مددگار آمد نہیں ہوسکتی اس لئے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام میں خدا پر بھروسہ رکھے۔

منافق اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور راتوں کو جوڑ توڑ کرتے ہیں، حکم ہوتا ہے کہ ان کی ان مخالفانہ چالوں کی پروا نہ کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو، وہی تمہارے کاموں کو بنائے گا۔

فاعرض عنهم وتوكل على الله وكفى بالله وكيلا۔ (نساء: ۱۱)

تو ان منافقوں سے درگزر کر اور خدا پر بھروسہ رکھ اور اللہ ہے کام بنانے والا۔

آغاز اسلام کے شروع میں تین برس کی مخفی دعوت کے بعد جب اسلام کی اعلانیہ دعوت کا حکم ہوتا ہے تو مخالفوں کی کثرت اور دشمنوں کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دی جاتی ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ ان مشکلات کی پروا کئے بغیر خدا پر توکل اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دو۔

وانذر عشيرتك الاقربين۔ واخفض جناحك لمن اتبعك من المئومنين فان عصوك فقل انى برى مما تعملون وتوكل على العزيز الرحيم الذى يرك حين تقوم وتقلبك فى السجدين۔ (شعراء: ۱۱)

اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ہشیار کر، اور مومنوں میں سے جو تیری پیروی کرے اس کیلئے اپنی (شفقت) کا بازو جھکا، پھر اگر وہ تیرا کہا نہ مانیں تو کہہ دے کہ میں تمہارے کاموں سے الگ ہوں اور اس غالب رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو دیکھتا ہے، جب تو رات کو اٹھتا ہے، اور نمازیوں میں تیری

آمد و رفت کو ملاحظہ کرتا ہے۔

دشمنوں کے نرغہ میں ہونے کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تنہائی میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر عبادت گزار مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے' یہ جرأت اور بے خوفی اسی توکل کا نتیجہ تھی' مشکلات میں اسی توکل اور اللہ پر اعتماد کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے احزاب میں منافقوں اور کافروں کی مخالفانہ کوششوں سے بے پروا ہو کر اپنے کام میں لگے رہنے کا جہاں حکم دیا گیا ہے' وہاں' اسی توکل کا سبق پڑھایا گیا ہے۔

یایھا النبی اتق اللہ ولا تطع الکافرین والمنفقینط ان اللہ کان علیما حکیما۔ واتبع ما یوحی الیک من ربکط ان اللہ کان بما تعملون خبیراط وتوکل علی اللہ و کفی باللہ وکیلا۔ (احزاب: ۱)

اے پیغمبر خدا سے ڈر اور منافقوں اور کافروں کا کہا نہ مان' بیشک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے' اور جو تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف سے وحی کی جاتی ہے اس کے پیچھے چل بیشک خدا تمہارے کاموں سے خبردار ہے اور اللہ پر بھروسہ رکھ اور اللہ کام بنانے کو کافی ہے۔

کفار سے مسلسل لڑائیوں کے پیش آنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اب بھی یہ لوگ صلح کر طرف جھکیں تو تم جھک جاؤ' اور مصالحت کر لو' اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ بدعہد دھوکہ نہ دیں' خدا پر بھروسہ رکھو تو ان کے فریب کا داؤ کامیاب نہ ہوگا۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لھا وتوکل علی اللہ انہ' ھو السمیع العلیم وان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللہ۔ ھو الذی ایدک بنصرہ وبالمئومنین۔ (انفال: ۸)

اور اگر وہ صلح کیلئے جھکیں تو تو بھی جھک جا اور خدا پر بھروسہ رکھ
بیشک وہ سننے والا ہے اور جاننے والا ہے' اور اگر وہ تجھے دھوکہ
دینا چاہیں تو کچھ پروا نہیں کہ تجھے اللہ کافی ہے اسی نے تجھ کو
اپنی اور مسلمانوں کی نصرت سے تیری تائید کی۔

یہود جن کو اپنی دولت' ثروت' اور علم پر ناز تھا' ان سے بھی بے خوف وخطر ہو کر اللہ کے بھروسہ پر مسلمانوں کو حق کی تائید کے لئے کھڑے ہو جانے کا حکم ہوتا ہے:

ان ھذا القران یقص علی بنی اسرآئیل اکثر الذی
ھم فیہ یختلفون و انہ لھدی و رحمت للمئومنین۔
ان ربک یقضی بینھم بحکمہ۔ وھو العزیز العلیم۔
فتوکل علی اللہ انک علی الحق المبین۔ (نمل:۲)
بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر وہ باتیں ظاہر کر دیتا ہے
جن میں وہ مختلف ہیں اور بیشک یہ قرآن مسلمانوں کیلئے
ہدایت اور رحمت ہے' بیشک تیرا پروردگار ان کے درمیان
اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہی غالب اور جاننے والا
ہے تو خدا پر بھروسہ رکھ بیشک تو کھلے حق پر ہے۔

اسلام کی تبلیغ اور دعوت کی مشکلوں میں بھی خدا ہی کے اعتماد اور بھروسہ پر کام کرنے کی ہدایت ہے' کہ وہ ایسی طاقت ہے جس کو زوال نہیں اور ایسی ہستی ہے جس کو فنا نہیں' فرمایا:

وما ارسلنک الا مبشرا و نذیرا۔ قل ما اسئلکم علیہ
من اجر الا من شاء ان یتخذ الی ربہ سبیلا۔ وتوکل
علی الحی الذی لا یموت۔ (فرقان:۵)
اور میں نے تو (اے رسول) تجھے خوشخبری سنانے والا اور ہشیار

کرنے والا بنا کر بھیجا ہے کہہ دے کہ میں تم سے اس کے سوا
(اپنے کام کی) کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ جو چاہے اپنے
پروردگار کا راستہ قبول کرے اور اس زندہ رہنے والے پر
بھروسہ کر جس کو موت نہیں۔

رسول کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنا کام کئے جاؤ، مخالفین کی پروانہ کرو، اور خدا پر بھروسہ رکھو، جس کے سوا کوئی دوسرا باختیار نہیں۔

فان تولوا فقل حسبی الله لا اله الا هو علیه توکلت
وهو رب العرش العظیم۔ (توبہ:۱۲۹)
تو اگر یہ (مخالفین) کہا نہ مانیں، تو (ان سے) کہہ دو کہ مجھے
اللہ بس ہے، نہیں کوئی معبود، لیکن وہی اسی پر میں نے بھروسہ
کیا، وہ بڑے تخت کا مالک ہے۔

آپس کے اختلاف میں اللہ کا فیصلہ چاہئے، اس حالت میں بھی اسی پر بھروسہ ہے۔

وما اختلفتم فیه من شیء فحکمه الی الله ذلکم
الله ربی علیه توکلت والیه انیب۔ (شوریٰ:۱۰)
اور جس چیز میں تم میں رائے کا اختلاف ہے، تو اس کا فیصلہ
خدا کی طرف ہے، وہی اللہ ہے میرا پروردگار اسی پر میں
بھروسہ کرتا ہوں، اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

رسول کو خدا کی آیتیں پڑھ کر اپنی نادان قوم کو سنانے کا حکم ہوتا ہے اور تسلی دی جاتی ہے کہ ان کے کفر و نافرمانی کی پروانہ کرو، اور اپنی کامیابی کے لئے خدا پر بھروسہ رکھو۔

کذلك ارسلنك فی امة قد خلت من قبلها امم
لتتلوا علیهم الذی اوحینا الیك وهم یکفرون
بالرحمن قل هو ربی لا اله الا هو۔ علیه توکلت

والیہ متاب (رعد: ۳۰)

ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم میں بھیجا ہے جس سے پہلے بہت
سی قومیں گزر چکیں تا کہ تو ان کو وہ پیام سنائے جو میں نے تجھ
پر وحی کیا ہے' اور وہ رحمان کے ماننے سے انکار کرتے ہیں کہہ
دے کہ وہ میرا پروردگار ہے کوئی معبود نہیں لیکن وہی اس پر
میں نے بھروسہ کیا' اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہئے اور گمراہوں کی ہدایت کا فرض ادا کرنے کے بعد ان کی شرارتوں سے پراگندہ نہ ہونا چاہئے' کفار کو یہ آیت سنا دینی چاہئے:

قل ھو الرحمن امنا بہ وعلیہ توکلنا فستعلمون من
ھو فی ضلل مبین. (الملک: ۲۹)

کہہ دے وہی رحم والا ہے' ہم اس پر ایمان لائے اور اسی پر
بھروسہ کیا تو تم جان لوگے کہ کون کھلی گمراہی میں ہے۔

جس طرح ہمارے رسول کو اور عام مسلمانوں کو ہر قسم کی مصیبتوں' مخالفتوں اور مشکلوں میں خدا پر توکل اور اعتماد رکھنے کی ہدایت بار بار ہوئی ہے' آپ سے پہلے پیغمبروں کو بھی اس قسم کے موقعوں پر اس کی تعلیم دی گئی ہے اور خود اولوالعزم رسولوں کی زبان سے عملاً اس تعلیم کا اعلان ہوتا رہا ہے' حضرت نوح علیہ السلام جب تن تنہا سالہا سال تک کافروں کے نرغہ میں پھنسے رہے تو انہوں نے پوری بلند آہنگی کے ساتھ اپنے دشمنوں کو یہ اعلان فرمادیا:

واتل علیہم نبا نوح اذ قال لقومہ یقوم ان کان کبر
علیکم مقامی وتذکیری بایت اللہ فعلی اللہ
توکلت فاجمعوا امرکم وشرکائکم ثم لا یکن

امرکم علیکم غمۃ ثم اقضوا الی ولا تنظرون۔
(یونس)

(اے پیغمبر) ان کو نوح کا حال سنا جب اس نے اپنی قوم سے کہا' اے میرے لوگو! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیوں کے ساتھ میرا نصیحت کرنا تم پر شاق گزرتا ہے' تو اللہ پر میں نے بھروسہ کرلیا ہے تو تم اپنی تدبیر کو اور اپنے شریکوں کو خوب مضبوط کرلو' پھر تم پر تمہاری تدبیر چھپی نہ رہے پھر اس کو مجھ پر پوری کرلو' اور مجھے مہلت نہ دو۔

غور کیجئے کہ حضرت نوحؑ دشمنوں کے ہر قسم کے مکروفریب' سازش اور لڑائی بھڑائی کے مقابلہ میں استقلال اور عزیمت کے ساتھ خدا پر توکل اور اعتماد کا اظہار کس پیغمبرانہ شان سے فرمارہے ہیں' حضرت ہود علیہ السلام کو ان کی قوم جب اپنے دیوتاؤں کے قہر اور غضب سے ڈراتی ہے' تو وہ جواب میں فرماتے ہیں:

انی اشھد اللہ واشھدوا انی بری مما تشرکون. من دونہ فکیدونی جمیعا ثم لا تنظرون۔ انی توکلت علی اللہ ربہ و ربکم ط (ہود:۵)

میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں' اور تم بھی گواہ رہو کہ ان سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کے سوا شریک ٹھہراتے ہو' پھر تم سب مل کر میرے ساتھ داؤ کرلو' پھر مجھے مہلت نہ دو' میں نے اللہ پر جو میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے' بھروسہ کرلیا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری مخالفتوں کی پروا نہیں' مجھے جو اصلاح کا کام کرنا ہے وہ کروں گا' میرا تکیہ خدا پر ہے۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا

باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔ (ہود:۸)

میں تو جب تک مجھ میں طاقت ہے، کام سدھارنا چاہتا ہوں
میری توفیق اللہ ہی سے ہے اس پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور
اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

ان پیغمبروں کی اس استقامت، صبر اور توکل کے واقعات سنانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی جاتی ہے کہ آپ کو بھی اپنے کاموں کی مشکلات میں اسی طرح خدا پر توکل کرنا چاہئے:

قل للذین لا یومنون اعملوا علی مکانتکم انا عملون۔ وانتظروا انا منتظرون۔ وللہ غیب السموت والارض والیہ یرجع الامر کلہ فاعبدہ وتوکل علیہ۔ (ہود:۱۰)

کہہ دو ان سے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی جگہ کام کرو، ہم بھی کرتے ہیں، اور تم بھی (نتیجہ کا) انتظار کرو، ہم بھی، اور اللہ ہی کے قبضہ میں ہے آسمانوں کا اور زمین کا چھپا بھید، اور اسی کی طرف سارے کاموں کا فیصلہ لوٹایا جاتا ہے پھر اس کی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ کرو۔

مسلمانوں کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیروؤں کا نمونہ پیش کیا جارہا ہے کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزیز و اقارب سب کو چھوڑ کر الگ ہو گئے اور خدا کی راہ میں کسی کی دوستی اور محبت کی پرواہ نہ کی۔

قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ اذ قالوا لقومھم انا برء و منکم و مما تعبدون من دون اللہ کفرنا بکم وبدا بیننا و بینکم

العداوہت والبغضاء ابدا حتی تومنوا باللہ وحدہ الا قول ابراھیم لابیہ لا ستغفرن لک وما املک لک من اللہ من شئی۔ ربنا علیک توکلنا والیک انبنا والیک والیک المصیر (ممتحنہ: ۱)

تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور خدا کے سوا جن کو تم پوجتے ہو ان سے بیزار ہیں' ہم نے تمہارے مسلک کا انکار کر دیا' اور ہم میں اور تم میں دشمنی اور نفرت ہمیشہ کیلئے کھل گئی جب تک تم ایک خدا پر ایمان نہ لے آؤ' مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں تمہارے لئے خدا سے دعا کروں گا اور مجھے خدا کے کام میں کوئی اختیار نہیں' اے ہمارے پروردگار تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کیا' اور تیرے ہی پاس لوٹ کر جانا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے عزیز بیٹوں کو مصر بھیجتے ہیں' لیکن فرط محبت سے ڈرتے ہیں کہ یوسف کی طرح ان کو بھی کوئی مصیبت نہ پیش آئے' بیٹوں کو کہتے ہیں کہ تم سب شہر کے ایک دروازے سے نہیں بلکہ متفرق دروازوں سے اندر جانا' اس ظاہری تدبیر کے بعد خیال آتا ہے کہ کارساز حقیقی تو خدا ہے' ان تدبیروں سے اس کا حکم ٹل تھوڑا ہی سکتا ہے' اس لئے تدبیر پر بھروسہ نہیں بلکہ خدا کی کارسازی پر ہے:

وقال یبنی لا تدخلوا من باب واحد وادخلوا من ابواب متفرقہت وما اغنی عنکم من اللہ من شی ئط ان الحکم الا للہ علیہ توکلت وعلیہ

اور (یعقوب نے) کہا اے میرے بیٹو! ایک دروازہ سے نہ جانا' بلکہ الگ الگ دروازوں سے جانا' اور میں تم کو خدا سے ذرا بھی بچا نہیں سکتا' فیصلہ اسی کا ہے' اسی پر میں نے بھروسہ

فلیتوکل المتوکلون۔(یوسف:۸)

نے بھروسہ کیا اور اسی پر چاہیے کہ بھروسہ کرنے والے بھروسہ کریں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہوگیا ہے کہ ظاہری تدبیر شان توکل کے منافی نہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں ان کی قوم ان کو زبردستی بت پرست بن جانے پر مجبور کرتی ہے ورنہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے تو اس کے جواب میں وہ پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہیں:

قد افترینا علی اللہ کذبا ان عدنا فی ملتکم بعد اذ نجنا اللہ منھا و ما یکون لنا ان نعود فیھا الا ان یشاء اللہ ربنا وسع ربنا کل شیء علما علی اللہ توکلنا ربنا افتح بیننا و بین قومنا بالحق و انت خیر الفتحین (.اعراف: ۱۱)

اگر ہم پھر تمہارے مذہب میں آ جائیں جب ہم کو خدا اس سے بچا چکا' تو ہم نے خدا پر جھوٹ باندھا اور یہ ہم سے نہیں ہوسکتا کہ ہم پھر اس میں لوٹ کر جائیں' مگر یہ کہ ہمارا پروردگار خدا ہی چاہے' ہمارا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز کو سمائے ہے ہم نے خدا پر بھروسہ کیا' اے ہمارے پروردگار ہمارے اور ہماری قوم کے بیچ میں تو حق کا فیصلہ کر دے اور تو

ہی سب فیصلہ کرنے والوں میں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دل بادل لشکر اور شاہانہ زرد وقوت کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو خدا ہی پر توکل کی تعلیم دی' فرمایا:

یقوم ان کنتم امنتم باللہ فعلیہ توکلوا ان کنتم مسلمین۔(یونس: ۹)

اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان لا چکے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو' اگر فرمانبردار ہو۔

ان کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرأت کے ساتھ جواب دیا۔

علی اللہ توکلنا ربنا لا تجعلنا فتنۃ للقوم الظلمین۔(یونس: ۹)

ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا' ہمارے پروردگار ہم کو ظالم قوم کے لئے آزمائش نہ بنا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جس طرح کامیاب بنایا' اور ان کو اپنی خاص خاص نوازشوں سے جس طرح سرفراز کیا' اس سے ہر شخص واقف ہے' یہ سب کچھ ان کے اسی توکل کے صدقہ میں ہوا' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرمادیا۔

من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ (طلاق: ۱)

جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو کافی ہے۔

یہ آیت پاک خانگی و معاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے کہ اگر میاں بیوی میں نباہ کسی طرح نہ ہو سکے اور دونوں میں قطعی علیحدگی (طلاق) ہو جائے تو پھر عورت کو اس سے ڈرنا چاہئے کہ ہمارا سامان کیا ہوگا' اور ہم کہاں سے کھائیں گے؟

خدا خود میرسامان است ارباب توکل را

توکل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آیتیں ہیں وہ ایک ایک کرکے آپ کے سامنے ہیں، ہر ایک پر غور کی نظر ڈالئے کہ ان میں سے کوئی بھی ان معنوں میں سے جن میں ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے ہجوم، موانع کی کثرت اور پر زور مخالفتوں کی تدبیروں سے نڈر رہ کر استحکام، عزم اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہ کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل میں یقین رکھیں۔

احادیث میں ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ! میں اونٹ کو چھوڑ کر خدا پر توکل کروں (کہ میرا اونٹ مجھ کو مل جائے گا) یا اس کو باندھ کر، ارشاد ہوا، اس کو باندھ کر خدا پر توکل کرو۔ (۱)۔ اسی واقعہ کو مولانا رومی نے اس مصرع میں ادا کیا ہے:

بر توکل زانوے اشتر بہ بند

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں تاہم حقیقت کی رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے عین منشاء کے مطابق ہے۔

بعض لوگ تعویذ گنڈا (۲)۔ غیر شرعی جھاڑ پھونک، ٹوٹکے اور منتر پر یقین رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ مادی اسباب و تدبیر کو ان چیزوں سے مطلب براری کرنا ہی توکل ہے، جاہلیت کے وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کی اس خیال کی تردید کی، اور فرمایا کہ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار اشخاص حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخل کر دیے جائیں گے، یہ وہ ہوں گے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے جو بدشگونی کے قائل نہیں، جو داغ نہیں کرتے بلکہ اپنے پروردگار پر اعتماد اور توکل رکھتے ہیں۔ (۳)۔ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ جو داغواتا اور تعویذ گنڈا کرتے ہیں وہ توکل سے محروم ہیں۔ (۴)۔ اس سے

مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہیں بلکہ جاہلانہ اوہام کی بیخ کنی ہے ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ''اگر تم پر خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو ویسے روزی پہنچاتا جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں (۵)۔' اس حدیث سے بھی مقصود ترک عمل اور ترک تدبیر نہیں' کیونکہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں بیٹھ کر یہ روزی نہیں پہنچائی جاتی ہے' بلکہ ان کو بھی اڑ کر کھیتوں اور باغوں میں جانے اور رزق تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہیں وہ روزی کیلئے دل تنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہیں اور اس کے حصول کیلئے ہر قسم کی بدی اور برائی کا ارتکاب کرتے ہیں حالانکہ انہیں اگر یہ یقین ہو کہ :

---

(۱)۔ یہ حدیث بلفظ اعقلها وتوکل ترمذی (آخر ابواب القیامته ص ٤١٤) میں اور قیده و توکل شعب الایمان بیهقی میں اور قیدها و توکل خطیب رواه مالك اور ابن عساکر میں ہے (کنز العمال جلد ۲ ص ۲۳ حیدر آباد۔) (۲)۔ شرعی کلمات حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں ہیں اور اس کے کلام پاک سے تبرک حاصل کرنا ہے لیکن آیات اور دعائوں کا لکھ کر بدن میں لٹکانا یا گھول کر پینا یا خاص قیود کے ساتھ اعداد میں ان کو لکھنا ثابت نہیں۔ (۳)۔ صحیح بخاری کتاب الطب باب من لم یرق و کتاب الرقاق و صحیح مسلم کتاب الایمان' جاهلیت میں اکثر بیماریوں کا علاج آگ سے داغ کر کرتے تھے۔ (٤)۔ جامع ترمذی باب ماجاء مافی کراهته الرقی' اصل الفاظ یہ ہیں من اکتوی او استرقی فقد برئ من التوکل۔ (۵)۔ جامع ترمذی ابواب الزهد ص ۳۸۸ و حاکم۔

وما من دآبة فی الارض الا علی الله رزقها۔

(ہود: ۱)

زمین میں کوئی رینگنے والا نہیں' لیکن اس کی روزی خدا کے ذمہ ہے۔

تو وہ اس کے لئے چوری، ڈاکہ، قتل، بے ایمانی اور خیانت وغیرہ کے مرتکب نہ ہوتے اور نہ ان کو دل تنگی اور مایوسی ہوا کرتی، بلکہ صحیح طور سے وہ کوشش کرتے اور روزی پاتے، ان حدیثوں کا یہی مفہوم ہے جو قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسبط ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہط ان اللہ بالغ امرہط قد جعل اللہ لکل شی ء قدرا۔ (طلاق: ۱)

اور جو کوئی اللہ سے ڈرے وہ اس کے لئے مشکل سے نکلنے کا راستہ کر دے گا اور اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان نہ ہوگا اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو بس ہے، بیشک اللہ اپنے ارادہ کو پہنچ کر رہتا ہے، اس نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔

اوپر کی تفصیلوں سے ہویدا ہے کہ توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اسی کے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں ''خود اعتمادی'' کا لفظ بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں جن میں یہ جوہر پایا جاتا ہے لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڑھے اور غار بھی ہیں، اس لئے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے ''خود اعتمادی'' کا نظریہ پیش کیا ہے جو ان خطروں سے محفوظ ہے۔

صبر

فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل۔ (احقاف: ۴)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو برتو پردے ڈال رکھے ہیں، وہ ان کے نزدیک بے بسی و بے کسی کی تصویر ہے اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنا ہیں، لیکن کیا واقعہ یہی ہے؟

صبر کے لغوی معنی::

''صبر'' کے لغوی معنی ''روکنے'' اور ''سہارے'' کے ہیں یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا، اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کے معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام لے سکنے کی مجبوری کے نہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی اخلاقی جرأت اور ثبات قدر کے ہیں، حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کے قصہ میں ایک ہی آیت میں تین دفعہ یہ لفظ آیا ہے اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہیں، حضرت خضرؑ کہتے ہیں :

انك لن تستطيع معى صبرا۔ و كيف تصبر على مالم تحط به خبرا۔ (کہف: ۹)

تم میرے ساتھ صبر نہ کرسکو گے، اور کیسے اس بات پر صبر کر سکتے ہو جس کا علم تمہیں نہیں۔

حضرت موسیٰؑ جواب میں فرماتے ہیں:

ستجدنى ان شاء الله صابرا (کہف: ۹)

اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔

اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت میں غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل میں اضطراب اور بے چینی کا پیدا نہ ہونا ہے۔

کفار اپنے پیغمبروں کے سمجھانے کے باوجود پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی

بت پرستی پر قائم رہتے ہیں‘تو اس کی حکایت ان کی زبان سے قرآن یوں کرتا ہے۔

ان کاد لیضلنا عن الھتنا لولا ان صبرنا علیھا۔

(فرقان: ۴)

یہ شخص (پیغمبری کا مدعی) تو ہم کو اپنے خداؤں (بتوں) سے ہٹا ہی چکا تھا‘اگر ہم ان پر صابر (ثابت) نہ رہتے۔

ولو انھم صبروا حتی تخرج الیھم لکان خیرالھم۔

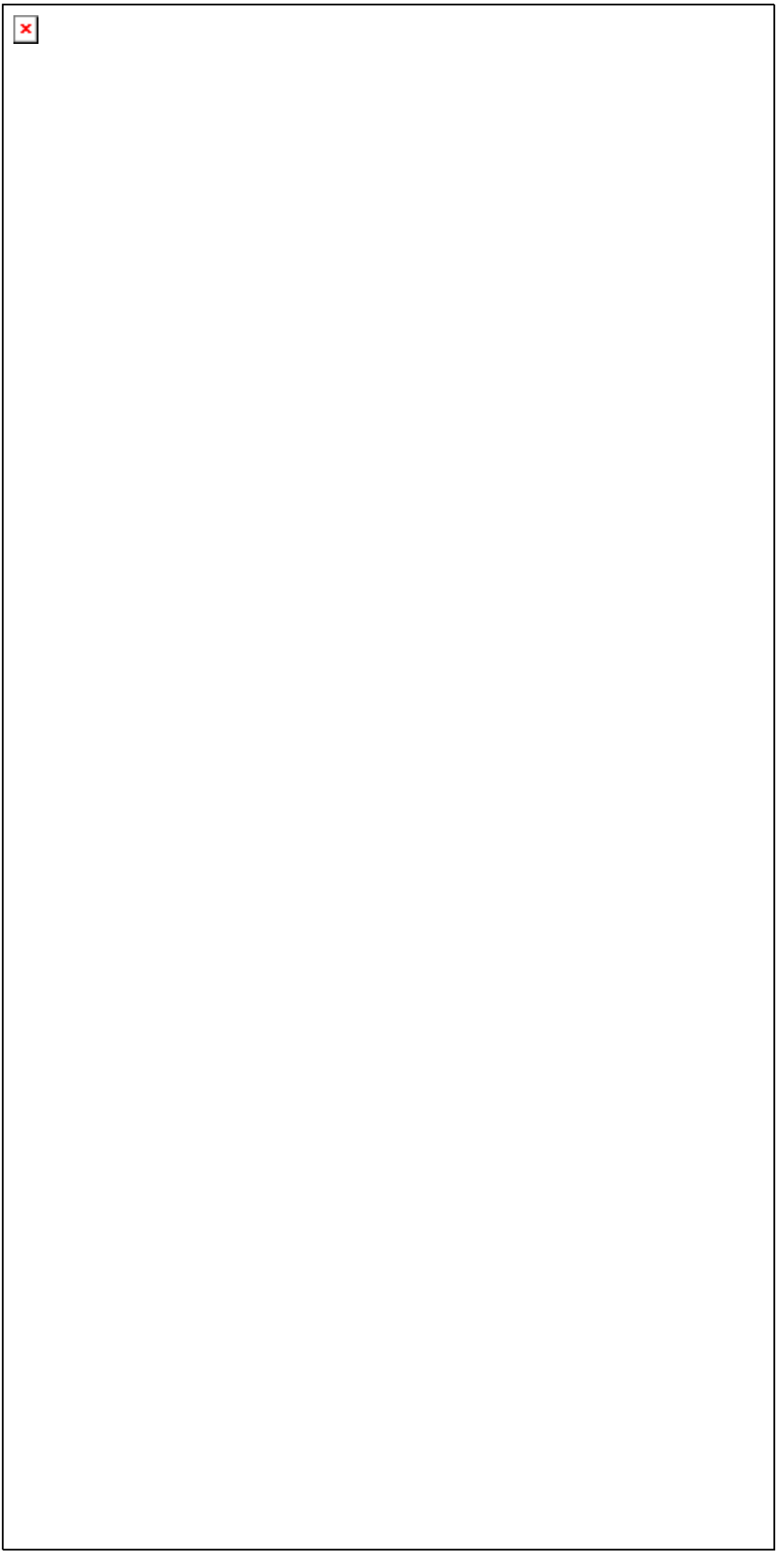
(حجرات: ۱)

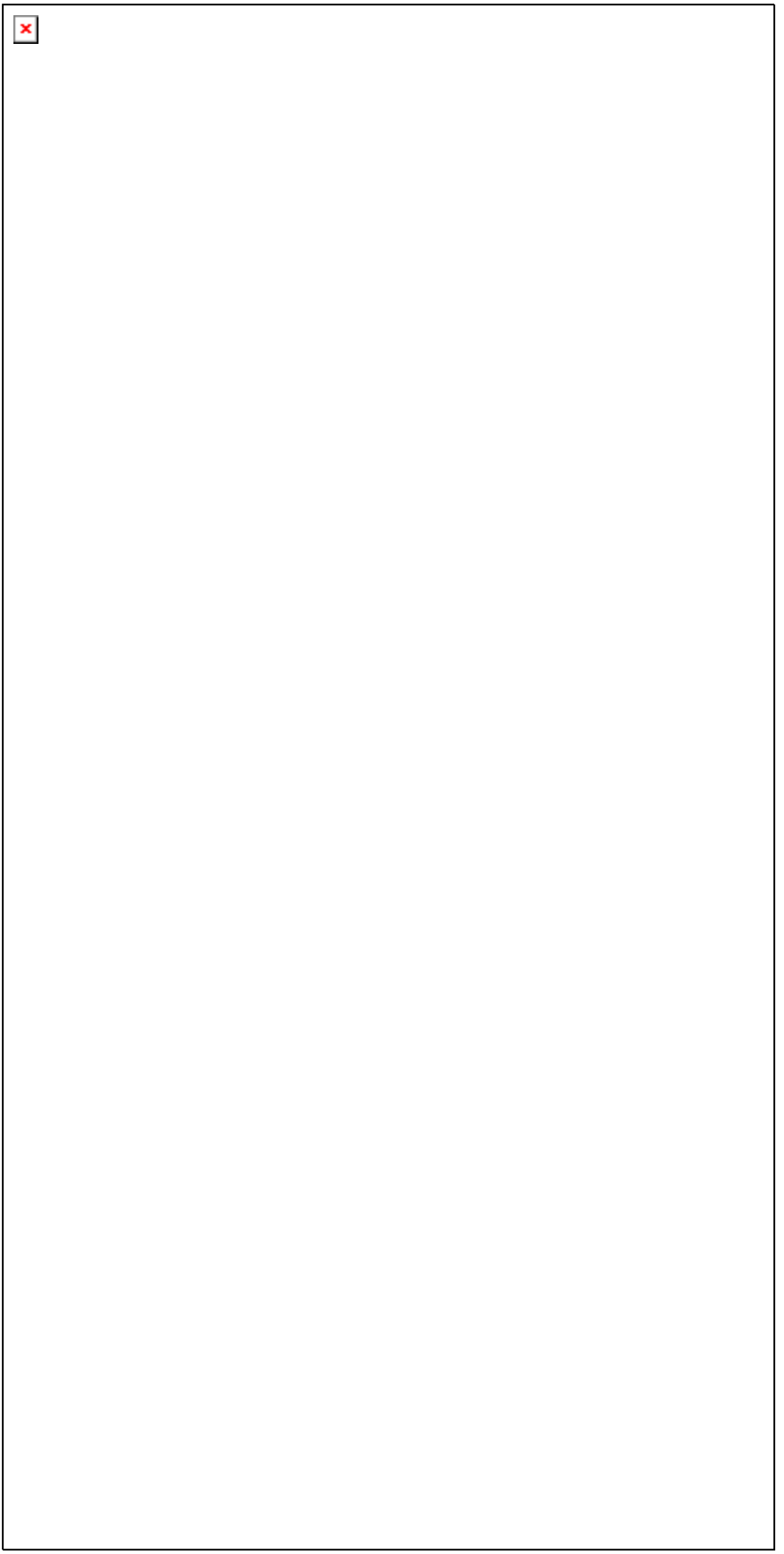
اور اگر وہ ذرا صبر کرتے (یعنی ٹھہر جاتے) یہاں تک کہ تم (اے رسول) نکل کر ان کے پاس آتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔

قرآن پاک میں صبر کا لفظ اسی ایک معنی میں مستعمل ہوا ہے گو حالت کے تغیر سے اس کے مفہوم میں کہیں کہیں ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے‘با ایں ہمہ ان سب کا مرجع ایک ہی ہے‘یعنی ثابت قدمی اور استقامت‘صبر کے یہ مختلف مفہوم جن میں قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے‘حسب ذیل ہیں:

وقت مناسب کا انتظار کرنا::

پہلا یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا‘آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ پیش کی‘تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ ﷺ کی مخالفت میں سرگرم جولان ہو گیا‘ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کی جانے لگیں‘تو اس وقت بشریت کے اقتضاء سے آپ ﷺ کو اضطراب ہوا اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی‘اس وقت تسلی کا یہ پیام آیا کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں‘آپ





بل سولت لکم انفسکم امرا فصبر جمیل واللہ المستعان علی ما تصفون۔ (یوسف: ۲)

بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑ لی ہے تو بہتر صبر ہے اور خدا سے اس پر مدد چاہی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو۔

پھر اپنے دوسرے بیٹے کے مصر میں روک لئے جانے کا حال سن کر کہتے ہیں:

بل سولت لکم انفسکم فصبر جمیل عسی اللہ ان یاتینی بھم جمیعا۔ (یوسف: ۱)

بلکہ تمہارے دلوں نے گھڑ لیا ہے' تو بہتر صبر ہے' عنقریب خدا ان سب کو ساتھ لائے گا۔

حضرت ایوب علیہ السلام نے جسمانی اور مالی مصیبتوں کو جس رضا و تسلیم کے ساتھ پامردی سے برداشت کیا' اس کی مدح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی:

انا وجدنہ صابرا نعم العبد انہ اواب۔ (ص: ۴)

ہم نے بیشک ایوب کو صابر پایا' کیسا اچھا بندہ' وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے شفیق اور مہربان باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ کر فرماتے ہیں:

یابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین۔ (صافات: ۳)

اے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے' وہ کر گزر' خدا نے چاہا تو مجھے صابروں میں سے پائے گا۔

مشکلات کو خاطر میں نہ لانا::

صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ منزل مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں'

دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں' اور مخالفین جو طعن وطنز کریں' ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے اور ان سے بد دل اور پست ہمت ہونے کے بجائے اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو' بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے مگر انہوں نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی لئے دوسری وحی میں جب تبلیغ اور دعوت کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آپ کو باخبر کر دیا گیا۔

یایھا المدثر۔ قم فانذر ولربك فاصبر۔ (مدثر: ۱)

اے چادر پوش! اٹھ اور لوگوں کو ہشیار کر۔۔۔ اور اپنے پروردگار کے لئے پامردی (صبر) کر۔

اس قسم کے مواقع اکثر انبیاء علیہم السلام کو پیش آئے چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس اعلیٰ مثال کی پیروی کا حکم ہوا:

فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل ولا تستعجل لھم۔ (احقاف: ۴)

(اے محمد ﷺ) تو بھی اسی طرح پامردی کر جس طرح پختہ ارادہ والے پیغمبروں نے کی' اور ان (مخالفوں) کے لئے جلدی نہ کر۔

حضرت لقمانؑ کی زبان سے بیٹے کو یہ نصیحت سنائی گئی کہ حق کی دعوت وتبلیغ' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض پوری استواری سے ادا کرو' اور اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کر۔

وامر بالمعروف وانہ عن المنکر واصبر علی ما اصابك ان ذلك من عزم الامور۔ (لقمان: ۲)

نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے اس

کو برداشت کر' یہ بڑی پختہ باتوں میں سے ہے۔

کفار عذاب الٰہی کے جلد نہ آنے یا حق کی ظاہری بے کسی و بے بسی کے سبب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے دلدوز طعنوں سے تکلیفیں پہنچاتے تھے' حکم ہوا کہ ان طعنوں کی پروا نہ کر اور نہ ان سے دل کو اداس کر' بلکہ اپنے دھن میں لگا رہ' اور دیکھ کہ تجھ سے پہلے پیغمبروں نے کیا کیا۔

اصبر علی ما تقولون واذکر عبدنا داؤد۔ (ص:۲)

ان کے کئے پر صبر کر اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کر۔

اس قوت صبر کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لو لگائی جائے' اور اس کی طاقت پر بھروسہ کیا جائے۔

فاصبر علی ما یقولون وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس۔ (طٰہٰ:۸۰' ق:۳۹)

تو ان کے کہنے پر صبر کر' اور صبح و شام اپنے پروردگار کی حمد کر۔

نہ صرف یہ کہ مخالفوں کے اس طعنہ و طنز کا دھیان نہ کیا جائے بلکہ اس کے جواب میں ان سے لطف و مروت برتا جائے' فرمایا:

واصبر علی ما یقولون واھجرھم ھجرا جمیلا۔ (مزمل:۱۰)

ان کے کئے پر صبر کر' اور اس سے خوبصورتی سے الگ ہو جا۔

درگزر کرنا::

صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز جو بدخواہی سے پیش آئے' اور تکلیفیں دے' اس کے قصور کو معاف کیا جائے' یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردگی دکھائی جائے' قرآن پاک کی آیتوں میں صبر اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے' ارشاد ہوتا ہے:

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل عوقبتم به ولئن صبرتم لهو خير للصبرين۔ واصبر وما صبرك الا بالله ولا تحزن عليهم ولا تكن فى ضيق مما يمكرون۔ (نحل:۱۲۶)

اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی اور البتہ اگر صبر (برداشت) کرو تو صبر کرنے والوں کے لئے یہ بہتر ہے اور تو صبر اور تیرا صبر کرنا نہیں، لیکن خدا کی مدد سے، اور ان کا غم نہ کر اور نہ ان کی سازشوں سے دل تنگ ہو۔

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بہادری ہے مسلمانوں کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر و برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے یا کسی اور سبب سے نہ ہو بلکہ صرف خدا کے لئے ہو۔

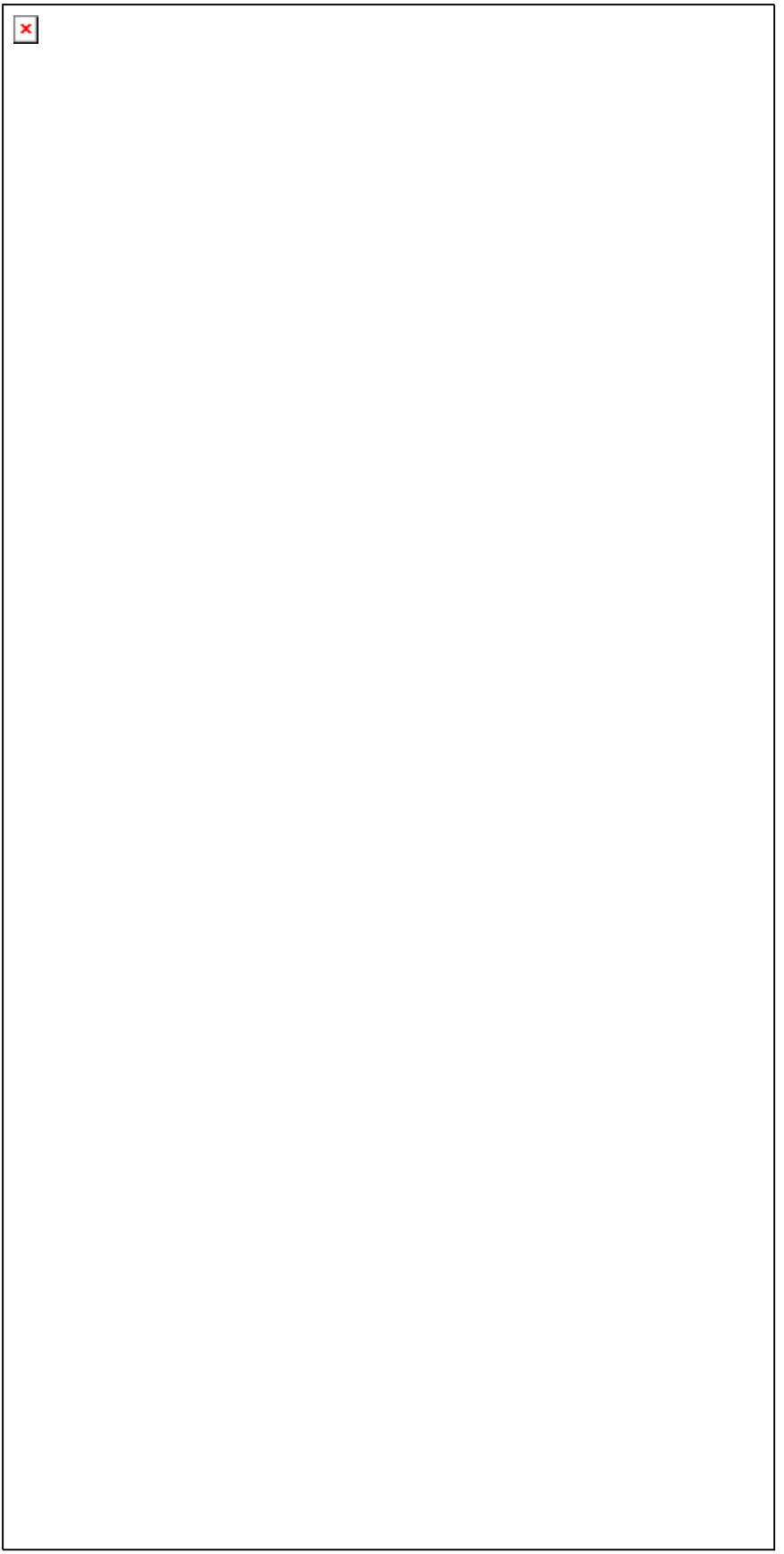
والذين صبروا ابتغاء وجه ربهم واقاموا الصلوٰة وانفقوا مما رزقنهم سرا وعلانية ويدرءون بالحسنة السيئة اولئك لهم عقبى الدار۔ (رعد:۲۳)

اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی ذات کے لئے صبر کیا اور نماز کھڑی کی، اور جو ہم نے ان کو روزی دی اس میں سے چھپے اور علانیہ (راہ خدا میں) خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے رفع کرتے ہیں، ان کے لئے آخرت کا انجام ہے۔

فرشتے ان کو مبارک باد دیں گے اور کہیں گے:

سلام عليكم بما صبرتم فنعم عقبى الدار۔ (رعد:۲۴)

تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا تھا، تو آخرت کا انجام کیا اچھا ہوا۔



ناحق فساد کرتے ہیں یہی ہیں جن کے لئے پر دردعذاب ہے'
البتہ جس نے برداشت کیا' اور بخش دیا' بے شک یہ بڑی
ہمت کا کام ہے۔

ثابت قدمی::

صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آ جانے کی صورت میں میدان جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے' قرآن پاک نے اس لفظ کو اس مفہوم پر بارہا استعمال کیا ہے' اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے متصف ہوئے' صادق القول اور راست باز ٹھہرایا ہے کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا' پورا کیا' فرمایا:

والصابرین فی البلساء والضرآء وحین الباس اولئك
الذین صدقوا اولئك هم المتقون۔ (بقرہ:۲۲)
اور صبر کرنے والے' ثابت قدمی دکھانے والے مصیبت میں
اور نقصان میں اور لڑائی کے وقت' وہی ہیں جو سچ بولے' اور
وہی پرہیزگار ہیں۔

اگر لڑائی آ پڑے تو اس میں کامیابی کی چار شرطیں ہیں' خدا کی یاد' امام وقت کی اطاعت' آپس میں اتحاد موافقت اور میدان جنگ میں بہادرانہ صبر و استقامت:

یایها الذین امنوا اذا لقیتم فئهت فاثبتوا واذکروا
الله کثیرا لعلکم تفلحون . واطیعوا الله ورسوله ولا
تنازعوا فتفشلو و تذهب ریحکم واصبروا ان الله مع
الصبرین۔ (انفال:۶)
اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو تو ثابت قدم
رہو' اور اللہ کو بہت یاد کرو' تا کہ فلاح پاؤ' اور خدا اور اس کے
رسول کی فرمانبرداری کرو' اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تم

سست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی' اور صبر دکھاؤ'
بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

حق کے مددگاروں کی ظاہر قلت تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے' تاریخ کی نظر سے مشاہدے اکثر گزرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو شکست دے دی ہے' اسلام نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جانثاروں کو سکھا دیا تھا' جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنوں کی بڑی تھی۔

یایھا النبی حرض المئومنین علی القتال ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتینط وان یکن منکم مائہت یغلبوا الفا من الذین کفروا بانھم قوم لا یفقھون۔ الان خفف اللہ عنکم وعلم ان فیکم ضعفاط فان یکن منکم مائہت صابرہت یغلبوا مائتینط وان یکن منکم الف یغلبوا الفین باذن اللہطو اللہ مع الصبرین۔ (انفال: ۹)

اے پیغمبر! ایمان والوں کو (دشمنوں کی) لڑائی پر ابھار' اگر یہ بیس صبر کرنے والے (ثابت قدم) ہوں تو دوسو پر غالب ہوں گے' اور اگر سو ہوں تو کافروں میں سے ہزار پر غالب ہوں گے کیونکہ وہ لوگ سمجھتے نہیں' اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی' اور اس کو معلوم ہے کہ تم میں کمزوری ہے' تو اگر سو صبر کرنے والے (ثبات قدم) ہوں تو دوسو پر غالب ہوں گے اور اگر ہزار (صبر والے) ہوں تو دو ہزار پر خدا نے حکم سے غالب ہوں گے' اور اللہ صبر کرنے والوں (ثابت قدموں) کے ساتھ ہے۔

میدان کارزار میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعدادی قلت کی پروا نہ کریں، اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے سے دوچند کا مقابلہ کریں، اور تسلی دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد انہیں لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں، حضرت طالوت اور جالوت کے قصہ میں بھی اس نکتہ کو ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے:

قالوا طاقہت لنا الیوم بجالوت و جنودہ قال الذین یظنون انہم ملقوا اللہ کم من فئہت قلیلہ غلبت فئہت کثیرہ باذن اللہ واللہ مع الصبرین. ولما برزو الجالوت و جنودہ قالوا ربنا افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین۔ (بقرہ:۲۴۹)

طالوت کے ساتھیوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں، انہوں نے جن کو خیال تھا کہ خدا سے ملنا ہے، یہ کہا کہ بسا اوقات تھوڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم سے بڑی تعداد کے لوگوں پر غالب آتے ہیں اور خدا صبر و ثبات دکھانے والوں کے ساتھ ہے، اور جب یہ جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ میں آئے تو بولے اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر بہا اور ہم کو ثابت قدمی بخش اور ان کافروں کے مقابلہ میں ہم کو نصرت عطا کرو۔

اللہ تعالیٰ نے کمزور اور قلیل التعداد مسلمانوں کی کامیابی کی بھی یہی شرط رکھی ہے اور بتا دیا ہے کہ خدا انہیں کا ہے جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں، اور خدا کے بھروسہ پر مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں:

ثم ان ربك للذین ھاجروا من بعدھا فتنوا ثم

جاھدوا و صبروا۔ (نحل: ۱۴)

پھر تیرا پروردگار ان کے لئے ہے جنھوں نے ایذا پانے کے بعد گھر بار چھوڑا' پھر لڑتے رہے اور صبر و ثبات کے ساتھ ٹھہرے رہے۔

دنیا کی سلطنت و حکومت ملنے کے لئے بھی اسی صبر و استقامت کی جوہر پیدا کرنے کی ضرورت ہے' بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد اطراف ملک کے کنار سے جب مقابلہ آ پڑا' تو حضرت موسیٰؑ نے ان کو پہلا سبق یہ سکھایا:

قال موسی لقومہ استعینوا باللہ و اصبروا ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ و العاقبۃ للمتقین۔ (اعراف: ۵)

موسیٰ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو' اور صبر استقامت سے کام لو' بیشک زمین خدا کی ہے' وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اس کا ملک بناتا ہے اور انجام پرہیز گاروں کے لئے ہے۔

چنانچہ بنی اسرائیل مصر و شام و کنعان آس پاس بسنے والی بت پرست قوموں سے تعداد میں بہت کم تھے لیکن جب انہوں نے ہمت دکھائی اور بہادرانہ استقامت' اور صبر اور ثابت قدمی سے مقابلے کئے تو ان کی ساری شکلیں حل ہو گئیں' اور کثیر التعداد دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خود مختار سلطنت پر قابض اور دوسری قوموں پر حکومت کرتے رہے' اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا راز اسی ایک لفظ صبر میں ظاہر کیا ہے' فرمایا:

واورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض و مغاربھا التی بارکنا فیھا و تمت کلمت

ربك الحسنى على بنى اسرآئيل بما صبروا دمرنا ما كان يصنع فرعون و قومه وما كانوا يعرشون۔ (اعراف:۱۳۶)

اور ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے اس زمین کی وراثت بخشی جس میں ہم نے برکت نازل کی ہے اور تیرے پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر و ثبات کے سبب سے پوری ہوئی اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے کاموں کو اور تعمیروں کو برباد کر دیا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم فرعون جیسی طاقت کے سامنے اس لئے سربلند ہوئی کہ اس نے صبر اور ثابت قدمی سے کام لیا، اور اسی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بابرکت زمین کی حکومت عطا فرمائی، چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی:

وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا وكانوا بايتنا يوقنون۔ (سجدہ:۳)

اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے، جب انہوں نے صبر کیا اور ہمارے حکموں پر یقین رکھتے تھے۔

آیت بالا نے بنی اسرائیل کی گذشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کئے ہیں، ایک احکام الٰہی پر یقین، اور دوسرے ان احکام کی بجا آوری میں صبر اور ثبات قدم، یہی دو باتیں دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا سنگ بنیاد ہیں، پہلے اپنے اصول کے صحیح ہونے کا بشدت یقین اور پھر ان اصولوں کی تعمیل میں ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو خوشی خوشی جھیل لینا۔

غزوۂ احد میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوتی بلکہ ستر مسلمان خاک وخون میں لتھڑ کر راہ خدا میں جانیں دیتے ہیں' بعض مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ ان کے اس حزن وملال کے ازالہ کے لئے پچھلے پیغمبروں کی زندگی کی روداد ان کو سناتا ہے:

وکاین من نبی قاتل معه ربیون کثیر۔ فما وهنوا لما اصابهم فی سبیل الله وما ضعفوا وما استکانوا والله یحب الصبرینط وما کان قولهم الا ان قالوا ربنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکفرین. (آل عمران:۱۵)

اور کتنے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا کے طالب لڑے ہیں' پھر خدا کی راہ میں تکلیف اٹھا کر انہوں نے ہمت نہیں ہار دی' اور نہ ان کے دل بودے ہوئے' اور اللہ ثابت رہنے والوں (صابرین) کو دوست رکھتا ہے اور وہ یہی کہتے رہے' کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو اور کام میں ہماری زیادتی کو معاف کر' اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔

اس آیت پاک نے غلط فہمیوں کے ان تو برتو پردوں کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرہ پر پڑے ہیں' اور فرما دیا کہ صبر دل کی کمزوری' بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کے مجبورانہ درگزر کا نہیں' بلکہ دل کی انتہائی قوت و ہمت کی بلندی' عزم کی استواری اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر میں لانے کا نام ہے' ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آ جانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو' ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جما رہے اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی

گذشتہ ناکامی کے قصور کو جو اس کی کمی (ذنب) یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے اور اس کو مزید ثبات قدم عطا کر کے حق کے دشمنوں پر کامیابی بخشے' اسی لئے اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے لئے مسلمانوں کو دو باتوں کی تاکید فرمائی' ایک تو خدا کی طرف دل لگانا اور دوسرے مشکلات پر صبر و استقامت سے قابو پانا۔

دنیا کی فتحیابی کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جس کا نام جنت ہے انہیں کے حصہ میں ہے' جن کو یہ پامردی' دل کی مضبوطی اور حق پر ثبات قدم کی دولت ملی' حق کی راہ میں مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ ان سے کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے اور دونوں الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہیں' چنانچہ فرمایا:

ام حسبتم ان تدخلو الجنہت ولما لعلم اللہ الذین جلھدوا منکم ویعلم الصبرین۔ (آل عمران: ۱۴)

کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی اللہ نے (آزما کر) ان کو الگ نہیں کر دیا' جو لڑنے والے ہیں اور جو ثابت قدم (صابر) ہیں۔

ضبط نفس ::

اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں' اس وقت نفس پر قابو رکھنا اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے مگر یہی ضبط نفس کا اصلی موقع ہوتا ہے اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی' متانت' وقار اور کیرکٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔

دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت توام ہیں' ان دونوں موقعوں پر انسان کو ضبط نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت اور خوشی کے نشہ میں اس میں فخر و غرور پیدا نہ ہو' اور غم و تکلیف میں وہ اداس اور بد دل نہ ہو' دل کے ان

دونوں عیبوں کا علاج صبر و ثبات اور ضبط نفس ہے' انسانی فطرت کے راز دار کا کہنا ہے:

ولئن اذقنا الانسان منا رحمہت ثم نزعنا ھا منہ انہ' لیووس کفور۔ ولئن اذقناہ نعماء بعد ضرآء مستہ مستہ لیقولن ذھب السیئات عنی انہ لفرح فخور۔ الا الذین صبروا وعملوا الصلحت اولئک لھم مغفرہت و اجر کبیر۔ (ہود: ۲)

اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے کسی مہربانی کا مزہ چکھائیں پھر اس سے اس کو اتار لیں تو وہ ناامید و ناشکرا ہو جاتا ہے اور اگر کوئی مصیبت کے بعد اس کو نعمت کا مزہ چکھائیں تو کہتا ہے کہ برائیاں مجھ سے دور ہو گئیں' بیشک وہ شاداں اور نازاں ہے' لیکن وہ جنہوں نے صبر (یعنی نفس پر قابو) رکھا اور اچھے کام کئے یہ لوگ ہیں جن کیلئے معافی اور بڑا انعام ہے۔

ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا::

ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر و پامردی سے ایک معنی سے بڑھ کر وہ صبر ہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنے میں ظاہر ہوتا ہے' اسی لئے مذہبی فرائض و احکام کو جو بہر حال نفس پر سخت گزرتے ہیں' عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے' ہر حال اور ہر کام میں خدا کے حکم کی فرمانبرداری' اور عبودیت پر ثبات نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے' اسی لئے حکم ہوا:

رب السموات والارض و ما بینھما فاعبدہ و اصطبر لعبادتہ۔ (مریم: ۴)

آسمانوں کا پروردگار اور زمین کا' اور جو ان دونوں کے بیچ میں

ہے سب کا تو اس کی بندگی کر اور اس کی بندگی پر ٹھہرا رہ (صبر کر۔)

ایک اور آیت میں نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل و عیال پر بھی اس کی تاکید رکھنے کے سلسلہ میں ہے:

وامر اھلك بالصلوہت و اصطبر علیھا۔ (طہٰ:۸)

اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم اور آپ اس پر قائم رہ۔

یعنی تمام عمر یہ فریضہ پابندی کے ساتھ ادا ہوتا رہے۔

حسب ذیل آیتوں میں غالباً صبر اسی مفہوم میں ہے وہ لوگ جو خدا کے سامنے حاضری کے دن سے ڈرا کرتے تھے اللہ تعالیٰ ان کو خوشخبری سناتا ہے:

فوقھم اللہ شر ذلك الیوم ولقھم نضرہت و سرورا وجزاھم بما صبروا جنہت و حریرا۔ (دہر:۱)

تو اللہ نے ان کو اس دن کی برائی سے بچا لیا اور ان کو تر و تازگی و شادمانی سے ملایا اور ان کے صبر کرنے (یعنی احکام الٰہی پر ٹھہرے رہنے) کے سبب سے باغ اور ریشمی لباس بدلہ میں دیا۔

وہ لوگ جو خدا کی بارگاہ میں توبہ کریں، ایمان لائیں، نیک کام کریں، فریب کاموں میں شریک نہ ہوں، بیہودہ اور لغو کاموں کے سامنے سے ان کو گزرنا پڑے تو بزرگی کے رکھ رکھاؤ سے گزر جائیں اور خدا کی باتوں کو سن کر اطاعت مندی سے اس کو قبول کریں اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعائیں مانگیں، ان کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کی یہ بشارت سناتا ہے۔

اولئك یجزون الغرفہت بما صبروا۔ (فرقان:۷۶)

ان کو بہشت کا جھروکہ بدلہ میں ملے گا کہ وہ صبر کرتے رہے۔

ان دونوں آیتوں میں صبر کا مفہوم یہی ہے کہ نیک کاموں کو بار خاطر، خلاف طبع اور تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہے اور بری باتوں سے باوجود اس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام ہے بچتے رہے، راتوں کو نرم بستروں سے اٹھ کر خدا کے آگے سربسجود ہونا، صبح کو خواب سحر کی لذت سے کنارہ کش ہو کر دوگانہ ادا کرنا، الوان نعمت کی لذتوں سے محروم ہو کر روزے رکھنا، تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خطرناک موقعوں پر بھی سچائی سے باز نہ آنا۔ قبول حق کی راہ میں شدائد کو آرام و راحت جان کر جھیل جانا، سود کی دولت سے ہاتھ اٹھا لینا، حسن و جمال کی بےقید لذت سے متمتع نہ ہونا، غرض شریعت کے احکام کی بجا آوری اور پھر اس پر عمر بھر استواری اور پائیداری، صبر کی بہت ہی کڑی منزل ہے اور اسی لئے ایسے صابروں کی جزا بھی خدا کے ہاں بھاری ہے۔

ان آیات پاک کی اس تشریح میں وہ حدیث یاد آتی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

حجبت (حفت) الجنہت بالمکارہ و حجبت (حفت) النار بالشہوات (صحیح بخاری کتاب الرقاق و صحیح مسلم کتاب الجنتہ)

جنت ناخوشی کے کاموں اور دوزخ نفسانی لذتوں کے کاموں سے ڈھانپی گئی ہے۔

یعنی نیکی کے ان کاموں کا کرنا جن کا معاوضہ جنت ہے، اس وقت دنیا میں نفس پر شاق گزرتا ہے اور گناہوں کے وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے اس وقت دنیا میں بڑے پرلطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہیں، اس عارضی و ہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کئے بغیر احکام الٰہی کی پیروی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے کسی قارون کے خزانہ مال و دولت کی فراوانی اور اسباب عیش کی بہتات کو دیکھ کر اگر کسی کے منہ

میں پانی نہ بھر آئے اور اس وقت بھی مال حرام کی کثرت کے لالچ کے بجائے' مال حلال کی قلت کو صبر کر کے خوشی کے ساتھ برداشت کر لے تو یہ بڑی قوت کا کام ہے' جو صرف صابروں کو ملی ہے۔

حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں جو قارون تھا اس کے مال و دولت کو دیکھ کر بہت سے ظاہر پرست لالچ میں پڑ گئے جن میں صبر و برداشت کا جوہر تھا ان کی چشم بینا اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی اور ان کو نظر آتا تھا کہ یہ فانی اور آنی جانی چیز کے دن کی ہے خدا کی وہ دولت جو نیکوکاروں کو بہشت میں ملے گی' وہ لازوال غیر فانی اور جاودانی ہے۔

قال الذین یریدون زینہت الحیوہت الدنیا یلیت لنا مثل ما اوتی قارون انہ لذوحظ عظیم۔ وقال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللہ خیر لمن امن وعمل صالحا ولا یلقہا الا الصبرون۔ (قصص:۸)

جو لوگ حیات دنیاوی کی آرائش کے خواہاں تھے وہ بولے اے کاش ہمارے پاس بھی وہ ہوتا جو قارون کو دیا گیا وہ بڑا خوش قسمت ہے اور جنہیں علم ملا تھا انہوں نے کہا تمہارا برا ہے' اللہ کی جزا ان کیلئے جو ایمان لایا اور نیک کام کئے سب سے اچھی چیز ہے اور اس حقیقت کو وہی پا سکتے ہیں جو صابر ہیں۔

یہ اجر اور جزا بہتر سے بہتر ہو گی کیونکہ یہ اس خزانے سے ملے گی جو لازوال اور باقی ہے۔

ما عندکم ینفذ وما عنداللہ باق۔ ولنجزین الذین صبروا اجرھم باحسن ما کانوا یعملون۔ (نحل:۱۳)

جو تمہارے پاس ہے وہ چک جائے گا' اور جو خدا کے پاس
ہے وہ رہ جانے والا ہے اور یقیناً ہم ان کو جنہوں نے صبر کیا
ان کی مزدوری ان کے بہتر کاموں پر دیں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا کہ نمازیں ادا کیا کرو کہ نیکیاں بدیوں کو دھو دیتی ہیں' اس پیغام میں نصیحت قبول کرنے والوں کے لئے نصیحت اور یاددہانی ہے' اس کے بعد ہے:

واصبر فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین۔ (ہود:۱۰)
اور صبر کر کہ بیشک اللہ نیک کام کرنے والوں کی مزدوری
ضائع نہیں کرتا۔

صبر کے فضائل اور انعامات::

یہ مزدوری کیا ہوگی' یہ حد اور شمار سے باہر ہوگی۔

انما یوفی الصبرون اجرھم بغیر حساب۔ (زمر:۲)
صبر کرنے والوں کو تو ان کی مزدوری بے حساب ملے گی۔

جن محاسن اور محامد صفات اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا میں اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے' ان میں صبر و برداشت کا بھی شمار ہے:

ان المسلمین و المسلمت و المئومنین و المئومنت
والقانتین و القانتات و الصدقین و الصدقت و الصابرین
والصبرات و الخشعین و الخشعات و المتصدقین
والمتصدقت و الصائمین و الصائمات و الحفظین
فروجھم و الحفظت و الذاکرین اللہ کثیرا
والذاکرات اعد اللہ لھم مغفرہت و اجرا عظیما۔
(احزاب:۵)

بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان دار مرد اور

ایمان دار عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے
والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور محنت سہنے والے مرد
(صابرین) اور محنت سہنے والی عورتیں (صابرات) اور (خدا
کے سامنے) جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں اور خیرات
کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار
مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے
والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو بہت یاد
کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں' اللہ نے ان
کے لئے تیار رکھی ہے' معافی اور بڑی مزدوری۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صبر کا مرتبہ بڑی بڑی نیکیوں کے برابر ہے اس سے انسان کی پچھلی غلطیاں حرف غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں اور دین و دنیا کی بڑی سے بڑی مزدوری اس کے معاوضہ میں ملتی ہے' یہی بشارت ایک اور آیت میں بھی ہے:

الذین یقولون ربنا انا امنا فاغفرلنا ذنوبنا وقنا عذاب
النار۔ الصبرین و الصدقین و القنتین والمنفقین
والمستغفرین بالاسحار۔ (آل عمران: ۲)

(جنت اور خدا کی خوشنودی ان کو حاصل ہوگی) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لا چکے ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا' اور صبر کرنے والے (یعنی مشکلات کی محنت کو اٹھا لینے والے) اور سچ بولنے والے اور بندگی میں لگے رہنے والے اور (خدا کی راہ میں) خرچ کرنے والے اور پچھلی راتوں کو خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے والے۔

اس آیت میں ایک عجیب نکتہ ہے' اس خوش قسمت جماعت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے اور خاتمہ بھی دعا پر ہے اور ان دونوں کے بیچ میں ان کے چار اوصاف گنائے

ہیں، جن میں پہلا درجہ صبر، یعنی محنت سہارنے، تکلیف جھیلنے اور پامردی دکھانے کا ہے دوسرا راستی اور راست بازی کا تیسرا خدا کی بندگی وعبودیت کا اور چوتھا راہ خدا میں خرچ کرنے کا۔

فتح مشکلات کی کنجی صبر اور دعا::

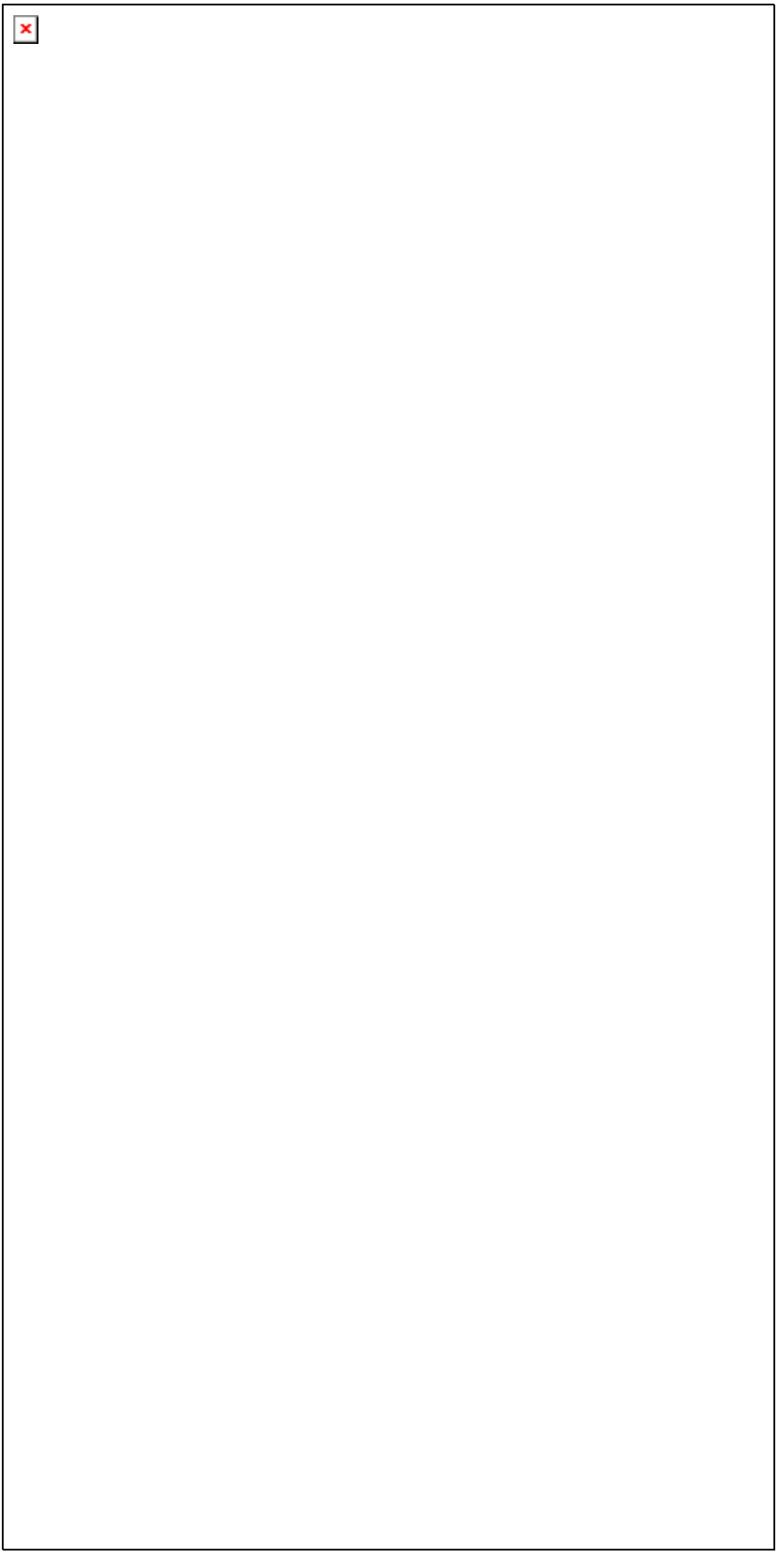
بعض آیتوں میں ان تمام اوصاف کو صرف دولفظوں میں سمیٹ لیا گیا ہے، دعا اور صبر اور فرمایا گیا ہے کہ یہی دو چیزیں مشکلات کے طلسم کی کنجی ہیں، یہود جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام کو قبول نہیں کرتے تھے، اس کے دو سبب تھے، ایک یہ کہ ان کے دلوں میں گداز اور تاثر نہیں رہا تھا، اور دوسرے یہ کہ پیغام حق قبول کرنے کے ساتھ ان کو جو جانی و مالی دشواریاں پیش آئیں، یہ عیش پرست اور ناز و نعمت کے خوگر ہو کر ان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسی لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طب روحانی نے ان کی بیماری کے لئے یہ نسخہ تجویز کیا:

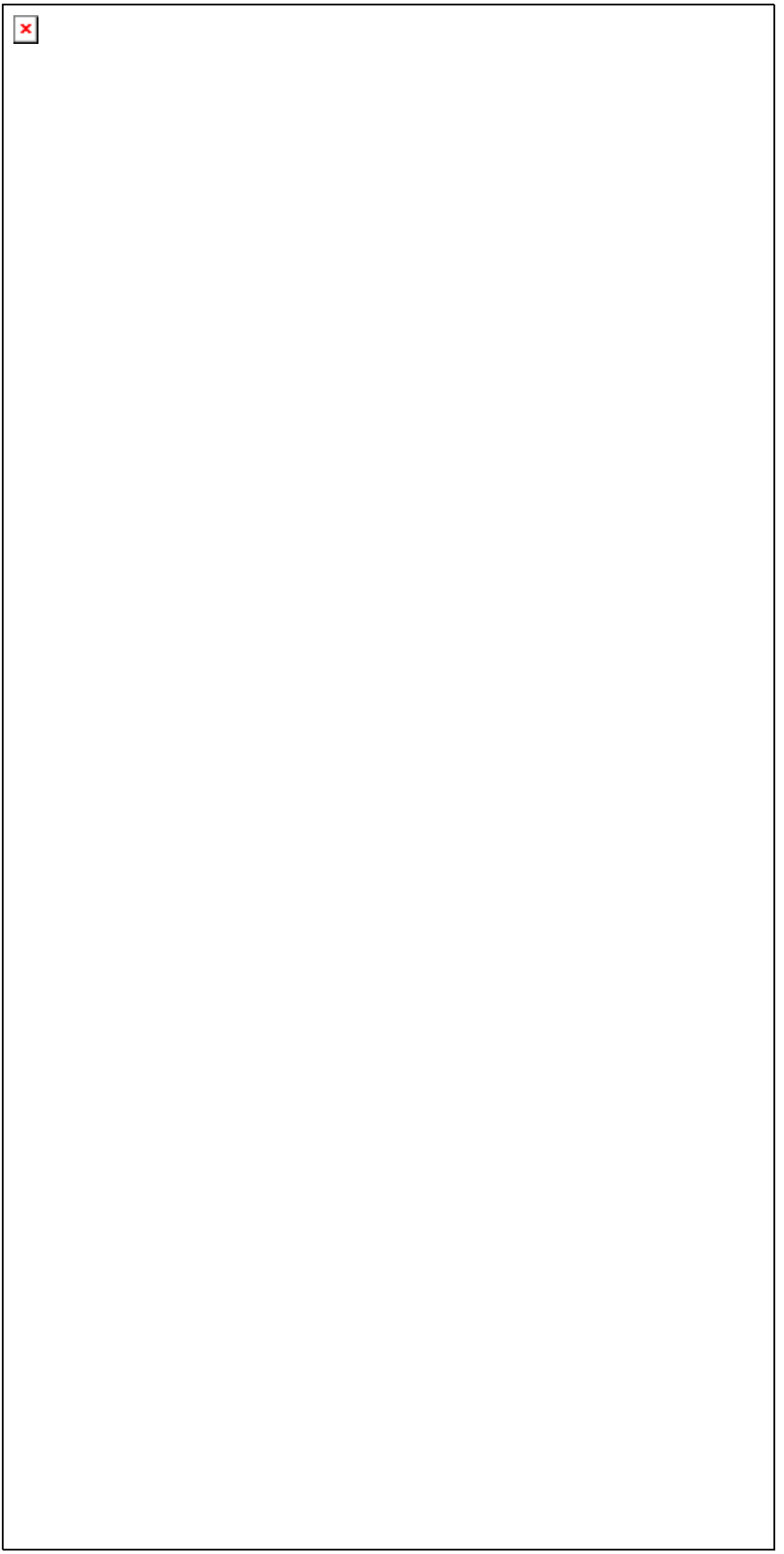
واستعینوا بالصبر و الصلوہت۔ (بقرہ:۵)

اور صبر (محنت اٹھانے) اور دعا مانگنے سے قوت پکڑو۔

دعا سے ان کے دل میں اثر اور طبیعت میں گداز پیدا ہوگا، اور صبر کی عادت سے قبول حق کی راہ میں مشکلیں دور ہوں گی، ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانوں کے برخلاف تلواریں اٹھائیں اور مسلمانوں کے ایمان کے لئے اخلاص کی ترازو میں تلنے کا وقت آیا تو یہ آیتیں نازل ہوئیں:

یایھا الذین امنوا استعینوا بالصبر والصلوہتط ان اللہ مع الصبرین. ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتط بل احیاء ولکن لا تشعرون۔ ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع و نقص من الاموال والانفس والثمراتط وبشر الصبرین الذین اذا





انا ھدینہ السبیل اما شاکرا واما کفورا۔ (دہر: ۱)

ہم نے انسان کو راستہ بتادیا' (اب وہ) یا شکرگزار (شاکر) ہوا یا ناشکرا (کافر) ہوگیا۔

لئن شکرتم لا زیدنکم ولئن کفرتم ان عذابی شدید۔ (ابراہیم: ۲)

اگر تم نے شکر کیا تو ہم تمہیں بڑھائیں گے' اور اگر ناشکری (کفر) کی تو بیشک میرا عذاب بہت سخت ہے۔

اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ کے احسانوں اور نعمتوں کی ناقدری کرکے اس کی ناقدری کا نام ہے تو اس کے مقابلہ میں شکر کی حقیقت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کی جائے' حضرت ابراہیمؑ کی نسبت اللہ پاک کی شہادت ہے :

ان ابراھیم کان امۃ قانتا للہ حنیفا ولم یک من المشرکین۔ شاکرا لانعمہ اجتبہ وھداہ الی صراط مستقیم۔ (نحل: ۱۲۰)

دراصل ابراہیم دین کی راہ ڈالنے والا اور اللہ کا فرمانبردار اس کو ایک ماننے والا تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا' اللہ کے احسانوں اور نعمتوں کا شکرگزار' اللہ نے اس کو چن لیا' اور اس کو سیدھی راہ دکھائی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانوں کی شکرگزاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے' احکام الٰہی کی پیروی کی جائے اور شرک سے پرہیز کیا جائے' اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ہم کو قبول فرمائے گا اور ہر علم و عمل میں ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا۔

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جڑ، دین کی اصل اور اطاعت الٰہی کی بنیاد ہے یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہونی چاہئے، اور اسی قدر و عظمت اور محبت کے قولی و عملی اظہار کا نام شکر ہے، اسی لیئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مایفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم وامنتم و کان اللہ شاکرا علیما۔ (نساء: ۲۱)

اگر تم شکر کرو، اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اور اللہ تو قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے، شکر اور ایمان، ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے اب رہا شکر تو شریعت میں جو کچھ ہے وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے، ساری عبادتیں شکر ہیں، بندوں کے ساتھ حسن و سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے، دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہے، صاحب علم اپنے علم سے بندگان الٰہی کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے، طاقتور کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے تو یہ بھی قوت و طاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے، الغرض شریعت کی اکثر باتیں اسی ایک شکر کی تفصیلیں ہیں، اسی لیئے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان ہوں گے، تو یہ کہا:

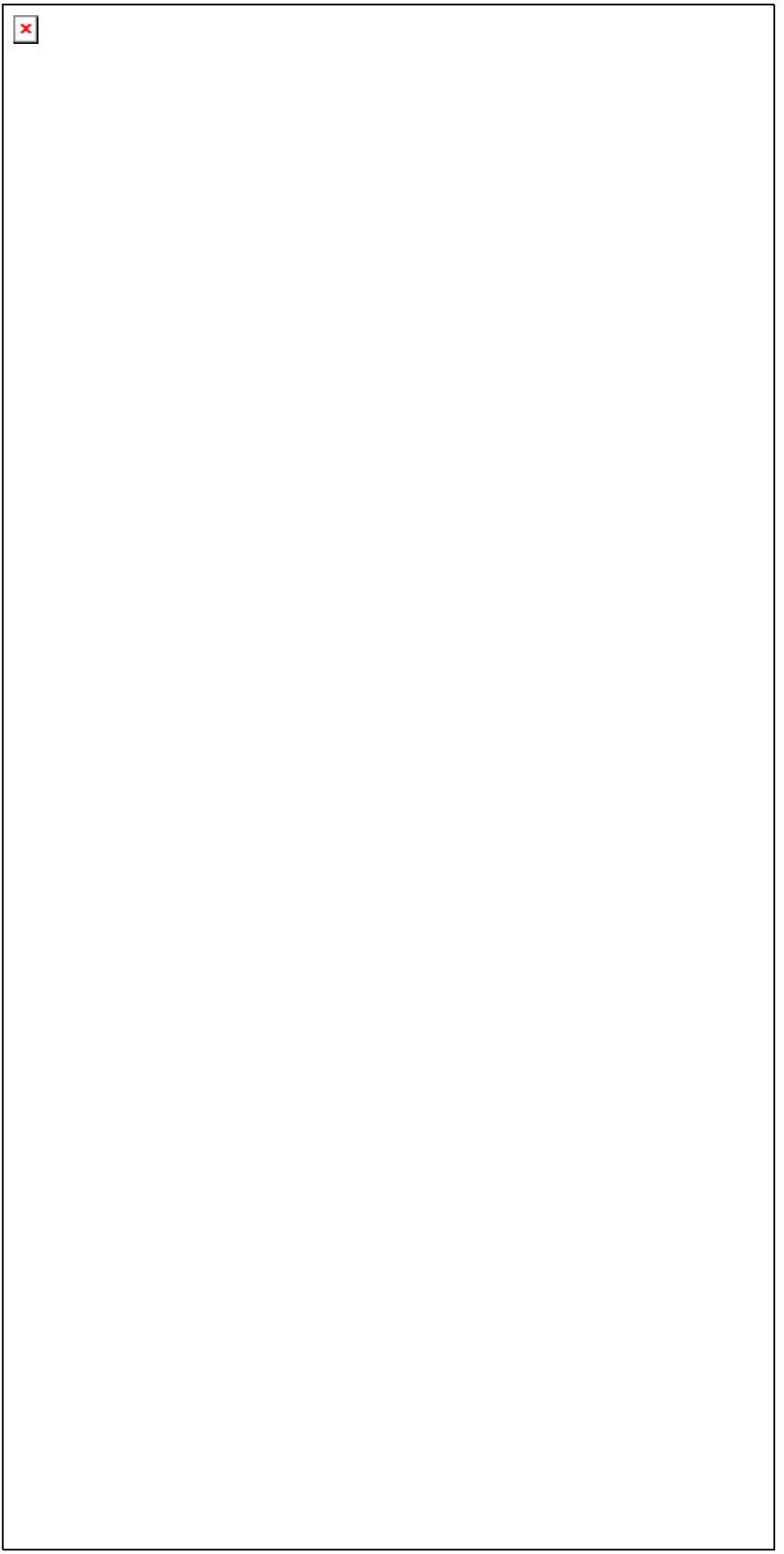
ولا تجد اکثرھم شاکرین۔ (اعراف: ۲)

تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہ پائے گا۔

خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا:

وسنجزی الشاکرین۔ (آل عمران: ۱۵)

اور ہم شکر کرنے والے کو جزا دیں گے۔



سریلی آواز بلند ہوگی:

وقیل الحمد للہ رب العالمین۔ (زمر:۸)

سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔

حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند ہے:

لہ الحمد فی السموات والارض۔ (روم:۲)

اسی کی حمد آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔

فرشتے بھی اسی حمد میں مشغول ہیں:

الذین یحملون العرش و من حولہ یسبحون بحمد ربھم۔ (مئومن:۱)

جو عرش کو اٹھائے ہیں' اور جو اس کے چاروں طرف ہیں' وہ اپنے پروردگار کے حمد کی تسبیح کرتے ہیں۔

بلکہ عرصہ وجود کی ہر چیز اس کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہے:

وان من شی ء الا یسبح بحمدہ (بنی اسرائیل:۵)

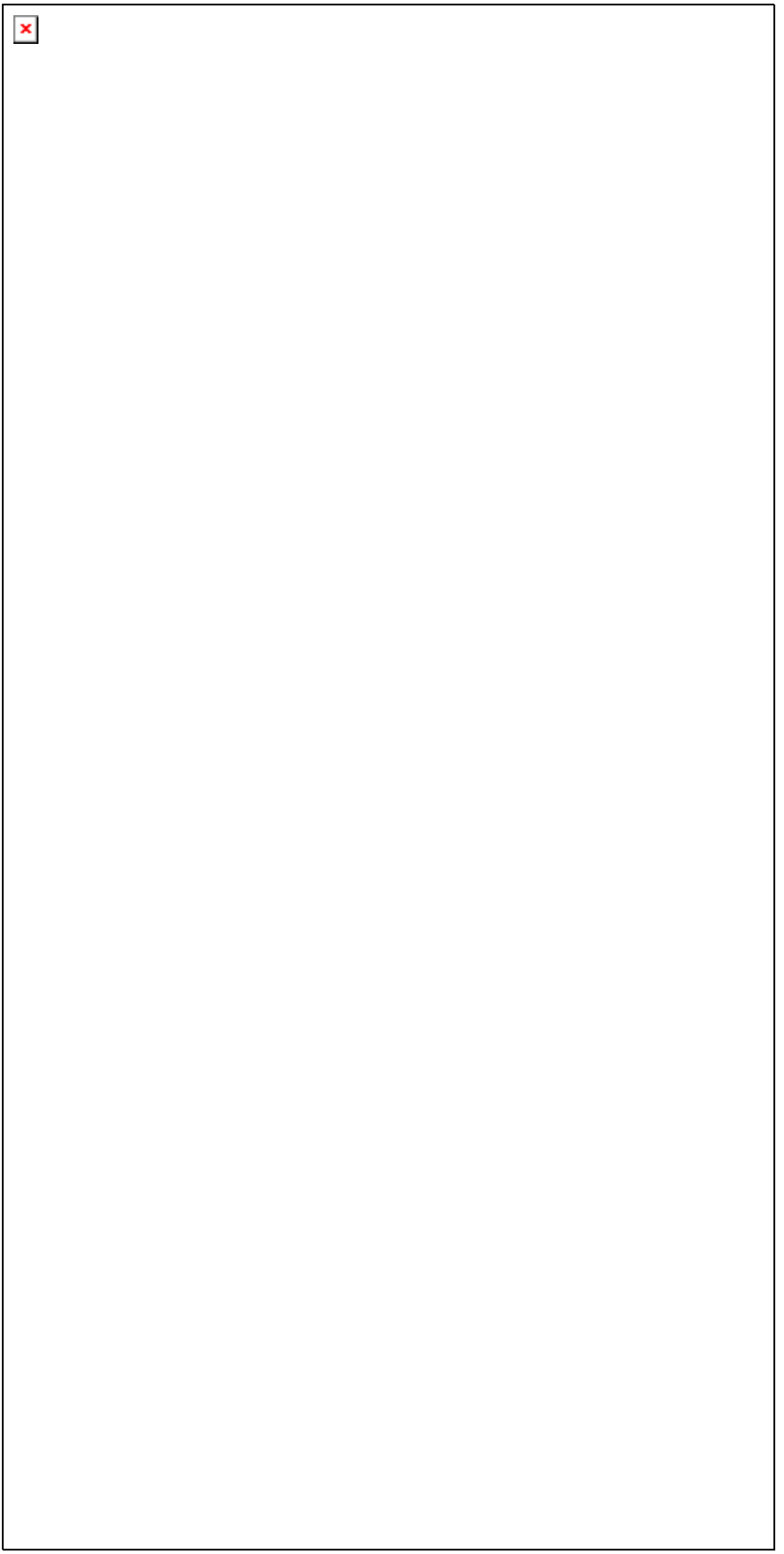
اور کوئی چیز نہیں جو اس (خدا) کی حمد کی تسبیح نہ کرتی ہو۔

یہی شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے جس کا مطالبہ انسانوں سے ہے:

سبح بحمد ربک (حجر' طہٰ' مئومن' طور' فرقان)

اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سنن اور شمائل میں ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے جو دعائیں ہیں' مثلاً کھانا کھانے کی' نئے کپڑے پہننے کی' سونے کی' سو کر جاگنے کی' نئے پھل کھانے کی' مسجد میں جانے کی' طہارت خانہ سے نکلنے کی وغیرہ وغیرہ' ان سب کا منشا اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی حمد اور زبان سے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے' لیکن زبان کا یہ شکریہ دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کی بیان ہونا چاہئے۔



الانسان من طین۔ ثم جعل نسلہ من سلالہ من ماء مھین۔ ثم سواہ ونفخ فیہ من روحہ وجعل لکم السمع والابصار والافئدہ قلیلا ما تشکرون۔ (سجدہ: ۱)

بڑے رحم والا جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور انسان کی پیدائش ایک گارے سے شروع کی، پھر اس کی اولاد کو بے قدر نچڑے ہوئے پانی سے بنایا، پھر اس کو درست کیا اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونکا اور تمہارے کان، اور آنکھیں اور دل بنائے، تم کم شکر کرتے ہو۔

واللہ اخرجکم من بطون امھتکم لا تعلمون شیئا وجعل لکم السمع والابصار والافئدہ لعلکم تشکرون۔ (نحل: ۱۱)

اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے باہر نکالا، تم کچھ جانتے نہ تھے اور تمہارے لیئے کان، اور آنکھیں اور دل بنائے۔

ان آیتوں میں خلقت جسمانی کی نعمت کا بیان ہے اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے، یعنی دل سے خدا کے ان احسانات کو مان کر اس کی ربوبیت و کبریائی اور یکتائی کو تسلیم کریں اور یہ سمجھیں کہ جس نے زندگی دی، اور اس زندگی میں ہم کو یوں بنا دیا، وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے اور اس میں بھی ہم کو یہ کچھ عنایت کر سکتا ہے اور پھر ہاتھ پاؤں سے اور آنکھ کان سے اس کے ان احسانات کا جسمانی حق ادا کریں، بعض اور آیتوں میں ہے:

نکلوا منہا واطعموا القانع والمعترطکذلک

سخرنھا لکم لعلکم تشکرونط (حج:۵)

تو ان جانوروں کے گوشت میں سے کچھ آپ کھاؤ اور کچھ ان کو کھلاؤ جو صبر سے بیٹھا ہے یا محتاجی سے بے قرار ہے اسی طرح ہم نے وہ جانور تمہارے قابو میں دیئے ہیں، تا کہ شکر کرو۔

یاایھا الذین امنوا کلوا من طیبت ما رزقنکم واشکروا للہ۔ (بقرہ: ۱۷۲)

اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو روزی دی پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور خدا کا شکر کرو۔

فکلوا مما رزقکم اللہ حلالا طیبا واشکروا نعمت اللہ ان کنتم ایاہ تعبدون۔(نحل:۱۱۴)

تو خدا نے تم کو جو حلال اور پاک چیزیں روزی کیں ان کو کھاؤ اور اس نعمت کا شکر کرو اگر تم اسی کو پوجتے ہو۔

یہ مالی نعمت کا بیان تھا اس کا شکریہ بھی خدا کو مان کر مال کے ذریعہ ادا کریں۔

دنیا میں شکریہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو اسی قسم کا احسان ہم اس کے ساتھ کریں ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا اس تیسری قسم کے شکریہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندوں کے ساتھ کریں، اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کے ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے:

واحسن کما احسن اللہ الیک(قصص:۸)

اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کو تو بھی بھلائی کر۔

اسی کا نام خدا کو قرضہ دینا بھی ہے' ظاہر ہے کہ خدا نعوذ باللہ محتاج نہیں کہ اس کو کوئی قرضہ دے' خدا کو قرض دینا یہی ہے کہ اس کے ضرورت مند بندوں کو یا قابل ضرورت کاموں میں روپیہ دیا جائے' ارشاد ہوتا ہے:

من ذاالذی یقرض اللہ قرضا حسنا(بقرہ: ۲۴۵' حدید: ۲)

کون ہے جو خدا کو اچھا قرضہ دیتا ہے۔

واقرضوا اللہ قرضا حسنا(حدید: ۲' مزمل: ۲)

اور خدا کو قرض حسنہ دو۔

ان تقرضوا اللہ قرضا حسنا۔(تغابن: ۲)

اگر خدا کو قرض حسنہ دو گے۔

خدا کو قرض حسنہ دینے کی جو تفسیر اوپر کی گئی' اس کی روشنی میں اس حدیث کو پڑھنا چاہئے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدا فرمائے گا' اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی' بندہ کہے گا اے میرے پروردگار تو تو جہان پروردگار ہے میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا' فرمائے گا کہ کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا' تو نے اس کی پرسش نہ کی' اور اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا' اے میرے پروردگار تو تو سارے جہان کا رب ہے میں تجھے کیسے کھلاتا' فرمائے گا' تجھے معلوم نہ ہوا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا' تو نے اس کو نہیں کھلایا' اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کا بدلہ آج میرے پاس پاتا' اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو تو نے مجھے پانی نہیں پلایا' بندہ کہے گا اے میرے پروردگار تو تو سارے عالم کا پروردگار ہے میں تجھے کیسے پانی پلاتا' فرمائے گا میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو

نہیں پلایا' اگر تو اس کو پلاتا تو آج تو اس کو میرے پاس (۱) ۔پاتا۔

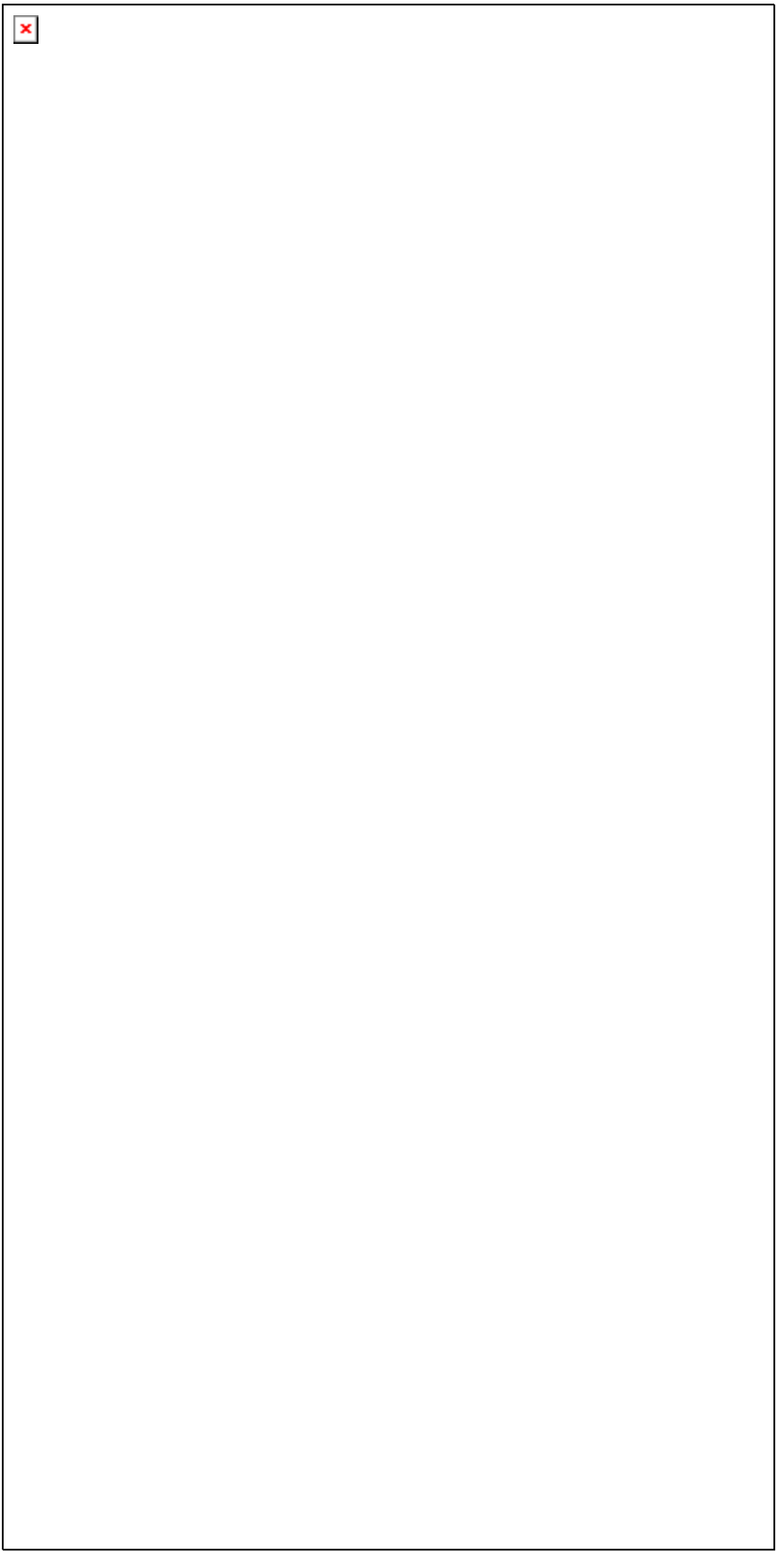
اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا جانی و مالی شکریہ ہم کو کس طرح ادا کرنا؟ اور اس کا قرض ہم کو کیونکر اتارنا چاہئے۔

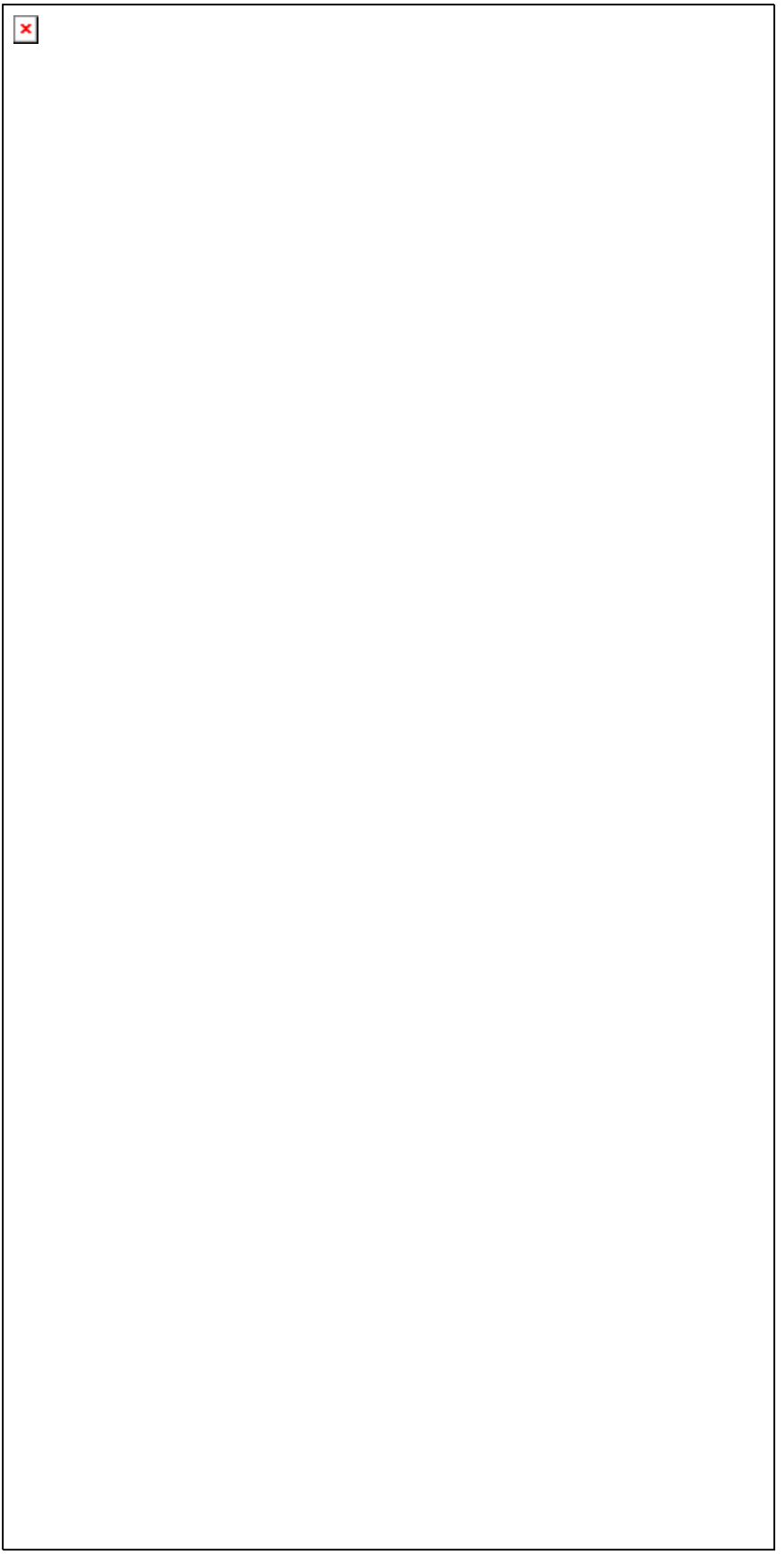
اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لیئے بھی کیا ہے کہ ہم یہ نہ سمجھنے لگیں کہ خدا کے فضل کرم کے سوا ہم ان نعمتوں کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے' حالانکہ ان کے لیئے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا نہ کوئی ہمارا ذاتی علمی یا عملی! جو کچھ ملا اس کے فضل و کرم سے ملا' اور جو کچھ ملے گا وہ اس کی عطا اور بخشش ہوگی انسان اپنی روزمرہ کی متواتر بخششوں کو جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں' دیکھ کر' اور ان کے دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہیں' بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے' جس کے شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں' مگر خوب سمجھنا چاہئے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور الحاد کی کونپلیں نکلتی ہیں' اسی لیئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو گنوایا ہے اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے' تاکہ ربوبیت الٰہی کا یقین اس کے ایمان کے بیج کو سیراب کرے۔

دولت و نعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے کوئی بلند تر ہے اور جو اس کو ملا ہے وہ اس کا خاندانی حق تھا یہ اس کے ذاتی عمل و ہنر کا نتیجہ تھا' جیسا کہ قارون نے کہا تھا' یہی غرور ہے جو ترقی کر کے بخل اور ظلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے' اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی اور ارشاد ہے:

ولا تفرحوا بما اتکمط واللہ لا یحب کل مختال فخور ن الذین یبخلون و یامرون الناس بالبخل و من یتول فان اللہ ھو الغنی الحمید۔ (حدید:۳)

(اور تاکہ) جو خدا نے تم کو دیا' اس پر اترا ؤ نہیں' اور اللہ کسی





الحمدللہ پڑھ دیا تو مالک کا شکر ادا ہو گیا' حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے' شکر دراصل دل کے اس لطیف احساس کا نام ہے جس کے سبب سے ہم اپنے محسن سے محبت رکھتے ہیں' ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کے لیئے سراپا سپاس بنتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کو خوش رکھ سکیں اور اس کی فرمائشوں کو پورا کرتے رہے' اگر ہم صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کریں' لیکن دل میں احسان مندی اور منت پزیری کا کوئی اثر اور کیف نہ ہو' اور اس اثر اور کیف کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو' تو ہم اس محسن کی احسان مندی کے اظہار میں جھوٹے ہیں اور وہ شکر خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں اسی لیئے اللہ تعالی نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو اپنے پے در پے احسانات سے جس طرح نوازا' اس کے بیان کرنے کے بعد ان کو خطاب کر کے فرماتا ہے:

اعملوا ال داود شکرا۔(سبا:۲)

اے داؤد کے گھر والو' شکر ادا کرنے کے لیئے نیک عمل کرو۔

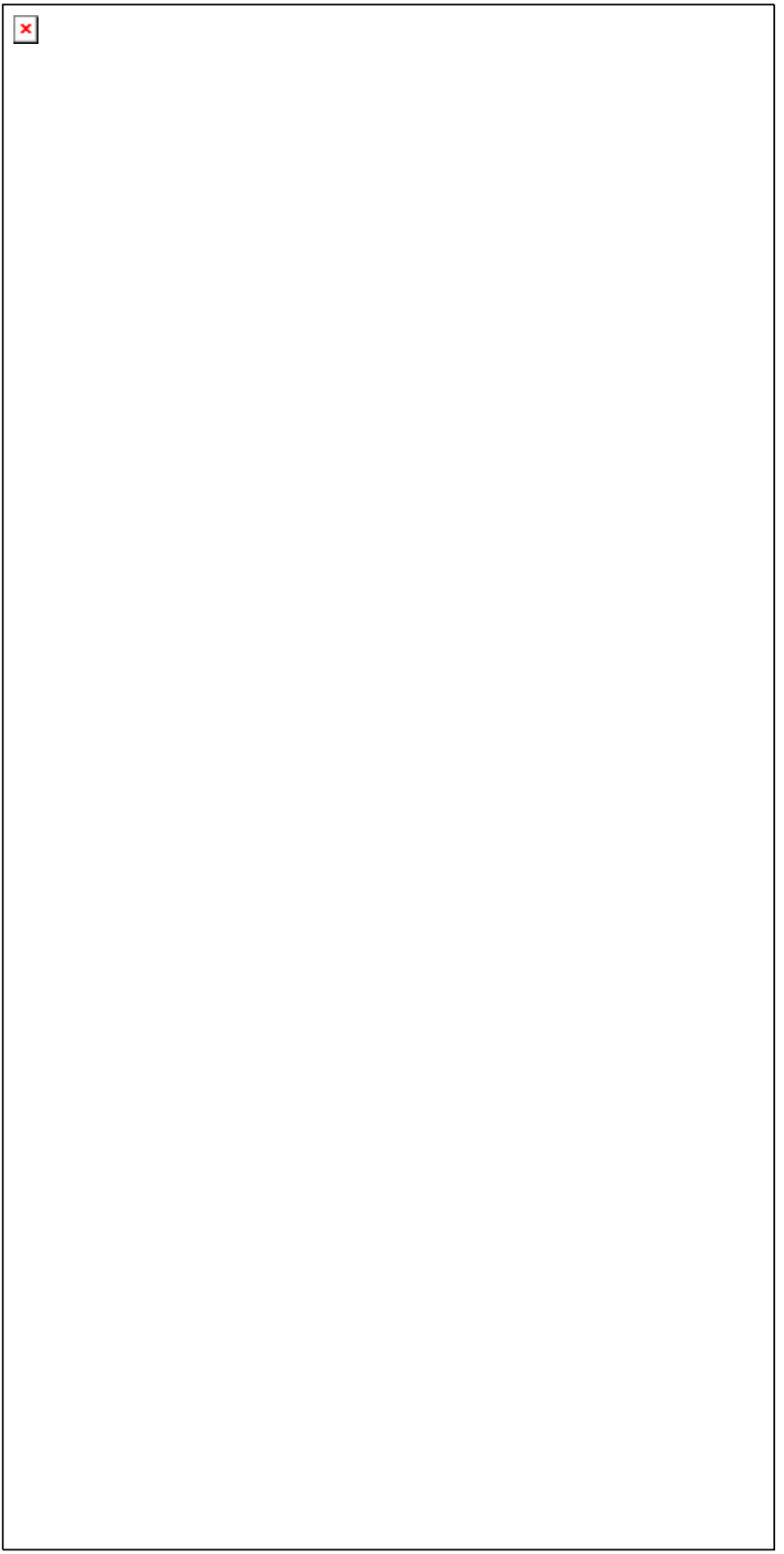
اس آیت پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو' بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہئے' اسی لیئے حضرت سلیمانؑ خدا سے دعا کرتے ہیں:

رب اوزعنی ان اشکر نعمتك التی انعمت علی وعلی والدی وان اعمل صالحا ترضہ۔(نمل:۲)

اے میرے پروردگار مجھے نصیب کر کہ میں تیرے اس احسان کا جو تو مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا ہے شکر کروں اور وہ نیک کام کروں جو تجھے پسند ہو۔

اس دعا میں بھی یہ اشارہ ہے کہ شکر میں' شکر کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق اور مناسب نیک عمل بھی ہو۔

دل میں یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گذار بندوں کے حق میں جو یہ فرمایا ہے



کرے گا۔

اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانوں کے احسانوں کا شکریہ ادا نہ کرے گا۔ تو خدا بھی اپنے احسانوں کا شکریہ اس سے قبول نہ فرمائے گا۔

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

خاتمہ

کتاب کی پانچویں جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل تھی ختم ہوگئی، ان صفحات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان تعلیمات کا بیان تھا جو عبادات کے باب میں آپ نے فرمائی ہیں، ان تعلیمات کے ایک ایک حرف پر غور کیجئے کہ انہوں نے وہم پرستیوں اور غلط فہمیوں کے کتنے تو برتو پردے چاک کر دیئے اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جز ہے، اس کی حقیقت کتنی واضح کر دی، عبادات کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو سکھائے، اور آپ ﷺ نے وہ انسانوں کو بتائے، وہ کتنے مکمل اور ان میں ایک ایک آئین آپ ﷺ کے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متعین اور مفصل، اور دین و دنیا کی مصلحتوں اور فائدوں پر مشتمل ہے اور آپ ﷺ نے ان کے ذریعہ انسانی دلوں کی کمزوریوں اور روح کی بیماریوں کا کس طرح علاج فرمایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغمبرانہ امتیازات کی کوئی حد نہیں ہے اور انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ہر تعلیم جس میں عبادت بھی داخل ہے۔ عملاً صاف، واضح اور متعین ہے، اور زمانہ مابعد میں انسانی تاویلات کی آمیزش اور قیاس آرائیوں سے مبرا ہے، اور اس کا اس طرح ہونا اس لیئے ضروری تھا کہ اس پر نوع انساں کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے، اس لیئے اس کے ہر پہلو کو ایسا واضح ہونا چاہئے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی آمد اور تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہے، نبوت و رسالت کے آخری معلم نے (خدا ان پر اپنی رحمتیں اور برکتیں اتارے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا، جس سے زیادہ کا تصور نہیں ہوسکتا۔

صلوات اللہ علیہ وبرکاتہ

مغفرت کا طلب گار

سید سلیمان ندوی

---------- اختتام جلد پنجم ----------